تہذیبوں کے گورکھ دھندے

مروِن ہیرس

ترجمہ: شیخ ریاض احمد

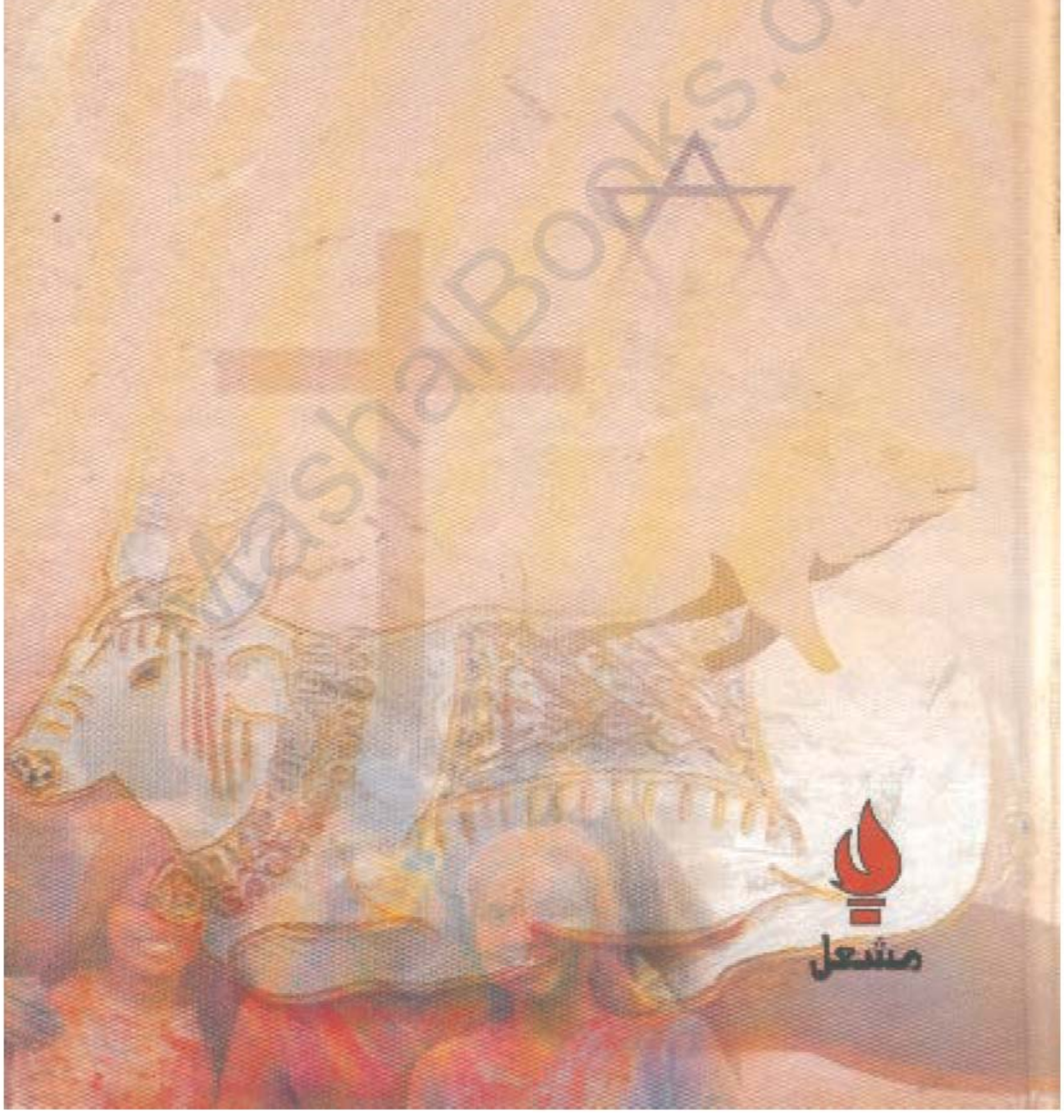

MashalBooks.org

تہذیبوں کے گورکھ دھندے

مرون ہیرس
ترجمہ: شیخ ریاض احمد

مشعل
آر-بی 5 ، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 ، پاکستان

MashalBooks.org

تہذیبوں کے گورکھ دھندے
حرام اور حلال کا عقیدہ

مروِن ہیرس
ترجمہ: شیخ ریاض احمد

کاپی رائٹ اردو (c) 2005 مشعل بکس

پہلی اشاعت 2001

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http:/www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

فہرست

1-	تمہید	5
2-	افتتاحیہ	9
3-	گئو ماتا	14
4-	سؤر کے شیدائی اور سؤر سے متنفر	35
5-	کہنہ طرز کی جنگ	58
6-	وحشی مرد	77
7-	دولت کی نمائش کے لیے دعوتیں	102
9-	سراب کے تعاقب میں	122
10-	ذکر مسیحاؤں کا	142
11-	امن کے شہزادے کا راز	162
12-	اڑن کھٹولے اور عیش ونشاط کی محفلیں	187
13-	جادوگری کا جنونی خبط	202
14-	سحر کی واپسی	216
15-	حرف آخر	231
16-	مصنف کے بارے میں	237

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تمہید

میں نے انڈر گریجوایٹ کلاس کے طالب علموں کو اس موضوع پر اپنا لیکچر دینا ختم کیا تھا کہ ہندوؤں کے نزدیک گئوکشی کی مذہبی ممانعت کے حق میں معقول وجوہ موجود ہیں، مجھے یقین تھا کہ ذہن میں پیدا ہونے والے ہر اعتراض کو پیشگی زیر بحث لا چکا ہوں۔ اپنے اعتماد کے سہارے میں نے پوچھا کہ آیا کسی کو کوئی سوال کرنا ہے۔ ایک مضطرب نوجوان نے اپنا ہاتھ کھڑا کیا، ''لیکن یہودیوں کے نزدیک سؤر کے گوشت کی مذہبی ممانعت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

کئی ماہ بعد میں نے اس پر ریسرچ شروع کی۔ یہودی اور مسلمان دونوں، سؤر کے گوشت سے کیوں متنفر ہیں۔ تقریباً ایک سال کا عرصہ اس مسئلے پر غور وفکر کے بعد میں اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کے لیے تیار ہو پایا۔ جوں ہی میں نے بولنا ختم کیا میرے ایک دوست نے جو جنوبی امریکی انڈینز کے امور کا ماہر تھا یہ پوچھا کہ ''تاپی راپے'' کی ہرن کے گوشت پر ممانعت سے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

اور اسی طرح ان میں سے ہر پہیلی کے سلسلے میں ایسا ہی اتفاق ہوتا رہا ہے جن کے لیے میں نے وضاحت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی میں سمجھ میں نہ آنے والے کسی معمول یا رسم کے بارے میں وضاحت پیش کرتا ہوں تو کوئی اور صاحب کوئی دوسرا مسئلہ سامنے لے آتے ہیں۔ مثلاً چلیئے مان لیا کہ کیوا کیول قبیلے میں پاٹلیچ کی دعوتوں کا جواز صحیح ہو لیکن یا نوما قبیلوں میں جنگ و جدل کا آپ کیا جواز پیش کرتے ہیں؟ میرے خیال

میں وہاں پروٹین کی کمی اس کا سبب ہوسکتی ہے......"لیکن نئ عبرانی بستیوں میں کارگو کے اعتقاد سے متعلق کیا خیال ہے؟ دراصل معمولات کی وضاحت آلو کی چپس کی طرح (خوش ذائقہ) ہوتی ہے۔لوگ انہیں کھائے چلے جاتے ہیں جب تک پوری تھیلی ختم نہ کرلیں۔

کتاب میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف چلے جانے کی ایک وجہ یہ بھی شامل ہے کہ یہ بھارت سے لے کر ایمیزون تک اور یسوع مسیح سے کارلوس کا سٹنڈا تک کثیرالانواع مشمولات کا احاطہ کرتی ہے۔لیکن اس میں اور آلو کی چپس سے بھری تھیلی کی یکسانیت میں کچھ فرق بھی ہیں۔ میری آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ آپ کے تصور میں جو حصہ سب سے زیادہ پسندیدہ ہو، پہلا لقمہ اس سے نہ لیجئے۔ ساحری سے متعلق میری تشریحات کا انحصار مسیحاؤں کے بارے میں وضاحتوں سے ہے اور مسیحاؤں سے متعلق تفصیلات کا ربط و تعلق بڑے لوگوں کے بارے میں اظہار خیال سے ہے۔ پھر اسی طرح اس اظہار خیال کا تعلق شہوت پرستی کی وضاحت سے ہے اور شہوت پرستی کا تعلق سؤر کی الفت کے بیان سے اور اس کا سؤر سے نفرت کی وجوہات پر ہے، اور سؤر کی نفرت کی توضیح گائے کی محبت سے متعلق وضاحت پر منحصر ہے۔ یہ نہیں کہ دنیا کا آغاز ہی گائے کی محبت سے ہوا بلکہ معاشرتی معمولات کو سمجھنے کے لیے میں نے اپنی کوششوں کا آغاز اسی سے کیا۔ لہٰذا براہ مہربانی اسے الل ٹپ انداز میں (جہاں سے جی چاہے) شروع کر کے نہ پڑھیں۔

اس کتاب کے مختلف ابواب کو باہم منسلک اور ایک دوسرے پر منحصر دیکھنا اور سمجھنا یوں ضروری ہے کہ اس کے مختلف اجزاء سے مل کر مرتب ہونے والے مجموعی اثرات ظاہر ہوں۔ ورنہ میرے پاس درجنوں شعبوں اور علوم کے ماہرین کی طرف سے بار بار تنقید کا نشانہ بننے کے خلاف دفاع کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ میں ماہرین کی عزت کرتا ہوں اور ان سے سیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے وہ اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں، اتنے ہی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتے ہیں......اگر آپ نے ایک ہی وقت میں ان میں سے اکثر پر انحصار کرنا ہو۔ کیا آپ نے کبھی ہندومت کے کسی ماہر محقق سے نیوگنی میں سؤر سے کی جانے والی محبت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی ہے؟ یا نیوگنی کے بارے میں جس شخص کو سند کا درجہ حاصل ہو اس سے یہودیوں میں سؤر سے نفرت کے متعلق دریافت کیا ہے؟ یا اسی طرح یہودیت کے عقائد اور رسومات کے کسی ماہر سے نیوگنی میں مسیحاؤں سے متعلق سوال کیا ہے؟

میں اپنی اس جسارت پر کہ میں نے علوم وفنون، قاعدے قوانین، براعظموں اور صوبوں کو اپنی صدیوں کو اپنی طبع آزمائی کے دامن میں سمیٹا، صرف یہ کہوں گا کہ دنیا اپنے حلقہ دام کو علوم، براعظموں اور صدیوں تک پھیلا چکی ہے۔ قدرتی طور پر کوئی چیز ایک دوسرے سے اتنی الگ نہیں جتنے دو ہنرمند ماہرین۔

میں ان محققین کی کاوشوں کا احترام کرتا ہوں جو ثابت قدمی سے ایک صدی، ایک قبیلے ایک شخصیت کے متعلق اپنے علم کو پھیلاتے اور پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عام اور تقابلی مقاصد کے حامل مسائل پر ایسی کوششیں زیادہ مؤثر انداز میں ہونی چاہئیں۔ ہمارے ضرورت سے زیادہ مہارت کے حامل سائنس دانوں کی تہذیب وتمدن سے متعلق وجوہات کے بارے میں واضح ناکامی کا سبب، معاشرے کے معمولات میں قانون شکنی کے عمل کا دخل نہیں بلکہ میرے خیال میں یہ ان ماہرین کو گراں قدر صلوں سے نوازنے کا نتیجہ ہے جو کسی نظریے کے خلاف کسی واقعے کو ہرگز خطرہ نہیں سمجھتے۔ حالیہ کچھ عرصے سے سماجی تحقیق کے حجم اور سماجی افراتفری کی سنگینی کے مابین قائم ہونے والے مناسب تعلق کا صرف ایک مطلب اور مدعا ہے اور وہ یہ کہ اس ساری تحقیق کو یکجا کرنے سے حاصل ہونے والی مجموعی قوت کا کام لوگوں کو اپنی سماجی زندگی کی وجوہات سمجھنے سے محروم کرنا ہے۔

علم سے متعلق انتظامیہ کے پردھانوں (پنڈتوں) کا اصرار ہے کہ افراتفری کی یہ صورت حال تحقیق اور سوچ سمجھ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ (جسے دانشگی کہتے ہیں) لیکن ان سکالروں کی بات مان لی جائے تو اس میں جاننے کو کچھ کم ہی ملے گا، زیادہ نہیں۔ مزید ریسرچ اور تحقیق سے اس وقت تک معاشرتی معمولات کی وجوہات کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی جب تک ایسی حکمت عملی اختیار نہ کی جائے جس کا مقصد ماہرانہ ہنرمندی اور موجودہ علم کے مابین حائل خلیج کو ایسے منظم خطوط پر بانٹنے کی کوشش کرنا ہو۔

اگر ہم جائز طور پر عمومی وضاحتوں کے متلاشی ہیں تو ہمیں کم از کم ایک ابتدائی تصور کا حامل ہونا چاہیے کہ قدرت اور تہذیب سے متعلق غیر مستحکم حقیقتوں سے آگاہی کے لیے کہاں رجوع کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ کاوش وہ راہ دکھانے میں جس کی طرف رجوع ضروری ہے، ایک نہ ایک دن ایسی حکمت عملی کے فروغ میں مددگار ثابت ہوگی۔

MashalBooks.org

افتتاحیہ

یہ کتاب زندگی کے بظاہر غیر معقول اور ناقابل وضاحت رویوں اور معمولات سے متعلق ہے۔ ان میں سے کچھ پیچیدہ رسوم و رواج کا تعلق جاہلانہ دور کی قدیم اور پسماندگی میں مبتلا اقوام سے ہے ـــــ مثلاً مغرور، متکبر، شیخی باز امریکی انڈینز کے سردار جو اپنی ملکیتوں کو محض اس لئے جلا دیتے تھے تاکہ یہ دکھا سکیں کہ وہ کتنے امیر ہیں۔ کئی اداروں کا تعلق ترقی پذیر معاشروں سے ہے، ان میں میرے پسندیدہ ہندو ہیں جو گائے کا گوشت کھانے سے انکار کرتے ہیں خواہ وہ فاقوں کا شکار ہو رہے ہوں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہیں جن کا واسطہ مسیحاؤں اور ساحروں سے ہے جو ہماری اپنی تہذیب کے دھارے کا حصہ ہیں۔ اپنے نقطۂ ہائے نظر کی وضاحت کے لیے میں نے قصداً ایسے منفرد اور اختلافی مسائل کو منتخب کیا ہے جنہیں ناقابل حل پہیلیاں کہا جا سکتا ہے۔

ہمارا زمانہ دعویدار ہے کہ ہم حکمت و دانش کے زیادہ جام لنڈھا کر اس کی گرفت میں جکڑے گئے ہیں۔ کئی سکالرز ایک انتقامی جذبے کے زیر اثر ثابت کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف کار ہیں کہ سائنس اور عقل و استدلال سے انسانی طرز ہائے بودوباش میں اختلاف، تضاد اور کمی بیشی کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اس پر اصرار ایک فیشن سا بن گیا ہے کہ جن گنجلک مسائل کو آنے والے ابواب میں زیر بحث لایا گیا ہے ان کا کوئی حل نہیں۔ معاشرت کے ان پیچیدہ مسائل میں موجودہ سوچ کی راہ زیادہ تر ''روتھ بینڈکٹ'' نے اپنی کتاب ''تمدن کے نمونے'' کے ذریعے ہموار کی۔ ''کیوا کیول''، ''ڈوبوانز'' اور

MashalBooks.org

''زونی'' تمدنوں میں حیرت انگیز اور نمایاں اختلافات کی وضاحت کرنے میں ''بینڈکٹ'' نے اس خیالی داستان کا سہارا لیا ہے جسے وہ ''ڈگرانڈینز'' سے منسوب کرتی ہے۔ اس افسانونی تصور میں کہا گیا ہے کہ خدا نے ہر قوم اور سب لوگوں کو ایک مٹی کا پیالہ دیا اور وہ اس پیالے سے اپنی زندگی کے گھونٹ بھرتے رہے...... وہ سب پانی میں ڈوب گئے لیکن ان کے پیالے مختلف تھے۔ کئی لوگوں نے اس کے جو معنی لئے ان کے مطابق صرف خدا کو ہی معلوم ہے کہ ''کیوا کیول'' کیوں اپنے گھروں کو جلاتے رہے ہیں او راسی طرح، کہ ہندو گائے کا گوشت کھانے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں یا مسلمان اور یہودی سؤر کے گوشت سے کیوں نفرت کرتے ہیں، یا پھر یہ کہ کیوں کئی لوگ مسیحاؤں پر اور دوسرے شعبدہ بازوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اس رائے کا طویل المیعاد عملی اثر یہ رہا ہے کہ اس سے مختلف اور متضاد نوعیّتوں کی دوسری وضاحتوں کی تلاش کے لیے حوصلہ شکنی ہوتی ہے کیونکہ ایک بات بالکل واضح ہے کہ اگر آپ کو کسی الجھن سے متعلق یہ یقین نہیں کہ اس کا کوئی حل موجود ہے تو پھر آپ یہ حل کبھی نہیں پاسکیں گے۔

مختلف تہذیبوں کے مطالعے اور ان پرغور وفکر کے لیے ہمیں ابتدا اس مفروضے سے کرنی چاہیے کہ انسانی زندگی محض اتفاقی، ناگہانی، من موجی امنگ اور متلون مزاجی کا نام نہیں۔ اس مفروضے کے بغیر اگر انتہائی طور پر ناقابل تحقیق وتلاش کسی رسم و رواج یا ادارے کا جواز ڈھونڈنے کا سامنا ہو تو جلد یا بدیر اس کوشش کو ترک کر دینے کی ترغیب ہوتی ہے۔ کئی سالوں کی سوچ وبچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایسے معاشرتی معمولات جن کا جواز دوسرے لوگوں کی سوچ کے مطابق یکسر ناقابل دریافت تھا دراصل وہ قطعی اور فوری طور پر سمجھ آنے والی وجوہات کے حامل تھے۔ اتنے طویل عرصے تک ان وجوہات کو نظر انداز کئے جانے کی بڑی وجہ ہر شخص کا یہ یقین کامل ہے کہ ''اس کا جواب صرف خدا جانتا ہے۔''

کئی رسوم و رواج اور اداروں کا وجود اور اسرار و رموز سے بھرپور نظر آنے کی ایک اور وجہ ہماری ان خطوط پر تربیت ہے کہ ان تہذیبی عوامل کی توضیح وتشریح کے لیے ہم روحانیت سے مربوط و منسلک اقدار کو عزیز رکھنے کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ارضی اور مادی وجوہات کی اہمیت ہمارے نزدیک کمتر ہوتی ہے۔ میرا مؤقف یہ ہے کہ اس کتاب میں جن معموں کو زیر بحث لایا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کا حل ان معروضی

حالات و واقعات کو بہتر انداز میں سمجھنے سے ہے۔ میں آپ کو دکھاؤں گا کہ بظاہر انتہائی نرالے اور عجیب وغریب اوٹ پٹانگ قسم کے اعتقادات اور معمولات بھی اگر ان کا گہرے غوروفکر سے جائزہ لیا جائے تو ان کی بنیاد ادنیٰ اور معمولی (بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ عامیانہ) ضروریات اور سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ادنیٰ اور عامیانہ حل سے میری مراد یہ ہے کہ اس حل کی بنیاد کسی خاص گن، خوبی، جنس، توانائی، بادو باراں......غرضیکہ کسی محسوس کئے جا سکنے والے عام سے عنصر یا عمل پر نہیں ہوتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیش کئے جانے والے حل کسی لحاظ سے سادہ اور عیاں ہوتے ہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ایسا نہیں ہوتا انسانی معاملات میں متعلقہ مادی اجزا کی شناخت ہمیشہ ایک مشکل کام رہا ہے۔عملی زندگی کئی بھیس بدلتی ہے۔ زندگی ہر معمول کئی ایسی فرضی اور تصوراتی کہانیوں میں ملفوف ہوتا ہے جن کے باعث توجہ غیر حقیقی یا مافوق الفطرت توہمات کی طرف رخ کر لیتی ہے۔ یہ خول اور لبادے لوگوں کو ایک سماجی شناخت اور مقصد کا احساس دیتے ہیں لیکن یہ عریاں سماجی صداقتوں اور سچائیوں کی نفی کرتے ہیں تہذیب وتمدن سے متعلق عام بنیادی وجوہات کے بارے میں فریب اور دھوکہ بازی عام معمولی احساس اور شعور کی راہ میں سیسے کی کئی تہوں والی دیوار کی مانند حائل ہو جاتی ہے۔ اس رکاوٹ پر قابو پانا اسے ہٹانا کبھی آسان نہیں رہا۔

آج کے زمانے میں جب اک طرف شعور و آگہی تبدیل شدہ غیر معمولی کیفیتوں سے آشنائی کے لیے بے تاب ہیں وہاں دوسری طرف ہم اس امر کو نظر انداز کرنے پر مائل ہیں کہ ہمارا ذہن کس حد تک پہلے ہی بعید العقل پراسرار شعور کے شکنجے میں پھنس چکا ہے...... ایسا شعور جس کا زندگی کے معروضی حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایسے کیوں اور کس لیے ہے؟

اس کی ایک وجہ تو جہالت اور لاعلمی ہے۔ اکثر لوگوں کو معمولات زندگی کے متنوع متبادل طور طریقوں میں سے بہت تھوڑے حصے سے واقفیت ہوتی ہے۔ تصوراتی اور خیالیہ داستانوں نے نکل کر بالغ نظری اور پختہ سوچ وفکر پر مبنی شعور کی طرف آنے کے لیے ہمیں ماضی اور حال کے پورے تہذیبی سلسلوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ دوسری وجہ ایک خوف بھی ہے۔ بوڑھا ہونے اور مرنے جیسے واقعات کے خلاف ''جھوٹا شعور'' ایک واحد مؤثر دفاع ہو سکتا ہے۔ اور آخر میں لڑائی جھگڑا آتا ہے۔ عام سماجی زندگی میں کئی لوگ مستقلاً اور غیر لچک

دار طور پر دوسروں کو زیردست رکھتے اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ عدم مساوات اور برتری کے یہ رویے بھی مختلف بھیس بدل کر اور حیلوں بہانوں سے سامنے آتے ہیں اور موت اور بڑھاپے کی طرح ان کی بھی تکذیب کی جاتی ہے۔

جہالت، خوف اور جھگڑا یہ تینوں روز مرہ شعور کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان عناصر سے فن اور سیاست اس اجتماعی خواب کا تانا بانا تیار کرتے ہیں جس کا مقصد لوگوں کو یہ سمجھنے سے باز رکھنا ہوتا ہے کہ ان کی سماجی زندگی کن عوامل سے عبارت ہے۔ لہٰذا روز مرہ کا شعور خود کو بیان نہیں کر پاتا خود اس کا وجود ایسی حقیقتوں سے انکار کرنے کی وسیع تر استعداد کا مرہون منت ہے جو اس کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ ہم خواب دیکھنے والوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اپنے خوابوں کی وضاحت کریں۔ اسی طرح ہم کسی معاشرت میں شریک کار سے بھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ معاشرت کی وضاحت کرے۔

کئی ماہرین انسانیات اور مورخین کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تہذیب وتمدن میں شریک کار ہونے کی حیثیت میں ان کی طرف سے دی گئی وضاحت حقیقت سے قریب ترین ہونے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، نہ اس کی اہمیت کم کی جا سکتی ہے۔ وہ متنبہ کرتے ہیں کہ انسانی شعور کو ہرگز ایک ''مدعا'' نہ سمجھا جائے اور فزکس اور کیمسٹری کے مطالعے کے لیے موزوں اس سائنسی ڈھانچے کا اطلاق اگر طرز معاشرت پر کیا جائے تو یہ عمل بے جوڑ ہوگا کیونکہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ جدید ''جوابی تمدن'' کے پرچارک موجودہ دور کی عدم مساوات اور ناہمواریوں کے باعث ہونے والی تباہیوں کا دوش بھی معروضیت اور تجسیم (ٹھوس شکل میں پیش کرنے) کو دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا دعویٰ ہے کہ معروضی شعور وآگہی کا نتیجہ ''اخلاقی حساسیت'' کی شکل میں نکلتا ہے اور اس طرح سائنسی علوم کی تلاش اور جستجو اصل گناہ کے ہم پلہ ہو جاتی ہے......

اس سے زیادہ لغو اور نامعقول بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بھوک، جنگ، جنس پرستی، ایذارسانی اور استحصال کے واقعات سے پوری تاریخ اور ماقبل تاریخ ادوار بھرے پڑے ہیں، وہ اولین زمانے بھی جب انسانی حالات اور واقعات کو ٹھوس شکل میں پیش کرنے کا کسی کو خیال تک نہ تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے (جو ترقی یافتہ شکل میں ٹیکنالوجی کے ضمنی اثرات کے

بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوئے) کہ سائنس ہماری معاشرت میں مؤثر معمول زندگی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدرت کے بارے میں ہمارے علم سے متعلق ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو لیکن تہذیب وتمدن سے متعلق ہمارے علم کے تعلق سے یہ خوفناک حد تک غلط ہے۔ جہاں تک معمولات زندگی کا تعلق ہے ''علم'' اصلی گناہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ابھی لاعلمی کی ابتدائی منزل پر ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں مزید بحث اور ''جوابی تمدن'' والوں کے دعووں کو فی الحال کتاب کے آخری باب تک ملتوی کرنے کی اجازت دیجئے۔ پہلے مجھے یہ بتانا ہے کہ معمولات زندگی سے متعلق کئی اہم پہیلیوں کی وضاحت سائنسی لحاظ سے کیسے کی جا سکتی ہے۔ ایسے نظریات پر بحث اور دلیل بازی سے کچھ حاصل نہ ہو گا جن کا مخصوص حقائق اور سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف ایک عنایت کا طلبگار ہوں۔ براہ مہربانی یاد رکھیئے کہ کسی بھی سائنسدان کی طرح مجھے توقع ہے کہ میں معقول اور قرین قیاس حل پیش کروں گا......لازمی طور پر تیقن آمیز نہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ کتنے ہی نامکمل ہوں، بہرصورت قرین قیاس حلوں کو بالکل کوئی حل نہ ہونے پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے، جیسے بینڈکٹ کی داستان ہے۔ کسی بھی دوسرے سائنسدان کی طرح میں متبادل وضاحتوں اور تشریحوں کا خیرمقدم کروں گا، شرط یہ ہے کہ وہ سائنسی شہادت کے پیمانوں پر پوری اترتی ہوں اور اسی طرح تفصیلی ہوں۔

آیئے اب ان پہیلیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

گئو ماتا

جب کبھی کسی معاشرے سے متعلق عملی اور عام تقاضوں کے اثرات پر بحث ہوتی ہے تو یقینی طور پر کوئی یہ پوچھتا ہے کہ ''آپ گائے کے متعلق کیا کہیں گے جسے بھارت کے بھوکے دہقان کھانے سے انکاری ہیں؟'' چیتھڑوں سے اپنے بدن کو چھپائے ہوئے بھوک سے نڈھال کسان کے ساتھ کھڑی ہوئی ایک موٹی تازی گائے کی تصویر مغربی اہل نظر کو ایک عجیب وغریب اور راسخ احساس دلاتی ہے۔ بے شمار علمی اور مقبول حوالے ہمارے اس یقین کو پختہ کرتے ہیں کہ مشرقی لوگوں کو اپنے غیر منطقی رویے ترک کر دینے چاہئیں اور زندگی بسر کرنے کے لیے معقول طرز عمل اپنانا چاہیے۔ یہ جان کر ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ انگلینڈ کی مانند، ہندوستان میں روحانی اقدار، خود زندگی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہیں۔ اس اطمینان کے ساتھ ہی ہم ایک غم کے احساس سے بھی دو چار ہوتے ہیں۔ ہم یہ امید کیونکر رکھ سکتے ہیں کہ ہم اپنے سے اس قدر مختلف لوگوں کو سمجھ پائیں گے۔ اہل مغرب کی سوچ یہ ہے کہ ہندوؤں کی گائے سے محبت کا عملی جواز اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ مقدس گائے...... میں اسے اور کس طرح بیان کروں...... ہماری مقدس گائیوں میں سے ایک ہے اور یہ جواز اس سے کہیں زیادہ حیران کن ہے جتنا ہندو کی گائے سے محبت کا ہے۔

ہندو گائے کی تعظیم اس لیے کرتے ہیں کیونکہ گائے ہر اس شے کی علامت ہے جو زندہ ہے۔ جیسے عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریمؑ خدا کی ماں ہیں، ہندوؤں کے نزدیک گائے زندگی کی ماں ہے۔ اسی لیے ہندو کے نزدیک گائے کو مار ڈالنے سے بڑا پاپ اور کوئی

نہیں۔ حتیٰ کہ انسانی جان لینے کا مطلب بھی اس ناقابل بیان بے حرمتی سے کم تر ہے جو گئو ہتیا کے نتیجے میں ہوتی ہے۔

کئی ماہرین کے مطابق گائے کی پوجا، ہندوستان کی بھوک اور غربت کی سب سے بڑی (اولین) وجہ ہے۔ مغرب کے تربیت یافتہ دیہی معاشیات کے کئی ماہرین کہتے ہیں کہ گائے کشی کے خلاف مذہبی ممانعت کا مطلب دس کروڑ بے کار جانوروں کو زندہ رکھ کر چھوڑنا ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ گائے کی پوجا زراعت کی کارکردگی اور استعداد کو گھٹاتی ہے۔ کیونکہ بے کار جانوروں سے دودھ حاصل ہوتا ہے اور نہ گوشت۔ کھیتی باڑی اور غذائی اجناس کی پیداوار بڑھانے کی مسابقت میں، مفید مویشیوں کے ذریعے اور بھوکے انسانوں کے لیے 1959ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے تحقیقی مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہندوستان کے مویشیوں کی نصف تعداد کو خوراک کی فراہمی کے تعلق سے زائد از ضرورت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور پنسلوینیا یونیورسٹی کے ماہر معاشیات نے 1971ء میں بتایا کہ ہندوستان میں تین کروڑ بے کار (غیر پیداواری) گائیں موجود ہیں۔

یہ صرف ظاہر ہے کہ زائد از ضرورت بے کار اور غیر اقتصادی جانوروں کی بے اندازہ اور بہت زیادہ تعداد موجود ہے اور یہ صورت حال ہندوؤں کے غیر منطقی اور لغو نظریات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ دہلی، کلکتہ، مدراس، ممبئی اور دوسرے ہندوستانی شہروں میں سے گزرنے والے سیاح ان آوارہ جانوروں کو حاصل کھلی چھٹی پر حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں یہ جانور گلی کوچوں میں کھلے عام گھومتے پھرتے، بازار کی دکانوں سے ساگ پات چرتے، پرائیویٹ باغات میں گھس جاتے، سڑکوں کے بغلی راستوں پر پیدل چلنے والوں کے اوپر گندگی اور غلاظت کے ڈھیروں کو الٹاتے، اور جگالی کرنے کے لیے مصروف چوکوں کے عین بیچ میں بیٹھ کر ٹریفک میں خلل ڈالتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں ڈھور ڈنگر سڑک پر اکٹھے ہوتے اور اپنا بیشتر وقت ریلوے کی پٹڑی کے راستے پر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے میں گزارتے ہیں۔

گائے کی محبت زندگی کو کئی طریقوں سے متاثر کرتی ہے۔ حکومتی ادارے بوڑھی گایوں کے لیے ٹھکانے بناتے ہیں (گئو شالے) جن میں مالکان اپنے ناکارہ اور نحیف و ناتواں جانوروں کو بغیر کسی ادائیگی کے مفت رکھ سکتے ہیں۔ مدراس پولیس آوارہ جانوروں کو،

جو بیمار ہو گئے ہوں پکڑ کر تھانوں سے متصل قریبی کھیتوں میں گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے تا کہ وہ صحت یاب ہوسکیں۔ کسان اپنی گایوں کو اپنے کنبے کے رکن خیال کرتے ہیں۔ انہیں ہاروں اور جھالروں پھندنوں سے سجاتے ہیں۔ جب وہ بیمار ہوں تو ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور گائے کے بچے کی پیدائش پر خوشی منانے کے لیے اپنے پڑوسیوں اور مندر کے پجاریوں کو بلاتے ہیں۔ پورے بھارت میں ہندو اپنے گھروں کی دیواروں پر ایسے کیلنڈر لٹکاتے ہیں جن پر ہیرے جواہرات اور زیوروں سے لدی خوبصورت نوجوان عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں اور ان کے بدن بڑی موٹی تازی ''زیبو'' نسل کی سفید گائے جیسے ہوتے ہیں۔ دودھ کی دھاریں ان آدھی عورتوں اور آدھی ''زیبو'' نسل کی گائے نما دیویوں کے ہر تھن سے بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اپنے خوبصورت انسانی چہروں والی گایوں کی دیواروں کے ساتھ آویزاں تصویریں اس مخصوص قسم کی گائے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں جسے گوشت پوست اور اصلی حقیقی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔ سال کے بیشتر عرصے کے دوران میں ان کی ہڈیاں ہی ان کے نمایاں خدوخال ہوتی ہیں۔ ان کے ہر تھن سے دودھ کا فراوانی سے بہہ نکلنا تو دور کی بات ہے، یہ لاغر اور نحیف چوپایہ ایک بچھڑے کی نشوونما بھی بہ مشکل کرسکتا ہے اور ہندوستان میں پائی جانے والی اس ''زیبو'' نسل گائے کی پیداوار اوسطاً 500 پونڈ سالانہ سے بھی کم ہے۔ امریکہ میں دودھ دینے والا عام اور معمولی قسم کا مویشی 5000 پونڈ سالانہ دودھ دیتا ہے۔ جبکہ زیادہ دودھ دینے والے مویشی کے نمایاں حیثیت کے حامل ہونے کی صورت میں 20,000 پونڈ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ لیکن اس موازنے سے پوری کہانی سامنے نہیں آتی۔ کسی بھی ایک سال کے دوران میں ''زیبو'' نسل کی گایوں کی نصف تعداد بالکل ہی دودھ نہیں دیتی......ایک قطرہ بھی نہیں۔

معاملات میں مزید خرابی اس لئے ہے کہ گائے سے محبت انسان سے محبت کو جنم نہیں دیتی۔ چونکہ مسلمان سؤر سے نفرت کرتے لیکن گائے کا گوشت کھاتے ہیں اس لیے بہت سے ہندو انہیں ''گئو ہتیا'' کا مرتکب سمجھتے ہیں۔ برصغیر ہند کی تقسیم سے پہلے، فرقہ وارانہ فسادات مستقل سالانہ واقعات میں شامل تھے۔ جن کا مقصد مسلمانوں کو گاؤ کشی سے باز رکھنا ہوتا تھا۔ گئو کشی کے سبب ہونے والے ان پرانے فسادات کی یادیں......مثال کے طور پر

1917ء میں بہار کا فساد جس میں 32 لوگ مارے گئے اور 170 مسلم دیہات کو لوٹ مار کے ذریعے مسمار کر دیا گیا...... ہندو پاکستان کے تعلقات میں آج بھی کشیدگی کا باعث بنتے ہیں۔

اگرچہ موہن داس کرم چند گاندھی نے ان فسادات کی مذمت کی لیکن وہ خود گائے سے عقیدت کے زبردست حامی تھے اور گائے کشی کی مکمل ممانعت چاہتے تھے۔ جب بھارت کا آئین تیار کیا گیا تو اس میں گایوں کے حقوق سے متعلق ایک شق شامل تھی جس کے ذریعے ہر طرح سے گئوکشی کو اس طرح روک دیا گیا کہ اس کے مکمل طور پر ممنوع ہونے سے ذرا سی کسر رہ گئی۔ چنانچہ کئی صوبوں نے تو گئوکشی پر مکمل پابندی لگا دی ہے جبکہ کئی دوسرے صوبوں میں اب بھی اس کی اجازت انتہائی صورتوں میں ہے...... گائے کا مسئلہ اب بھی فسادات اور بدامنی کی بڑی وجہ ہے۔ جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی برادریوں کے درمیان ہوتے ہیں بلکہ کانگرس پارٹی اور انتہا پسند ہندو فرقوں کے مابین بھی جو گائے سے محبت کرنے والے اور اس کے پرستار ہیں۔

7 نومبر 1966ء کو 1,20,000 لوگوں کے جم غفیر نے جس کی قیادت راگ اور بھجن الاپتے ننگ دھڑنگ مقدس لوگوں کا ایک گروہ کر رہا تھا اور جن کے گلوں میں پیلے پھولوں کے ہار تھے اور بدن اور چہروں پر گائے کے گوبر کی سفید راکھ ملی ہوئی تھی، ہندوستان کی پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے گائے کشی کے خلاف ایک مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے کے نتیجے میں ہونے والے دنگا فساد کے باعث، آٹھ آدمی مارے گئے اور اڑتالیس زخمی ہوئے۔ اس واقعے کے بعد مقدس (مذہبی) لوگوں کی طرف سے برت رکھنے کی ایک لہر قومی سطح پر چل پڑی جس کی قیادت منی شیتل کمارنے کی جو گائے کے تحفظ کی کل جماعتی کانفرنس کے صدر تھے۔

مغربی مبصّرین کے نزدیک گائے کی محبت نادانی بلکہ خودکشی کے مترادف ہے استعداد کار بڑھانے کے ماہرین کی آرزو ہے کہ وہ ان سب بے کار جانوروں کو پکڑ کر، مناسب طور پر ٹھکانے لگا دیں۔ پھر گائے سے محبت کی مذمت بھی نامناسب اور ناقص انداز میں کی جاتی ہے۔ جب میں اس جستجو اور حیرت میں مبتلا تھا کہ گائے کے مقدس ہونے کی شائد کوئی بنیاد موجود ہو تو پوشیدہ سازش پر مبنی ایک رپورٹ میرے ہاتھ لگی۔ جس میں بتایا گیا

MashalBooks.org

تھا کہ بھارت میں گایوں کی بہت افراط ہے۔لیکن بیلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جب اتنی وافر تعداد میں گائیں موجود ہوں، تو بیلوں کی قلت کس طرح ہوسکتی ہے؟ بھارت میں ہل چلانے کے بعد بڑے ذرائع بیل اور سانڈ ہیں۔ دس ایکڑیا اس سے کم ہر قطعہ زمین کے لیے بیلوں یا سانڈوں کاایک جوڑا کافی سمجھا جاتا ہے۔معمولی حساب سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک کھیتوں میں ہل چلانے کاتعلق ہےتو اس ضرورت کے لیے جانوروں کی تعداد زائد ہونے کی بجائے بلاشبہ کم ہے۔ بھارت میں 6 کروڑ فارم ہیں جبکہ ہل چلانے کے لیے صرف 8 کروڑ جانور ہیں۔ اگر ہرفارم پر دوبیل یا سانڈ ہوں تو ہل چلانے کے لیے 12 کروڑ جانور چاہئیں یعنی موجودہ دستیاب تعداد کے علاوہ 4 کروڑ مزید۔

یہ کمی اتنی شدید بھی نہیں کیونکہ کچھ کاشت کار اپنے ہمسایوں سے ہل ادھار یا کرایہ پر لیتے ہیں۔لیکن ہل چلانے والے جانوروں میں شراکت اکثر ناقابل عمل ثابت ہوتی ہے۔ ہل چلانے کاعمل مون سون کی بارشوں سے مربوط کرنا ضروری ہے اور اس وقت تک جب ایک کھیت میں ہل چلایا جاچکا ہوتا ہےتو دوسرے کھیت میں ہل چلانے کا موزوں ترین وقت اپنے بیلوں کی جوڑی کی بدستور ضرورت رہتی ہے۔ یہ ضرورت اپنی بیل گاڑی چلانے کے لیے ہوتی ہے۔ یہی بیل گاڑی پورے بھارت کے دیہی علاقوں میں بڑی تعداد میں نقل و حمل کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ممکن ہے کہ زرعی فارم، مال مویشی، ہل وغیرہ اور بیل گاڑیوں کا نجی ملکیت میں ہونا بھارت کی زراعت کاری کی صلاحیت میں کمی کا باعث ہو۔ لیکن فوراً مجھے سمجھ آئی کہ گائے سے محبت کا اس کمی سے کوئی تعلق نہیں۔

لادو(بوجھ اٹھانے والے) جانوروں کی کمی، بھارت کے اکثر کسان گھرانوں پر منڈلانے والا شدید خطرہ ہے۔ جب ایک بیل بیمار پڑجاتا ہےتو غریب کسان کو اپنے کھیت سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہوتاہے۔ اگر اس کے پاس اس بیل کا کوئی متبادل نہیں ہے تو اسے بہت بھاری شرح سود پر رقم ادھار لینی پڑتی ہے۔ لاکھوں دیہی گھرانے اپنی ساری ملکیتی اراضی یا اس کا ایک حصہ کھو چکے ہیں اور ایسے قرضوں کے نتیجے میں یا تو وہ فصل میں محض حصہ دار بن کر رہ گئے ہیں یا پھر دیہی مزدور۔ ہر سال لاکھوں مفلس و نادار کسان کنگال ہوکر شہروں میں منتقل ہورہے ہیں جو پہلے ہی بے روزگار اور بے گھر لوگوں سے اٹے ہوئے ہیں۔

ایک بھارتی کسان جو اپنے بیمار پڑجانے یا مر جانے والے بیل کی جگہ اس کا متبادل دوسرا بیل نہیں لا سکتا وہ بالکل ایسی صورت حال میں مبتلا ہوتا ہے جیسے ایک امریکی کاشت کار جو اپنے ٹوٹے ہوئے ٹریکٹر کی مرمت کرا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ دوسرا ٹریکٹر لا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک اہم فرق ہے کہ ٹریکٹر تو فیکٹریاں تیار کرتی ہیں جبکہ بیلوں کو گائیں بناتی ہیں۔ ایک کسان جو ایک گائے کا مالک ہے وہ بیلوں کو بنانے کی فیکٹری کا مالک ہے۔ گائے کی محبت سے قطع نظر، اس کے لیے یہ ایک معقول وجہ ہے کہ وہ اپنی گائے مذبح کو بیچ دینے کے لیے زیادہ متفکر نہ ہو۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ آنے لگی ہے کہ بھارتی کسان ایسی گایوں کے وجود کو جو سالانہ محض 500 پونڈ دودھ دیتی ہیں، کیوں گوارا کر لیتے ہیں۔ اگر اقتصادی لحاظ سے ''زیبو'' گائے کا بڑا مقصد زمین پر ہل چلانے والے نر جانوروں (بیلوں) کی افزائش نسل ہے تو پھر اس گائے کا مقابلہ دودھ دینے والے مخصوص امریکی جانوروں کے ساتھ فضول ہے، جن کا بڑا مقصد ہی دودھ کی پیداوار حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ''زیبو'' گایوں سے حاصل ہونے والا دودھ کئی غریب گھرانوں کی پرورش میں ان کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دودھ سے بنائی گئی غذائی اشیاء قلیل مقدار میں بھی لوگوں کی صحت کو بہتر بنا سکتی ہیں جو فاقہ زدگی کے قریب غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

جب بھارتی کاشتکاروں کو ایسے مویشی درکار ہوں جن کا اولین مقصد دودھ کا حصول ہو تو وہ بھینسوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کا دودھ دینے کا عرصہ بھی ''زیبو'' گائے کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اور مکھن کی چکنائی کی مقدار بھی۔ بھینسوں کے نر (بھینسے) بھی سیلابی علاقوں میں دھان کی کاشت میں ہل چلانے کے لیے اعلیٰ تر اور فوقیت کے حامل ہیں۔ لیکن بیلوں کی اہمیت زیادہ ہمہ گیر ہے اور خشک کھیتوں میں ہل چلانے اور سڑکوں پر بار برداری کیلیے انہیں ترجیح دی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ''زیبو'' نسل غیر معمولی طور پر مضبوط اور توانا ہوتی ہے۔ جو طویل خشک سالی کو برداشت کر سکتی ہے، یہ خشک سالی وقتاً فوقتاً بھارت کے مختلف حصوں کو متاثر کرتی رہتی ہے۔

زراعت کاری انسانی اور قدرتی باہمی تعلقات کے وسیع نظام کا ایک حصہ ہے۔ اس ماحولیاتی نظام کی اکائی کے علیحدہ اور جدا حصوں پر اس ضمن میں تحقیق کہ وہ امریکہ کی

زراعتی سرگرمیوں پر مشتمل سرگرمیوں اور طرزِ عمل پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں، کئی نامانوس تاثرات سے دوچار کرتی ہے۔ بھارت کے ماحولیاتی نظام میں مال مویشی، اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور زیادہ توانائی کی صارف سوسائیٹیاں انہیں بآسانی نظر انداز کر دیتی ہیں یا انہیں کمتر اہمیت دے کر سوچتی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں کھیت کی زرخیزی کے بڑے ذریعے کے طور پر مویشیوں کی کھاد کی جگہ تقریباً مکمل طور پر کیمیائی اشیاء نے لے لی ہے۔ امریکی کاشتکاروں نے دیسی کھاد کا استعمال اس وقت ترک کیا جب انہوں نے خچروں اور گھوڑوں کی بجائے ٹریکٹروں کی مدد سے زمین پر ہل چلانا شروع کیا۔ چونکہ ٹریکٹر سے کھاد کی بجائے زہر بھی خارج ہو سکتی ہے۔ اس لئے بڑے پیمانے پر مشینی کاشتکاری کے لیے کیمیائی کھاد کے لازمی استعمال کی پابندی ضروری ہے اور دنیا بھر میں آج فی الحقیقت ایک وسیع البنیاد، مربوط پیٹروکیمیکل، ٹریکٹر اور ٹرک سازی پر مشتمل صنعتی کمپلیکس کا پیچیدہ جال پھیل چکا ہے۔ جو کھیتوں کے لیے مشینری، موٹر سے چلنے والے ذرائع باربرداری، تیل اور گیسولین، کیمیائی کھادیں اور کیڑے مار ادویات بناتے ہیں جن پر کئی گنا زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا انحصار ہے۔

نتیجہ بہتری ہو یا مزید خرابی، بھارت کے اکثر کاشتکار اس کمپلیکس میں شامل نہیں ہو سکتے نہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنی گائے کی پوجا کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ٹریکٹر خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دوسری کم ترقی یافتہ قوموں کی طرح بھارت بھی ایسی فیکٹریاں تعمیر نہیں کر سکتا جو صنعتی قوموں کی فیکٹریوں میں مہیا کی جانے والی سہولتوں سے مسابقت کر سکیں۔ نہ ہی بھاری مقدار میں صنعتی مال کی درآمد کے اخراجات ادا کر سکتا ہے۔ جانوروں اور ان سے حاصل ہونے والی کھاد کے استعمال سے ہٹ کر اس کی جگہ ٹریکٹر اور پٹرولیم کی مصنوعات، کیمیائی کھادوں وغیرہ کے استعمال پر انحصار کے لیے ناقابل یقین حد تک سرمایہ کاری درکار ہے۔ اس کے علاوہ سستے جانوروں کی جگہ مہنگی مشینری استعمال کرنے کا ایک ناگزیر اثر یہ ہوگا کہ جو لوگ زراعت کے ذریعے اپنی روزی کھا رہے ہیں ان کی تعداد میں کمی واقع ہوگی۔ اور دوسری طرف اسی مطابقت سے زرعی فارموں کے اوسط سائز میں اضافے کی مجبوری کا سامنا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بڑے پیمانے کی زرعی سرگرمیوں اور کاروبار کی ترقی کے نتیجے میں

چھوٹے گھریلو سائز کے فارم فی الواقع تباہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہاں پانچ فیصد سے بھی کم گھرانے اب فارموں پر رہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں تقریباً سو سال پہلے ان کی تعداد ساٹھ فیصد تھی۔ اگر بھارت میں زرعی کاروبار انہی خطوط پر بڑھے تو ایک چوتھائی ارب دیہاتی لوگوں کے لیے فوراً روزگار اور سر چھپانے کے لیے رہائش تلاش کرنا ہوگی جو بے ٹھکانہ ہوں گے۔

بھارت کے شہروں میں بے روزگاری اور بے گھر ہونے کا عذاب پہلے ہی ناقابل برداشت ہے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں اتنی عظیم اور کثیر تعداد پر مشتمل شہری آبادی کا بڑھنا صرف ایک بے مثال شورش اور بے چینی کی راہ کھول دے گا۔

اس متبادل صورت حال کو ذہن میں رکھا جائے تو کم تر توانائی چھوٹے پیمانوں اور جانوروں پر منحصر نظام کے سمجھ آنے میں مدد ملتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے اس طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ گائیں اور بیل ٹریکٹروں کی فیکٹریاں کے ایسے نعم البدل مہیا کرتے ہیں جن سے دھیمے انداز کی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی تحسین اس لیے بھی ہونی چاہیے کہ ان سے پیٹروکیمیکل کی پیداواری مصنوعات کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ بھارت کے ڈھور ڈنگر سالانہ تقریباً 70 کروڑ ٹن گوبر لید وغیرہ خارج کرتے ہیں۔ اس مقدار کا تقریباً نصف حصہ بطور کھاد استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جبکہ بقایا کا زیادہ تر حصہ جلا کر اس سے کھانے پکانے کے لیے حرارت حاصل کی جاتی ہے۔ حرارت کی سالانہ مقدار جو جانوروں کے فضلوں کو جلانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو بھارتی خواتین کے لیے بطور ایندھن کھانا پکانے کا بڑا ذریعہ ہے وہ حراروں (حرارت کی مقدار ماپنے کی اکائی) کے حساب سے دو کروڑ ستر لاکھ ٹن مٹی کے تیل، تین کروڑ پچاس لاکھ ٹن کوئلے یا چھ کروڑ اسی لاکھ ٹن لکڑی سے حاصل ہونے والی حرارت کے مساوی ہے۔ بھارت میں چونکہ تیل اور کوئلے کے ذخائر قلیل ہیں اور وہاں بڑے وسیع پیمانے پر جنگلات کی کٹائی جاری ہے، اس لیے تیل کوئلے یا لکڑی میں سے کوئی بھی ایندھن عملی طور پر گائے کے گوبر کا نعم البدل نہیں سمجھا جا سکتا۔ باورچی خانے میں گوبر کا دخل، ایک عام اوسط درجے کے امریکی پر گراں گزرے گا لیکن بھارتی خواتین پکانے کے لیے اسے بہتر ایندھن سمجھتی ہیں کیونکہ ان کے گھریلو معمولات میں یہ عمدہ طریقے سے جگہ بنا لیتا ہے۔ بھارت میں کھانے اکثر صاف کئے ہوئے مکھن سے پکائے جاتے ہیں جسے گھی

کہتے ہیں۔ اس گھی کو گرم کرنے کے لیے گائے کے گوبر کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ اس کا شعلہ صاف، دھیما اور دیرپا ہوتا ہے۔ جو پکنے والی خوراک کو جھلساتا نہیں۔ یوں بھارتی خواتین خانہ کھانے پکانا شروع کرنے اور پھر انہیں گھنٹوں تک بغیر نگرانی کے چھوڑ کر چلے جانے کے قابل ہوتی ہیں تا کہ اس دوران میں وہ بچوں کی دیکھ بھال کرسکیں۔ کھیتوں میں جاسکیں یا دوسرے کام کاج کرسکیں۔ امریکی خواتین یہ سب مقاصد ایک برقی کنٹرول کے حامل پیچیدہ آلات کے استعمال سے حاصل کرتی ہیں۔ یہ آلات پرانے ماڈل کے چولہوں کے متبادل مہنگا انتخاب نہیں۔

گائے کے گوبر کا کم از کم ایک اور بھی بڑا کام ہے۔ پانی میں ملا کر اسے مٹی میں تبدیل کرکے اس کو گھر کے فرش پر پوچا لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے مٹی والے فرش پر پھیلا کر سوکھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے تا کہ سوکھ کر اس کی سطح ہموار ہو جائے۔ اس طرح گرد وغبار نیچے آجاتا ہے جسے جھاڑو پھیر کر صاف کیا جاسکتا ہے۔

جانوروں سے خارج ہونے والے فضلے چونکہ بہت سی مفید خصوصیات رکھتے ہیں اس لیے گوبر کا ہر چھوٹا سا ڈھیر احتیاط سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ گاؤں کے نچلے درجے کے لوگوں کے ذمے یہ کام ہوتا ہے کہ وہ گھر کی گائے کا ادھر ادھر پیچھا کرتے رہیں اور اس سے خارج ہونے والا روزانہ کا ''پیٹروکیمیکل'' (گوبر) گھر لے آئیں۔ شہروں میں خاکروبوں کو ادھر ادھر پھرنے والے جانوروں کے خارج ہونے والے گوبر پر اجارہ داری حاصل ہے جسے وہ گھروں میں بیچ کر روزگار کماتے ہیں۔

زرعی کاروبار کے نقطۂ نظر سے بانجھ اور دودھ سے فارغ گائے اقتصادی لحاظ سے قابل نفرت ہے لیکن غریب کسان کا شتکار کے نکتہ نظر سے وہی خشک اور بانجھ گائے، سود خور ساہوکاروں کے خلاف آخری اور قطعی دفاع ہے۔ یہ امکان ہر وقت موجود ہوتا ہے کہ ایک موافق مون سون کے دوران میں ایک نہایت ضعیف اور نحیف و ناتواں گائے کی قوت بحال ہو جائے وہ موٹی تازی ہو، بچہ پیدا کرے اور پھر سے دودھ دینا شروع کردے۔ کسان یہی دعا مانگتا ہے اور بسا اوقات اس کی دعاؤں کا جواب مل جاتا ہے۔ اس درمیانی عرصے کے دوران میں بھی اس کا گوبر تو کہیں نہیں گیا جسے وہ اکٹھا کرتا رہتا ہے اور یوں آہستہ آہستہ ہمیں سمجھ آنے لگتی ہے کہ گائے کے روپ میں محض ہڈیوں کا ڈھانچہ، بدصورت

بڑھیا، اپنے مالک کی نظروں میں پھر بھی خوبصورت ہوتی ہے۔

''زیبوٗ'' نسل کی گائیں جسم میں چھوٹی ہوتی ہیں اور توانائی کا ذخیرہ رکھنے کے لیے اس کی پیٹھ پر کوہان اور قوت بحال کرنے کی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کی یہ خوبیاں اسے بھارت میں زراعت کے مخصوص حالات کے موافق بناتی ہیں۔ یہاں کی مقامی نسلیں، تھوڑی خوراک اور پانی کے ساتھ طویل عرصہ تک زندہ رہنے اور بیماریوں کے خلاف کافی قوت مدافعت رکھتی ہیں جن سے گرم ملکوں کی آب وہوا میں دوسری نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔ ''زیبوٗ'' نسل کے بیل سے اس وقت تک کام لیا جاتا ہے جب تک زندہ رہتے ہیں۔ مویشیوں کے علاج کے ایک پرانے تجربہ کار ماہر ''سٹیورٹ اوڈنڈھال'' نے جو پہلے ''جان ہاپکنز'' یونیورسٹی سے وابستہ رہے، ایسے بھارتی مویشیوں کے مردہ جسموں کی چیر پھاڑ کی (پوسٹ مارٹم کیا) جو مرنے سے چند گھنٹے پہلے تک معمول کے مطابق کام کرتے رہے تھے لیکن ان کے حیات بخش اعضا کو شدید چوٹوں کے باعث گہرے زخم آئے اور نقصان پہنچا تھا۔ اپنی قوت کی بحالی کی بے پناہ طاقت کے باعث جب تک یہ جانور زندہ رہیں انہیں کبھی کلی طور پر بیکار سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

لیکن جلد یا بدیر ایک وقت ضرور آتا ہے جب کسی جانور کے صحت یاب ہونے کی ہر امید ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گوبر تک نہیں کرتا لیکن پھر بھی ہندو کسان اسے خوراک بچانے کے لیے مار ڈالنے یا مذبح میں بیچ دینے سے انکار کرتا ہے۔ کیا یہ امر ایک نقصان دہ اقتصادی دستور غیر متنازعہ شہادت نہیں جس کا گئوکشی سے اور اس کا گوشت کھانے کی مذہبی ممانعت سے ہٹ کر کوئی جواز نہیں۔

کسی کو اس سے انکار نہیں کہ گائے کی پوجا لوگوں کو گاؤکشی اور اس کا گوشت کھانے کے خلاف متحرک کرتی ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں کہ گائے کشی کی مخالفت اور اس کا گوشت کھانے کی مذہبی ممانعت سے انسانی فلاح و بہبود پر لازمی طور سے نقصان دہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اپنے بوڑھے اور لاغر جانوروں کو ذبح کرنے یا ضروخت کرنے سے ایک کسان شائد کچھ پیسے کما لے یا عارضی طور پر اپنے گھرانے کی خوراک کو کچھ بہتر بنالے لیکن اس کا مذبح کے پاس بیچنے یا کھانے کے لیے اپنی میز کی زینت بنانے سے انکار بالآخر مفید نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ جان دار مخلوقات کے باہمی اور اردگرد کے ماحول کے

تعلق کا مطالعہ، ایک مسلمہ اصول یہ بتایا ہے کہ نامیاتی جسموں کی پوری آبادیوں کے لیے درمیانے اور اوسط نہیں بلکہ انتہائی نوعیت کے حالات اور شرائط ہی موزوں اور حسبِ حال ہوتی ہیں اور موافقت رکھتی ہیں۔ بھارت میں صورت حال یہ ہے کہ وہاں مون سون بارشوں کی بار بار ناکامی ایسی ہی شرائط سے متعلق ہے۔ گئوکشی اور گائے کا گوشت کھانے کی مذہبی ممانعت کی اقتصادی اہمیت کو جانچنے کے لئے ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ ان ممنوعات کا وقتاً فوقتاً آنے والی خشک سالی اور قحط کے پس منظر میں کیا مطلب ہے۔

ہوسکتا ہے کہ گاؤکشی اور گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت بھی قدرتی انتخاب کی پیداوار ہو جیسے ''زیبو'' نسلوں کے چھوٹے جسم اور ان میں اس طرح قوت اور صحت بحال ہونے کی بے پناہ طاقت، خشک سالی اور قحط کے دوران کسان کو اپنے مویشی مار ڈالنے یا بیچ دینے کی بڑی ترغیب کا شکار ہو جاتے ہیں گویا اپنی بری قسمت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ خشک سالی سے بچ بھی نکلیں۔ کیونکہ جب بارشیں آتی ہیں تو وہ اپنے کھیتوں میں ہل نہیں چلا سکتے۔ میں انہیں بھی زیادہ پر زور انداز میں واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ قحط کے دباؤ کے تحت مویشیوں کو وسیع پیمانے پر ذبح کرنا مجموعی فلاح و بہبود کے لیے ایسا خطرہ ہے جو عام حالات میں کاشتکار کے اپنے جانوروں کی افادیت کا امکانی طور پر غلط اندازہ لگانے کے نتیجے میں ہونے والے خطرے سے سنگین تر ہے۔ گائے کشی کو جس ناقابل بیان حد تک بے ادبی اور بے حرمتی پر محمول کیا جاتا ہے وہ غالباً اذیت ناک تضاد کے سبب ہے جو فوری ضرورتوں اور مستقبل کے حالات میں پایا جاتا ہے۔ گائے کی پوجا اس کی قابل تعظیم علامتیں اور مقدس تعلیمات، کسان کو اس سوچ اور انداز لگانے سے باز رکھتی ہیں جو صرف مختصر مدت کے لیے معقول ہوتا ہے۔ مغربی ماہرین کا خیال یہ ہے کہ بھارتی کاشتکار گویا اپنی گائے کو کاٹ کھانے پر فاقوں کے ذریعے موت کو گلے لگانے کو ترجیح دیتا ہے۔ ایسی ہی قسم کے ماہرین مشرقی باشندوں کے ذہنوں کو ٹٹولے جانے کے ناقابل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ''ایشیائی عوام کو زندگی اتنی عزیز نہیں۔'' وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسان اپنی گائے کھانے پر مر جانے کو ترجیح دے گا، لیکن اگر وہ اسے کھالے تو پھر بھی فاقوں کا شکار ہو جائے گا۔

مقدس قوانین اور گائے کی پوجا کے باوجود بھی گائے کا گوشت کھانے کی ترغیب کو بعض اوقات قحط کے دوران میں دبایا نہیں جا سکتا۔ دوسری عالمگیر جنگ عظیم کے دوران

میں بنگال میں زبردست قحط پڑا جس کی وجہ خشک سالی اور برما پر جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ 1944ء کے موسم گرما میں گائے اور لادو جانوروں کی کٹائی اس حد تک بڑھ گئی کہ برطانوی حکومت کو گائے کے تحفظ سے متعلق قوانین کے نفاذ کے لیے فوج استعمال کرنا پڑی۔ 1967ء میں ''نیویارک ٹائمز'' نے یوں رپورٹ دی ''ہندو جنہیں بہار کے قحط زدہ علاقوں میں فاقوں کا سامنا ہے گائیں کاٹ کر ان کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ جانور ہندو مذہب میں متبرک اور مقدس ہیں۔ مشاہدہ کرنے والوں نے بیان کیا کہ لوگوں کی قابلِ ترس حالت کو تصور میں نہیں لایا جا سکتا۔''

اچھے وقتوں میں مطلقاً ناکارہ، بوڑھے جانوروں کی کچھ تعداد کا زیادہ عمر تک زندہ رہنا، اس قیمت کا حصہ ہے جو مفید مطلب جانوروں کو برے دنوں میں ذبح ہونے سے محفوظ رکھنے کے لیے ادا کی جانی چاہیے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ گائے کشی اور اس اور اس کا گوشت کھانے کی ممانعت کا اصلی نقصان کس قدر ہوتا ہے۔ ایک مغربی زراعتی کاروباری کے نقطۂ نظر سے بھارت میں گوشت کو ڈبوں میں بند کر کے محفوظ کرنے کی صنعت کا نہ ہونا، نامعقولیت نظر آتی ہے۔ لیکن بھارت جیسے ملک میں ایسی صنعت کی اصل گنجائش بہت محدود ہے۔ گائے کے گوشت کی پیداوار میں معتدبہ اضافہ، اردگرد کے پورے ماحول پر دباؤ کا باعث ہوگا۔ یوں گائے سے محبت کے سبب نہیں ہوگا بلکہ حرارت اور توانائی کی دوسری قسموں کے باہمی تعلق سے متعلق قوانین کی رو سے ہوگا۔ غذائی اشیاء کے کسی سلسلے کی زنجیر میں مزید کسی جانور کی کڑیوں کو شامل کرنے سے خوراک کی پیداواری استطاعت میں تیزی سے کمی واقع ہوتی ہے۔ ایک جانور جو کچھ بھی کھاتا ہے، کیلوریوں (حرارت کی اکائیوں) کے حساب سے اس کی مقدار ہمیشہ ان کیلوریوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے جتنی (خود) اس کے کھانے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فی کس حرارت کی زیادہ اکائیاں اس وقت میسر آتی ہیں جب انسانی آبادی، نباتاتی غذا براہ راست استعمال میں لاتی ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہی غذا گھریلو پالتو جانوروں کو کھلائی جائے۔

امریکہ میں گائے کے گوشت کی کثیر مقدار میں کھپت کی وجہ سے ہماری کل زیر کاشت اراضی کا تین چوتھائی حصہ لوگوں کے لیے خوراک کی بجائے مویشیوں کی خوراک کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ چونکہ بھارت میں غذا سے حاصل ہونے والی حرارت کی

اکائیاں روزانہ کی کم سے کم فی کس ضروریات کے حساب سے پہلے ہی تھوڑی ہیں اس لیے قابل کاشت اراضی کو گوشت کی پیداوار کے لیے استعمال میں لانے کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ خوراک کی قیمتیں بڑھ جائیں گی اور غریب خاندانوں کا معیار زندگی مزید گھٹ جائے گا۔ مجھے یہ ماننے میں تامّل ہے کہ بھارت کے دس فیصد سے زائد لوگ کبھی اس قابل ہوں گے کہ گائے کے گوشت کو اپنی خوراک کا اہم حصہ بنا سکیں۔ قطع نظر اس بات سے کہ وہ گائے کی پوجا پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں۔

مجھے اس میں بھی شک ہے کہ ضعیف العمر اور لاغر جانوروں کو مذبح خانوں میں بھیجنے سے ایسے لوگوں کو تقویت بخش غذائی فوائد ہوں گے جو اس کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ ایسے بوڑھے جانوروں میں سے اکثر مذبح خانوں میں نہ بھی بھیجے جائیں تو بھی وہ کھالئے جاتے ہیں۔

لیکن پھر بھی اس سارے پیچیدہ معاملے میں میری رائے اس کی ماحولیاتی اور اقتصادی اہمیت سے متعلق غلط ہو سکتی ہے۔ ہر بات کا انحصار اس پر ہے کہ بھارت کی بہت بڑی آبادی کی ضرورت پوری کرنے کے متبادل طریقوں کی نسبت سے اس کے قدرتی وسائل اور افرادی قوت کے پیمانے سے کیا قیمت ہے۔ اس قیمت کا اندازہ بڑی حد تک اس خوراک سے لگا جا سکتا ہے جو یہ جانور کھاتے ہیں۔ بعض ماہرین یہ کہتے ہیں کہ انسان اور گائے کے درمیان زمین اور غذائی اجناس کی فصلوں کا زبردست مقابلہ ہے۔ یہ مفروضہ صحیح ہوتا اگر بھارتی کاشتکار امریکی طرز کی زراعت کاری کی پیروی کرتا اور مویشیوں کو غذائی پیداوار کھلاتا۔ لیکن مقدس گائے سے متعلق شرمناک حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک انتھک خاکروب کی مانند ہے۔ ایک عام گائے جو خوراک کھاتی ہے اس کا ایک حقیر سا حصہ چارے اور غذائی اجناس پر مشتمل ہوتا ہے جو اس مقصد کے لیے الگ کر دیا جاتا ہے۔

گایوں سے متعلق ایسی تمام مستقل رپورٹوں سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ ادھر ادھر گھومتی پھرتی اور ٹریفک میں خلل کا سبب بنتی ہیں۔ یہ جانور مارکیٹوں میں، میدانوں میں، سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے ساتھ آس پاس اور بنجر پہاڑیوں پر پھر رہی ہوتی ہیں۔ اگر وہ مٹھی بھر گھاس کا ہر تنکا، فصلوں کی کٹائی کے بعد بچ جانے والی ان کی جڑیں اور فصل کو (جو انسان براہ راست استعمال نہیں کر سکتا) نہیں کھا رہی ہوتیں تو اور

کیا کر رہی ہوتی ہیں؟ یہی گند کھا کر وہ اسے دودھ اور دوسری مفید اشیا میں تبدیل کرتی ہیں۔ مغربی بنگال میں مویشیوں پر تحقیق سے ڈاکٹر''اوڈنڈھال'' نے انکشاف کیا کہ جانوروں کی خوراک کا بڑا حصہ، انسانی استعمال کی غذائی اجناس کی ایسی ضمنی پیداوار پر مشتمل ہوتا ہے جو انسانی استعمال کے ناقابل ہوتا ہے۔ مثلاً چاول کا بھوسہ، گیہوں کا چھان بورا او رچاولوں کا چھلکا وغیرہ۔ جب فورڈ فاؤنڈیشن نے یہ اندازہ لگایا کہ خوراک کی فراہمی کے حساب سے مویشیوں کی نصف تعداد زائد ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نصف تعداد میں مویشی، چارے کی فصل ان کی پہنچ سے باہر ہونے کے باوجود زندہ تھے۔ لیکن یہ بیان ادھورا ہے۔ جو کچھ یہ جانور کھاتے ہیں اس کا غالباً 20 فیصد سے بھی کم انسانوں کے کھانے کے لائق اشیا پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ بھی خشک اور دودھ سے فارغ گایوں کی بجائے کام کرنے والے بیلوں اور بھینسوں کو کھلایا جاتا ہے۔ ''اوڈنڈھال'' نے محسوس کیا کہ جس علاقے میں انہوں نے تحقیقی مطالعہ کیا وہاں مویشیوں اور انسانوں کے مابین زمین یا خوراک کی کمی فراہمی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ بنیادی طور پر مویشی ایسی اشیا کھا کر جن کی انسانوں کے لئے براہ راست کوئی قدر و قیمت نہیں انہیں فوری ضرورت اور کام آنے والی پیداوار میں تبدیل کرتے ہیں۔

گائے کی محبت کو اکثر غلط انداز میں لئے جانے کی ایک وجہ امیروں اور غریبوں کے لئے اس عمل کے مختلف مقاصد ہیں۔ غریب کاشتکار اسے جھاڑو پھیرنے کے لائسنس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ امیر کاشتکار اس کو کاٹنے اور چیرنے پھاڑنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ غریب کسانوں کے لیے گائے ایک مقدس بھکاری ہے جبکہ امیر کسان کے نزدیک ایک چور۔ کبھی کبھار گائیں کسی کی چراگاہوں یا پودوں کے کھیتوں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ غریب کسان اپنی لاعلمی کا سہارا لیتے ہیں اور گئو رکھیا کے سہارے اپنے جانور واپس لے لیتے ہیں۔ اگر کوئی مقابلہ ہے تو یہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان یا ایک ذات اور دوسری ذات کے درمیان ہے، انسان اور جانوروں کے درمیان نہیں۔

شہروں میں بھی گایوں کے ایسے مالک ہیں جو دن کے وقت انہیں گھوم پھر کر چارے وغیرہ کی تلاش کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور رات کو واپس بلا لیتے ہیں تاکہ ان کا دودھ نکال سکیں۔ ڈاکٹر مینچر یاد کرتی ہیں کہ جب انہیں تھوڑے عرصے کے لیے مدراس میں

متوسط درجے کے لوگوں کی ہمسائیگی میں رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کے پڑوسی مستقل طور پر ''آوارہ'' گایوں کے ان کے گھریلو صحنوں میں گھس آنے کی شکائت کرتے رہے یہ ''آوارہ'' گائیں دراصل ان لوگوں کی ملکیت تھیں جو ایک دکان کی اوپر والی پر بنے ہوئے ایک کمرے میں رہتے تھے اور جو پڑوس میں گھر گھر جا کر دودھ فروخت کرتے تھے۔ جہاں تک گئو شالوں اور پولیس کے گئو پھاٹکوں کا تعلق ہے، شہری ماحول میں گائے پالنے کے خطرے کو کم کرنے میں بہت اچھی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اگر کوئی گائے دودھ دینا بند کر دیتی ہے تو مالک یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے گھومنے پھرنے کے لیے کھلا چھوڑ دے جب تک پولیس اسے پکڑ کر اپنے پھاٹک کے احاطے میں بند نہ کر دے۔ جب گائے برآمد ہو جاتی ہے تو مالک معمولی سا جرمانہ ادا کر کے اسے پھر اپنے ٹھکانوں پر واپس جانے دیتا ہے۔ گئو شالے بھی اسی قاعدے کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے رعائتی نرخوں پر فراہم کیا ہوا سستا چارہ انہیں کھانے کو دیا جاتا ہے جو عام طور پر بصورت دیگر شہری گایوں کو میسر نہیں آتا۔

اتفاق سے شہروں میں دودھ خریدنے کے لئے اس بات کو ترجیح دی جاتی ہے کہ گائے گھروں پر لائی جائے اور وہیں اس کا دودھ نکالا جائے۔ اکثر صورتوں میں دودھ کے خریدار کے لئے یہ واحد طریقہ ہے جس سے اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ خالص دودھ لے رہا ہے اور اس میں پانی یا پیشاب نہیں ملایا گیا۔ ان انتظامات سے متعلق جو بات نہایت ناقابل یقین نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ہندوؤں کی اقتصادی لحاظ سے نقصان دہ اور فضول خرچی کی عادتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ دراصل یہ ایک حد تک ایسی کفایت شعاری کا اظہار ہے جو بچت اور کفائت سے متعلق مغربی پروٹسٹنٹ معیار کی نسبت بہت زیادہ بہتر ہے۔ گائے کی پوجا اس کے جسم سے دودھ کے آخری قطرے تک نچوڑ لینے کے بے رحم پختہ عزم کی آئینہ دار ہے۔ آدمی جو گائے کو گھر گھر لے کر جاتا ہے اس کے ساتھ گائے کے بچھڑے کا ایک پتلا (ڈمی) ہوتا ہے جو بچھڑے کی کھال کو بھر کر بنایا جاتا ہے۔ اس ڈمی کو وہ گائے کے نیچے کھڑا کر دیتا ہے تا کہ گائے دودھ دینا شروع کرے۔ جب یہ ترکیب بھی کام نہ کرے تو پھر مالک پھوکے کا سہارا لیتا ہے۔ یعنی گائے کی رحم میں ایک خالی پائپ کے ذریعے ہوا بھر کر یا ''دوم دیو'' یعنی اس کی دم کو اس کی اندام نہانی کے سوراخ میں گھسیڑ دیتا ہے۔ گاندھی کو

MashalBooks.org

یقین تھا کہ گائے کے ساتھ بھارت میں باقی دنیا بھر کے کسی بھی حصے کی نسبت زیادہ ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ وہ رنجیدہ ہوتا تھا کہ ''اس سے دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑنے کے لیے ہم اسے کس طرح خون آلود کرتے ہیں، کس طرح اسے بھوکا مار کر نحیف اور لاغر کر دیتے ہیں، ہم بچھڑوں سے کتنا غلط سلوک کرتے ہیں۔ ہم کیسے ان کے حصے کے دودھ سے انہیں محروم کر دیتے ہیں۔ ہم بیلوں پر کتنا ظلم روا رکھتے ہیں، انہیں خصی کرتے ہیں، مارتے ہیں اور ان پر ان کی برداشت سے زائد بوجھ لاد دیتے ہیں۔''

گاندھی سے بڑھ کر کوئی اور اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ گائے کی محبت کے مقاصد امیروں اور غریبوں کے لئے مختلف تھے۔ ان کے نزدیک بھارت میں قومیت کے احساس کو بیدار کرنے کی تگ و دو میں گائے ایک مرکزی نکتہ تھی۔ گائے کی پوجا کے ساتھ ساتھ چھوٹے پیمانے پر کھیتی باڑی، ہاتھ سے چلنے والے چرخوں کی مدد سے روئی کات کر دھاگا بنانا، آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھنا، لباس میں لنگوٹی استعمال کرنا، زندگی کا احترام اور عدم تشدد کی سخت پابندی، یہ سب باتیں بھی تھیں۔ انہی طور طریقوں کے سبب سے گاندھی کو کسانوں، عوام، شہری غریب طبقوں اور اچھوتوں میں وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل تھی...... اور ان غریب طبقوں کو صنعت کاری کی غارت گری سے بچانے کے لیے اس کا یہ طریقہ کار تھا۔

ماہرین اقتصادیات جو بھارتی زراعت کو زیادہ مستعد بنانے کے لئے، زائد از ضرورت جانوروں کو کاٹ کھانے کے حامی ہیں، وہ ''اہنسا'' کے امیروں اور غریبوں کے لئے مختلف مقاصد ہونے سے ناواقف ہیں۔ مثلاً پروفیسر ایلین ہٹن یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مویشی نہایت عمدہ خدمات انجام دیتے ہیں اور ان کا نعم البدل فوری طور پر دستیاب نہیں۔ لیکن ان کی رائے میں یہ خدمت زیادہ بہتر طور پر حاصل کی جا سکتی ہیں اگر گائیوں کی تعداد میں تین کروڑ تک کی کمی کر دی جائے۔ یہ تعداد اس مفروضے پر اعتماد کے باعث ہے کہ خاطر خواہ دیکھ بھال کے نتیجے میں صرف چالیس گائیں ہی ایک سو بیلوں کے لئے درکار ہوں گی جو بیلوں کی موجودہ تعداد کی جگہ لے سکیں گے۔ اب اس وقت چونکہ ان بیلوں کی تعداد سات کروڑ بیس لاکھ ہے اس لئے بچے دینے والی دو کروڑ چالیس لاکھ گائیں کافی ہونی چاہئیں جبکہ ان کی اصل تعداد پانچ کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ پانچ کروڑ چالیس لاکھ میں سے دو کروڑ چالیس لاکھ منفی کرنے سے ہٹن کے اندازے کے مطابق تین کروڑ ''بے کار'' جانوروں کو ذبح

MashalBooks.org

کر دینا چاہیے۔ وہ چارہ اور خوراک جو یہ ''بے کار'' جانور کھاتے رہے ہیں اسے باقی بچ جانے والے جانوروں کو کھلایا جائے جو اس طرح زیادہ صحت مند ہوں گے اور یوں دودھ اور گوبر کی کل پیداوار بھی پہلی ہی سطح پر برقرار رہے گی یا اس سے بھی زائد ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کن لوگوں کی گائیں کاٹی جائیں؟ جانوروں کی کل تعداد کا تقریباً 43 فیصد غریب ترین 62 فیصد لوگوں کے فارموں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فارم 5 ایکڑ یا اس سے بھی کم رقبوں پر مشتمل ہیں اور ان کا صرف 5 فیصد رقبہ چارے اور چراگاہ کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عارضی طور پر دودھ نہ دینے والے، ہرے نہ ہونے والے اور لاغر جانوروں کے مالک وہ لوگ ہوتے ہیں جو بہت چھوٹے قطعہ ہائے زمین پر گزارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ معاشیات کے ماہرین جب 3 کروڑ گایوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں تو درحقیقت ان کی مراد ان 3 کروڑ گایوں سے نجات حاصل کرنا ہوتی ہے جو غریب اور کنگال لوگوں کی ملکیت ہیں، امیروں کی نہیں۔ لیکن بہت غریب لوگوں کے پاس صرف ایک گائے ہی ہوتی ہے۔ سو اس کفایت شعاری کا جو انجام نظر آتا ہے وہ اتنا 3 کروڑ گائیوں سے نجات پانا نہیں جتنا 15 کروڑ لوگوں کو زمین سے بے دخلی پر مجبور ہو کر شہروں کی جانب دھکیلنا اور ان سے گلو خلاصی ہے۔

گائے کو ذبح کرنے کے پر جوش حامیوں کی سفارشات کی بنیاد سمجھ میں آنے والی ایک غلط فہمی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ کسان اپنے مویشیوں کو مارنے سے انکاری ہوتے ہیں، اور چونکہ اس عمل کی مذہبی ممانعت بھی ہے اس لئے اسی ممانعت ہی کے باعث گائیوں کی تعداد کا تناسب بیلوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان کی غلطی، ان کے اپنے مشاہدے میں آنے والے تناسب (یعنی 70 گائیں بمقابلہ 100 بیل) ہی میں پنہاں ہے اگر گائے کی محبت کسانوں کو گائے ذبح کرنے سے باز رکھتی ہے جو اقتصادی لحاظ سے ناکارہ ہوں تو پھر یہ کیسے ہے کہ گائیوں کی تعداد بیلوں سے 30 فیصد کمتر ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پیدا ہونے والے نر اور مادہ جانوروں کی تعداد کم و بیش یکساں (تقریباً برابر) ہوتی ہے۔ پھر کوئی وجہ تو ہے جس کے باعث مادہ جانوروں کی شرح موت نر جانوروں سے زیادہ ہے۔ اس اس الجھن کا حل یہ ہے کہ کوئی ہندو کسان جان بوجھ کر گائے کی مادہ بچی (بچھڑی) یا بوڑھی اور لاغر گائے کو کسی لٹھ یا چھرے سے نہیں مارتا لیکن وہ ان سے چھٹکارا پا سکتا ہے اور پاتا بھی

MashalBooks.org

ہے جب وہ اس کے نقطۂ نظر سے ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے براہ راست مار ڈالنے سے کم تر کئی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً بے ضرورت بچھڑوں کو مارنے کے لیے ان کی گردنوں میں لکڑی کا ایک تکونی طوق ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب وہ ماں کا دودھ پینا چاہتے ہیں تو گائے کے تھن زخمی ہو جانے کی وجہ سے وہ انہیں لات سے ٹھوکر مار کر موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔ بوڑھے جانوروں کو چرتے وقت کھونٹے کے ساتھ چھوٹے رسے سے باندھ دیا جاتا ہے اور یوں اسے بھوکوں مرنے دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جانور لاغر یا بیمار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیتا۔ اور حتمی طریقہ یہ ہے کہ نامعلوم تعداد میں لاغر گائیں چپکے چپکے اور خفیہ طور پر مسلمان اور عیسائی ایجنٹوں کی معرفت بیچ دی جاتی ہیں جو مذبح خانوں میں پہنچ کر ختم ہوتی ہیں۔

اگر ہم گائیوں اور بیلوں کے مذکورہ بالا تناسب کی وجوہات سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بارش، ہوا، پانی اور اراضی کی ملکیت کے مروّجہ خاکوں کو مدّنظر رکھنا ہوگا۔ صرف گائے کی محبت کو نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ گائے اور بیل کا تناسب بھارت کے مختلف حصوں میں زرعی نظام کے مختلف حصوں میں زرعی جزو جس میں کمی بیشی ہوتی ہے وہ چاول کی کاشت کے لیے آب پاشی کے پانی کی دستیابی ہے۔ جہاں کہیں بھی دھان کی فصلوں کے وسیع مرطوب کھیت ہیں وہاں بھینسوں سے ہل چلانے کو ترجیح دی جاتی ہے اور پھر ''زیبو'' گائے کی جگہ دودھ کے حصول کا ذریعہ بھینس ہوتی ہے۔ اسی لئے شمالی بھارت کے وسیع میدانی علاقوں میں جہاں کوہ ہمالیہ کی پگھلتی ہوئی برف اور مون سون بارشوں کے سبب مقدس دریائے گنگا بہتا ہے وہاں گائیوں کا بیلوں کے ساتھ تناسب گر کر 47 بمقابلہ 100 کا رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ممتاز بھارتی ماہر معاشیات کے این راج بتاتے ہیں، گنگا کے میدانی اضلاع میں، جہاں پورے سال کے دوران دھان کی کاشت جاری رہتی ہے، وہاں گائے اور بیل کا باہمی تناسب نظریاتی اور اصولی پیمانوں کے مطابق سب سے زیادہ مناسب اور سازگار ہے۔ یا اس کے قریب تر ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے اور بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ مذکورہ علاقہ...... یعنی گنگا کے میدان ہندو مذہب کا گڑھ ہیں اور ان کے مقدس ترین مندر یہاں واقع ہیں۔

یہ نظریہ کہ گایوں کی تعداد کا تناسب بیلوں کے مقابلے میں زیادہ ہونے کی وجہ

MashalBooks.org

مذہب ہے، یوں بھی غلط ثابت ہوتا ہے اگر ہم ہندو بھارت کا مقابلہ مسلم (مغربی) پاکستان سے کریں۔ گائے کی پوجا اور گائے کا گوشت کھانے کی مذہبی ممانعت کو رڈ کرنے کے باوجود پاکستان میں بہ حیثیت مجموعی ہر 100 بیلوں کے لیے 60 گائیں ہیں۔ یہ تعداد عظیم ہندو اکثریت والے صوبے اتر پردیش کی اوسط کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہے۔ جب اتر پردیش کے بھینسوں اور نہری آبپاشی کی اہمیت کے حامل علاقوں (منتخب ضلعوں) کا موازنہ مغربی پاکستان کے ایسے ہی یکساں ماحول کے اضلاع سے کیا جاتا ہے تو دونوں علاقوں میں نر اور مادہ کی نسبت یکساں پائی جاتی ہے۔

کیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گائے کی محبت کا نر اور مادہ جانوروں کی باہمی نسبت تناسب یا زرعی نظام کے دوسرے پہلوؤں پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں؟ نہیں! میں یہ نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ واضح اور شکستہ طریقوں سے جڑے ہوئے مادی اور ثقافتی نظام میں گائے کی محبت ایک مؤثر اور طاقت ور عنصر ہے۔ گائے کی محبت انسان کی اس مخفی صلاحیت کو متحرک کرتی ہے جس کی بدولت مدھم توانائی والے ماحول میں مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہنے کا حوصلہ ملتا ہے کیونکہ اس ماحول میں آرام طلبی اور سستی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ گائے کی محبت سے انسانی آبادی میں صبر آزما حالات سے سمجھوتا کرنے کی لچک میں اضافہ ہوتا ہے جس کے باعث وہ عارضی طور پر خشک اور بانجھ لیکن پھر بھی کارآمد جانوروں کو استقلال اور حوصلے سے برداشت کرتی ہے۔ گائے کے گوشت کو محفوظ کرنے کی صفت (جو توانائی کے مصرف کے لحاظ سے مہنگی ہے) کی حفاظت اور خشک سالی اور قحط کے دوران میں جانوروں کی عددی گنجائش کی بحالی کو محفوظ رکھنے جیسے اقدامات اس کی مثال ہیں۔ کسی بھی قدرتی یا مصنوعی نظام کی طرح، ان کے ایک دوسرے پر پیچیدہ اثرات کے نتیجے میں کچھ ناچاقیاں، شکر رنجیاں اور نقصان بھی ہوتے ہیں جن کے باعث پچاس کروڑ لوگ، جانور، محنت و مشقت، سیاسی معیشت زمین کی مٹی اور آب و ہوا......غرضیکہ سب چیزیں ان کی لپیٹ میں آتی ہیں۔ ذبیحہ کے پرجوش حامیوں کا دعویٰ ہے کہ گائیوں کی بے تحاشا افزائش نسل اور پھر اس تعداد میں بھوک اور بے توجہی کے باعث کمی فضول خرچی اور نااہلی ہے۔ مجھے اس میں کوئی فکر نہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن صرف ایک محدود اور مقابلتاً بے معنی حد تک! محض بے کار جانوروں کی ایک نامعلوم تعداد سے چھٹکارا پا کر ایک زرعی ماہر جو بچت حاصل کرتا ہے اس

سے بمشکل گذر بسر کرنے والے کسانوں کے، خصوصاً خشک سالی اور قحط کے دوران میں ہونے والے نقصانات کی تلافی ہو جانی چاہئے۔

چونکہ انسانی سرگرمیوں کو مؤثر طور پر رواں دواں رکھنے کا انحصار، نفسیاتی دباؤ کے تحت قبول کئے جانے والے مذہبی اعتقادات اور تعلیمات پر ہے، اس لئے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ معاشی نظام ہمیشہ اپنی مناسب ترین استعداد کے ساتھ ان عقیدوں کے مطابق اوپر اور نیچے کی حدود میں چلتے رہیں گے۔ لیکن یہ مفروضہ کہ سارے نظام کو اس کے شعور سے عدم واقفیت کی بنا پر معترض ہو کر اسے بہتر طریقہ سے چلایا جا سکتا ہے، بھولپن اور خطرے کا باعث ہوگا۔ موجودہ نظام میں بڑی اصلاحات، بھارت کی آبادی کو مستحکم بنا کر او رزیادہ زمین، پانی، بیل اور بھینسیں زیادہ لوگوں کو زیادہ مساویانہ بنیادوں پر دستیاب ہونے سے کی جا سکتی ہیں۔ یا اس کا متبادل طریقہ یہ ہے کہ موجود نظام کو پوری طرح تلپٹ اور ملیا میٹ کر کے س کی جگہ آبادی سے متعلق مستند اعداوشمار، صنعت وحرفت کے لئے فنی طریقے، سیاسی اقتصادیات اور نظریاتی تعلقات.....غرضیکہ ایک بالکل نیا ماحولیاتی نظام لانا ہوگا ہندومت بلاشبہ ایک ایسی قدامت پسند قوت ہے، جو ترقی کے خواہشمند ماہرین او رجدیدیت پسند کارندوں کی راہ میں پرانے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ، وافر توانائی والے صنعتی اور زرعی سرگرمیوں کے مربوط مراکز قائم کرنے کے عزائم میں رکاوٹ ہے۔ لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وافر توانائی کے حامل صنعتی اور زرعی سرگرمیوں کے کمپلیکس لازمی طور پر زیادہ معقول اور اہمیت کے حامل ہوں گے، تو یہ آپ بھول جائیں!

توقعات کے برعکس، توانائی کی لاگتوں اور توانائی سے حاصل ہونے والی پیداوار کے تحقیقی مطالعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بھارت اپنے مویشیوں کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں زیادہ اہلیت سے استعمال کرتا ہے۔ مغربی بنگال کے ضلع بنگلور میں ڈاکٹر اوڈنڈھال نے دریافت کیا کہ جانور کی توانائی کی مجموعی اہلیت یا استعداد (اگر اس کی حرارت کی کل مفید اکائیوں (حراروں) کی فی سال پیداوار کو اس عرصہ کے دوران میں اس پر خرچ ہونے والی اکائیوں سے تقسیم کیا جائے تو یہ استعداد معلوم کی جا سکتی ہے) 17 فیصد تھی۔ اس کے مقابلے میں امریکی گوشت دینے والے مویشی (گائے) کی مجموعی توانائی کی استعداد 4 فیصد سے کم تھی جن کی افزائش مغرب کے وسیع سبزہ زاروں میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ

اوونڈھال کہتے ہیں کہ ’’بھارتی مویشیوں کے جامع کمپلیکس کی بہتر اہلیت اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ پیداوار دینے والے یا زرخیز ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان کی پیداوار سے استفادہ زیادہ احتیاط اور ہوشیاری سے کیا جاتا ہے۔ دیہات کے لوگ حتیٰ المقدور کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں اور کچھ ضائع نہیں کرتے۔‘‘

ضیاع کی خاصیت جدید زراعت کاری میں روایتی اجڈ کسانوں کی معیشت سے زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر صرف یہی نہیں کہ گائے کے گوشت کی پیداوار کے خود کار جدید نظام میں مویشیوں کی کھاد استعمال میں نہیں لائی جاتی بلکہ اس سے وسیع علاقوں کا زمینی پانی بھی آلودہ ہوتا ہے، جس سے نزدیکی ندی نالوں اور جھیلوں کی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔

صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ قوموں کا معیار زندگی بلند ہونے کی وجہ زیادہ پیداواری صلاحیت کا نتیجہ نہیں بلکہ توانائی کی فی کس دستیابی کی شرح میں بے پناہ اضافہ ہے۔ 1970ء میں ریاستہائے متحدہ میں استعمال کی جانے والی توانائی 12 ٹن کوئلے کے مساوی تھی جبکہ بھارت میں یہ ایک ٹن کے پانچویں حصے کے برابر تھی۔ جس طریقے سے یہ توانائی خرچ کی گئی اس میں فی کس کے حساب سے ضائع جانے والی توانائی بھارت کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ موٹر گاڑیاں اور ہوائی جہاز، بیل گاڑیوں سے زیادہ تیز رفتار ہیں لیکن ان میں توانائی کا استعمال زیادہ مستعدی سے نہیں ہوتا۔ امریکہ میں ایک دن کے دوران میں جتنی توانائی کی مقدار ٹریفک کے بہاؤ اور بھیڑ کی وجہ سے حرارت اور دھوئیں میں ضائع ہوتی ہے وہ اس مقدار سے زیادہ ہے جو بھارت میں سب گائیں مجموعی طور پر پورے سال بھر کے دوران میں ضائع کرتی ہیں۔ یہ موازنہ مزید ناموافق ہو جاتا ہے جب ہم زائد بوجھ کے باعث، چلتے چلتے، انجن بند ہو جانے والی گاڑیوں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ یہ گاڑیاں پٹرولیم کے ان ناقابل تجدید ذخیروں کو جلانے سے چلتی ہیں جو زمین میں کروڑ ہا برس گزر جانے کے بعد جمع ہوئے۔ اگر آپ حقیقی مقدس گائے کو دیکھنا چاہتے ہیں تو باہر جائیں اور اپنی خاندانی موٹر کار کو دیکھیں۔

☆☆☆

MashalBooks.org

سؤر کے شیدائی اور سؤر سے متنفر

ہر شخص بظاہر بے تکی عادات کی مثالیں جانتا ہے۔ چینی کتے کا گوشت پسند کرتے ہیں لیکن گائے کے گوشت سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں گائے کا گوشت پسند ہے لیکن ہم کتے نہیں کھائیں گے۔ برازیل میں کئی قبیلے چیونٹیاں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر میں پسند و ناپسند کا یہ سلسلہ چلتا ہے۔

مجھے سؤر کی پہیلی، گئو ماتا کے ذکر کا ایک اچھا تسلسل لگتی ہے۔ یہ پہیلی وضاحت چاہتی ہے کہ کیوں کچھ لوگ اس سے نفرت کرتے، جبکہ دوسرے اس جانور سے محبت کرتے ہیں۔

اس پہیلی کا نصف حصہ جو سؤر سے نفرت کرنے والوں یعنی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں سے متعلق ہے، اچھی طرح معلوم ہے۔ قدیم عبرانیوں کے معبود نے اپنے معمول سے ہٹ کر (ایک دفعہ عہد نامہ عتیق کی پہلی کتاب اور پھر تورات کی تیسری کتاب میں) سؤر سے اعلانیہ نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ یہ ناپاک اور غلیظ جانور ہے جس کا ذائقہ چکھنے یا اس کے لمس سے ناپاکی اور نجاست ہوتی ہے۔ پندرہ سو سال بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو بتایا کہ سؤر کا مقام، اسلام کے پیروکاروں کے لیے وہی رہے گا۔ لاکھوں یہودی اور کروڑوں مسلمان سؤر سے آج بھی انتہائی نفرت اور کراہت کرتے ہیں جبکہ اس میں کسی دوسرے جانور کی نسبت ہر اناج اور آلو وغیرہ جیسی سبزیوں کو اعلیٰ درجے

کی چکنائی اور پروٹین میں بدلنے کی صلاحیت ہے۔

سؤر سے محبت کرنے والے جنونی دوستوں کی روایات کا علم عام لوگوں کو کم ہے۔ دنیا میں سؤر کے دلدادہ لوگوں کا عالمی مرکز نیوگنی اور بحرالکاہل کے جنوبی جزائر ہیں۔ اس علاقے کے دیہات میں بسنے والے باغبان پیشہ قبائل کے نزدیک سؤر مقدس جانور ہیں۔ انہیں اپنے آباواجداد کی نجات کے لیے قربان کرنا چاہیے اور سب سے اہم موقعوں پر اسے کھانا چاہیے، مثلاً شادی بیاہ اور موت فوت پر، کئی قبیلوں میں جنگ اور صلح کے اعلان پر سؤر کی قربانی ضروری ہے۔ قبائلی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے فوت ہو جانے والے بزرگان کو سؤر کے گوشت کی بے تحاشا طلب ہوتی ہے اور زندہ اور مردہ لوگوں میں سؤر کے گوشت کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اکثر اوقات بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور کسی قبیلے کے تقریباً سب کے سب سؤر کھالیے جاتے ہیں۔ متواتر اور لگاتار کئی دنوں تک دیہاتی اور ان کے مہمان سؤر کے گوشت کی بڑی مقدار سے حلق تک سیر ہو جاتے ہیں۔ اسے ہضم نہیں کر پاتے تو قے کرتے ہیں تاکہ مزید کھانے کی گنجائش بنا سکیں۔ جب یہ سارا ہنگامہ ختم ہوتا ہے تو سؤروں کا ریوڑ اتنا مختصر رہ جاتا ہے کہ کئی سالوں پر محیط تکلیف دہ کفایت شعاری کے ذریعے ہی اس کی تعداد بڑھائی جاتی ہے۔ لیکن جونہی یہ تعداد بڑھ جاتی ہے، بسیار خوری کے ایک اور عیش و نشاط کے پروگرام کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور اس طرح واضح بدانتظامی کا منفرد سلسلہ اور اوٹ پٹانگ چکر چلتا رہتا ہے۔

میں مسئلے کو سؤر سے نفرت کرنے والے یہودیوں اور مسلمانوں سے شروع کروں گا۔ ''یہودا'' (یہودیوں کے خدا) اور اللہ تعالیٰ جیسی عظیم اور برتر ہستی نے سؤر جیسے بے ضرر بلکہ قابل تمسخر جانور کو کیوں مسترد کر دیا جبکہ اس کے گوشت کو انسانوں کی بڑی تعداد شوق سے کھاتی ہے؟ ایسے محققین نے جو خنزیر کی بائبل اور قرآن میں تحقیر کو تسلیم کرتے ہیں اس کی کئی وضاحتیں دی ہیں۔ تحریک احیائے علوم سے پہلے مقبول ترین دلیل یہ تھی کہ سؤر صحیح معنوں میں ایک غلیظ اور نجس جانور ہے...... دوسروں سے بھی زیادہ گندا کیونکہ یہ اپنے بول و براز میں لتھڑا رہتا ہے اور اسے کھاتا بھی ہے۔ لیکن جسمانی نجاست کو مذہبی تنفر اور گھن آمیزی سے منسلک کرنا ناموافقت کا اشارہ ہوسکتا ہے۔ گائیں بھی جنہیں ایک محدود جگہ میں رکھا جاتا ہے، اپنے گوبر اور پیشاب میں لت پت ہوتی ہیں اور بھوکی گائیں انسانی فضلہ

بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ کتے اور مرغی چوزے بھی کسی کو برہم کئے بغیر یہی کچھ کرتے ہیں اور پرانے زمانے کے لوگوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ صاف ستھرے ماحول اور احاطے میں پرورش پانے والے سؤر بڑے نزاکت پسند پالتو جانور ہوتے ہیں اور آخری بات، اگر ہم صفائی کا معیار خالصتاً نفاست سے پرکھیں تو پھر ایک ہوش ربا ناموافقت سامنے آتی ہے۔ کیونکہ بائبل میں مکڑی اور ٹڈوں کی درجہ بندی بے عیب اجلے جان داروں میں کی گئی ہے۔ یہ دلیل کہ یہ حشرات نفاست اور عمدگی کے لحاظ سے سؤر کی نسبت زیادہ صحت بخش ہیں، عقیدے سے وفاداری کے مقصد کو تقویت نہیں بخشے گی۔

تحریک احیائے علوم کی ابتدا میں یہودی مذہبی قائدین اور قانون دان ان بے ربط (نقائص) کو تسلیم کرتے تھے۔ موسیٰ میمونائیڈ بارھویں صدی کے دوران میں قاہرہ میں صلاح الدین کا شاہی طبیب تھا۔ یہودیوں اور مسلمانوں کی طرف سے سؤر کے گوشت کو مسترد کئے جانے کے قدرتی اسباب پر مبنی وضاحت اس نے پیش کی۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے سؤر کے گوشت کی ممانعت صحت عامہ کے اقدام کے طور پر کی تھی۔ یہودی مذہبی قائد نے لکھا کہ سؤر کا گوشت جسم و جان پر ایک برا اور نقصان دہ اثر چھوڑتا ہے۔ اس نے اپنی اس رائے کے حق میں کوئی مخصوص طبّی وجوہات بیان نہیں کیں لیکن شاہی طبیب ہونے کے ناطے اس کی رائے کو بہت محترم سمجھا گیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں یہ انکشاف ہوا کہ سؤر کا ادھ پکا گوشت کھانے سے پٹھوں کی بیماری ''ٹرچنارس'' لاحق ہوتی ہے جس کی وجہ سے پٹھوں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ اس انکشاف نے میونائیڈ کی دانائی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اصلاح پسند یہودیوں نے بائبل کے قوانین کے اساسی منطق پر مسرت ظاہر کی اور نہایت مستعدی کے ساتھ سؤر کے گوشت کی مذہبی مخالفت کو ترک کر دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ مناسب طور پر پکایا ہوا گوشت عوام کی صحت کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں، اس لئے اس کا استعمال بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہوسکتا۔ یہودی عالموں میں اشتعال پیدا ہوا اور بنیاد پرست مبلغین جوابی کارروائی کے طور پر ساری قدرتی مذہبی روایتوں کے خلاف تحریک چلانے پر مائل ہوئے۔ اگر یہودیوں کا خدا ''یہودا'' صرف اپنے لوگوں کی صحت کی حفاظت چاہتا تھا تو وہ انہیں اسے ہرگز نہ کھانے کی بجائے صرف اچھی طرح پکایا ہوا گوشت کھانے کی ہدایت

کرتا۔ انہوں نے دلیل پیش کی کہ ''یہودا'' کا مقصد کچھ اور تھا.....محض طبی فلاح سے زیادہ اہم کوئی اور مقصد۔

مذہبی نقطۂ نظر سے غیر مستحکم ہونے کے علاوہ میمونائڈ کی وضاحت میں طبی اور وبائی امراض سے متعلق منطقی تضادات بھی موجود ہیں۔ سؤر انسانی بیماریوں کو پھیلانے کا سبب بنتا ہے تو دوسرے گھریلو جانوروں سے بھی یہی کچھ ہوتا ہے جنہیں مسلمان اور یہودی کھلے عام استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گائے کا گوشت (پراسائٹس) کی پیدائش کا سبب بنتا ہے جو پندرہ سے بیس فٹ تک طویل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خون میں ہموگلوبین کی شدید کمی لاتا اور کئی دوسری متعدی بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت گھٹاتا ہے۔ مویشی، بکریاں اور بھیڑیں بھی انسانی بیماریوں کو پھیلاتی ہیں۔ ایک خاص قسم کے بخار کا سبب بنتی ہیں جو پسماندہ ممالک میں جراثیم سے پھیلنے والی ایک عام متعدی مرض ہے۔ اس میں بخار کے ساتھ کپکپاہٹ، پسینہ، نقاہت اور درد ہوتا ہے اور ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں۔ اس بخار کی سب سے زیادہ خطرناک قسم بکریوں اور بھیڑوں کے ذریعے پھیلتی ہے۔ اس کی علامات میں سستی، تھکاوٹ، اعصابی کمزوری اور ذہنی انتشار شامل ہیں۔ اسے غلطی سے نفسیاتی خلل سمجھا جاتا ہے اور آخر میں اینتھراکس کی بیماری ہے جو مویشیوں، بھیڑوں، بکریوں، گھوڑوں اور خچروں سے تو پھیلتی ہے لیکن سؤروں سے نہیں۔ سؤروں سے پھیلنے والی پٹھوں کی بیماری (ٹرچناسس) کے برعکس، جس کے نتائج شاذ ہی مہلک ہوتے ہیں اور اکثر افراد پر اس کی علامات تک ظاہر نہیں ہوتیں۔ ''اینتھراکس'' کا مرض تیزی سے مریض کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ اس سے جسم پر پہلے پھوڑے پھنسیاں نکلتی ہیں جن سے خون زہر آلودہ ہوتا ہے اور انجام موت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اینتھراکس سے پھیلنے والی وبائی امراض پر، جن سے پہلے یورپ اور ایشیاء متاثر ہوئے تھے۔ اس وقت تک قابو نہ پایا جا سکا جب تک 1881ء میں ''لوئی پاسچر'' نے اینتھراکس کی ویکسین تیار نہ کر لی۔

''یہودا'' نے گھریلو ماحول میں سدھائے ہوئے جانوروں سے لگاؤ اور تعلق سے منع نہیں کیا۔ اسی باعث میمونائڈ کی وضاحت کو بالخصوص نقصان پہنچا کیونکہ جانوروں اور انسانوں کے درمیان مرض کے تعلق کا بائبل کے نزول کے وقت بھی علم تھا۔ جیسا کہ تورات میں مذکور ہے۔ ''مصریوں کے خلاف بھیجی گئی ایک وبالِ جان وبا'' اینتھراکس کے مرض کی

تشخیص جانوروں اور انسانوں کے تعلق کو بیان کرتی ہے۔ یہ تعلق اس کی تشخیص میں جانوروں اور انسانوں میں یکسانیت کی بنا پر ہے۔ بیان یوں ہے ...... ''وہ یہ ایک پھوڑا بن گیا جس سے انسان اور جانور پر چھالے پڑنے لگے اور جادوگر حضرت موسیٰؑ کے سامنے ان چھالوں کے باعث نہ ٹھہر سکے کیونکہ ان جادوگروں اور سب مصریوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔''

ان تضادات کے باعث بہت سے یہودی اور مسلمان علما نے سؤر سے نفرت کی عقلی اور فلسفیانہ اساس کی تلاش ترک کر دی ہے۔ اس کی جگہ ایک بے رو رعایت عارفانہ اور صوفیانہ رویے نے لی ہے اور اسے سند قبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور حسن یہ ہے کہ کھانے کی مذہبی ممانعتوں کا انحصار ان وجوہات سے عدم واقفیت پر ہے جو یہودا کی منشا سے مطابقت رکھتی ہوں اور ان کے جواز کو تلاش کرنے کے لیے کوشاں ہونے میں نہیں۔

انسانی تاریخ اور انسان سے متعلق معلومات کے محققین کی جدید تحقیق بھی اسی مشکل اور پیچیدگی کے باعث تعطل کا شکار ہے۔ مثلاً اپنی تمام تر غلطیوں کے باوجود میمونائڈ وضاحت اور جواز کی تلاش میں گولڈن لیف (سنہری شاخ) کی شہرہ آفاق تصنیف کے مصنف فریزر کی نسبت قریب تر تھا۔ فریزر نے یہ اعلان کیا کہ سؤر دوسرے تمام نام نہاد پلید جانوروں کی طرح دراصل مقدس تھے۔ ان کے نہ کھانے کی وجہ ان میں سے اکثر کا اصل میں مقدس ہونا تھا۔ یہ وضاحت کسی لحاظ سے بھی مددگار ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ ایک زمانے میں بھیڑوں، بکریوں اور گائیوں ...... ان سب کی مشرق وسطیٰ میں پرستش کی جاتی تھی اس کے باوجود اس علاقے میں ہر مذہب اور نسل کے لوگ ان کا گوشت بڑی رغبت سے کھاتے ہیں بالخصوص گائے جس کے سنہری بچھڑے کی ''سینائی'' کے قدموں میں پرستش ہوتی تھی۔ فریزر کی منطق کے مطابق اسے تو اصولاً سؤر کے مقابلے میں یہودیوں کے نزدیک زیادہ افضل جانور ہونا چاہیے۔

دوسرے محققین کی رائے ہے کہ سؤر اور دوسرے سب جانور جن کی بائبل اور قرآنِ مجید میں ممانعت کی گئی ہے، کسی زمانے میں مختلف قبیلوں کی مختلف نسلوں اور خاندانوں کی شناخت کے امتیازی نشان ہوتے تھے۔ ممکن ہے کہ تاریخ کے کسی قدیم دور میں ایسا ہی ہو لیکن اگر ہم اس امکان کو تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں ایسے متبرک جانوروں (مثلاً مویشی،

MashalBooks.org

بھیڑیں، بکریاں) کو بھی علامتی امتیازی نشان ماننا ہوگا۔ قبیلوں اور برادریوں کے امتیازی نشان سے متعلق موضوع پر لکھی گئی کئی تحریروں کے برعکس، ایسے امتیازی نشانات بالعموم جانور نہیں ہوتے جو خوراک کا وسیلہ ہونے کے سبب اہمیت رکھتے ہیں۔ آسٹریلیا اور افریقہ کے قدیم قبیلوں کے مقبول ترین امتیازی نشانات میں نسبتاً بے کار پرندے مثلاً ایک پہاڑی نسل کے کوّے اور گانے والی چڑیاں وغیرہ یا حشرات جیسے کاٹنے والی مکھیاں، مچھر، چیونٹیاں وغیرہ۔ بلکہ بے جان اشیاء مثلاً بادل اور پتھر وغیرہ۔ ویسے اگر ایک قیمتی جانور امتیازی نشان ہو بھی سہی تو بھی کوئی ایسا مستحکم دستور نہیں ہے جو اس کے شریک انسانی ساتھیوں کو اس کے کھانے سے منع کرتا ہو۔ کئی متبادل صورتیں دستیاب ہونے کے باوجود یہ کہنا کہ سؤر قبیلوں کی شناخت کا ایک امتیازی نشان تھا، کسی بھی معاملے کی وضاحت نہیں کرتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اعلان کرے کہ ''مذہبی طور پر سؤر کے کھانے کی ممانعت کی گئی تھی کیونکہ یہ ممنوع قرار دیا گیا تھا۔''

میں میمونائیڈ کے نقطۂ نظر کو ترجیح دیتا ہوں۔ کم از کم اس یہودی محقق نے اس ممانعت کو صحت اور تندرستی یا بیماری کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش تو کی، اس ماحول میں جب قطعی طور پر دنیاوی اور عملی قوتیں سرگرم تھیں۔ اس میں واحد مشکل یہ تھی کہ سؤر سے نفرت کے ضمن میں اس کا نقطۂ نظر شرائط کی مناسبت سے صرف جسمانی امراض کی تشخیص کے محدود طبی تعلق پر مبنی تھا۔

سؤر کے اس معاملے کو حل کرنے کے لیے ہمیں صحت عامہ کی ایک زیادہ وسیع تر اور مفصل تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تشریح جس میں وہ طریقے بھی شامل ہوں جو حیوانات، نباتات اور انسان کے ایک ساتھ رہنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ میرے خیال میں بائبل اور قرآنِ مجید میں سؤر کی مذمت اس لئے کی گئی کیونکہ سؤروں کی افزائش، مشرق وسطیٰ کے بنیادی ماحولیاتی نظاموں کی بقا اور سلامتی کے لئے خطرہ تھی۔

ابتدا میں ہمیں اس امر کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ قبل از تاریخ کے یہودی...... حضرت ابراہیم کی اولاد کا طرز تمدن کیا تھا۔ دو ہزار سال قبل مسیح میں یہ لوگ عراق اور مصر کے درمیان پھیلی ہوئی ناہموار، کم اور منتشر آبادی والے خشک علاقے کی دریائی وادیوں میں بستے تھے۔ تیرہ سو سال قبل مسیح میں فلسطین کی وادی اردن کو فتح کر لینے تک یہ لوگ خانہ بدوش گلہ

بان چرواہے تھے جن کی گذر بسر کا تقریباً تمام تر دارومدار بھیڑ بکریاں اور جانور پالنے پر تھا۔ تمام چرواہوں کی طرح، ایک جگہ اقامت پذیر کاشتکاروں سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے جن کے پاس اپنے نخلستان اور دریا تھے۔ وقت کے ساتھ ان تعلقات میں پختگی سے وہ ایک جگہ رہ کر زرعی طرز زندگی اختیار کرنے لگے۔ یوں لگتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے ساتھ عراق میں، حضرت یوسفؑ کے پیروں کاروں کے ساتھ مصر میں اور حضرت اسحٰقؑ کے پیروکاروں کے ساتھ مغرب میں یہی کچھ ہوا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ اور حضرت داوٗدؑ کے عہد حکمرانی میں شہری اور دیہی زندگی کے عروج کے دوران میں بھی بھیڑ بکریوں او رجانوروں کی گلہ بانی ایک نہایت اہم اقتصادی سرگرمی کے طور پر قائم رہی۔

مجموعی طور پر کھیتی باڑی اور گلہ بانی کے مخلوط نظام میں سوٴر کے گوشت کے خلاف مذہبی پابندی اردگرد کے ماحول کے حق میں ایک معقول حکمت عملی تھی۔ خانہ بدوش اسرائیلی اپنے خشک ٹھکانوں اور مسکنوں پر سوٴروں کو پال نہیں سکتے تھے جبکہ دیہاتوں میں عارضی طور پر مقیم یا کھیتی باڑی کرنے والی آبادیوں کے لیے سوٴر اثاثہ ہونے سے زیادہ ان کے لیے نقصان دہ تھے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں خانہ بدوشی کے ذریعہ گلہ بانی کے مناسب علاقے جنگلات سے محروم ایسے میدان اور پہاڑ ہیں جو برسات پر منحصر زراعت کے لئے بھی خشک ہیں اور جن کی آسانی سے نہری آبپاشی بھی ممکن نہیں۔ ان منطقوں کے لئے جگالی کرنے والے جانوروں کو گھروں میں پالنا مقامی ماحول کے مطابق موزوں ترین ہے۔ مثلاً مویشی بھیڑ بکریاں وغیرہ۔ جگالی کرنے والے جانوروں کے جسموں میں ان کے معدوں سے پہلے ایسی تھیلیاں ہوتی ہیں جن کی مدد سے وہ گھاس پتے سبزہ اور دوسری غذائیں جو زیادہ تر سیلولوز پر مشتمل ہوتی ہیں دوسرے ایسے جانوروں کی نسبت زیادہ آسانی سے ہضم کر سکتی ہیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پالتے ہیں۔

سوٴر اصل میں جنگلات او ردریاؤں کے سایہ دار کناروں کی مخلوق ہے گو کہ یہ گوشت اور نباتات سمیت ہر شے کھا سکتا ہے لیکن اس کا وزن بڑھانے کے لئے ''سیلولوز'' کی کم مقدار والی غذا گری دار میوہ پھل اور بالخصوص اجناس درکار ہیں۔ یوں خوراک کے سلسلے میں یہ انسان کے براہ راست مدمقابل ہے۔ یہ صرف گھاس کے سہارے زندہ نہیں رہ

سکتا اور دنیا بھر میں کہیں بھی خانہ بدوش چرواہے سؤروں کی قابلِ ذکر تعداد کا ریوڑ نہیں پالتے۔ سؤر میں اور بڑے نقائص یہ ہیں کہ ایک تو یہ دودھ حاصل کرنے کا عملی ذریعہ نہیں۔ دوسرا طویل فاصلے طے کرنے میں ان کے ریوڑ بے پناہ مشکلات کا سبب بنتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ گرمی برداشت کرنے کے لحاظ سے سؤر گرم اور خشک آب وہوا والے علاقوں ''نیجو لبنان'' وادی جورڈن اور اسی طرح بائبل اور قرآن کی سرزمین کے دوسرے ممالک کے لئے ناسازگار ہے۔ بھیڑ بکریوں اور دوسرے جانوروں کے مقابلے میں سؤر کے بدن کے درجہ حرارت کو باقاعدہ بنانے کے نظام کی اہلیت کم ہے۔ سؤر کی طرح پسینے میں شرابور ہونا'' کی کہاوت کے باوجود حال ہی میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ سؤروں کو پسینہ بالکل نہیں آتا، جیسے انسان کو دودھ دینے والی مخلوقات میں سب سے زیادہ پسینہ آتا ہے۔ اپنے جسم کی سطح کے ہر مربع میٹر سے ایک ہزار گرام فی گھنٹہ کے حساب سے خارج ہونے والے پسینہ کا عمل تبخیر جسم کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سؤر کے پسینے کا اخراج زیادہ سے زیادہ 30 گرام فی مربع میٹر ہوسکتا ہے اور رتو اور ایک بھیڑ بھی سؤر کے مقابلے میں اپنے جسم سے پسینے کا دوگنا اخراج کرتی ہے اور اسی حساب سے عمل تبخیر ہوتا ہے۔ بھیڑوں کو اپنی موتی اور سفید اون کا بھی دہرا فائدہ ہے کہ وہ سورج کی شعاؤں کو منعکس کرتی ہے اور جب فضا کا درجہ حرارت اس کے جسمانی درجہ حرارت سے زیادہ ہوتا ہے تو وہ اس کی شدت تمازت سے محفوظ رہتی ہے۔ انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی کی حیوانی عضویات سے زرعی تحقیقاتی کونسل سے منسلک ایل ای ماؤنٹ کے مطابق بالغ سؤر اگر سورج کی روشنی کا براہ راست سامنا کریں اور فضا کا درجہ حرارت 98 فارن ہیٹ سے زیادہ ہوتو وہ مرجائیں گے۔ وادی اردن کا درجہ حرارت تقریباً ہر موسم گرما میں 110 فارن ہیٹ اور اسی طرح سورج کی روشنی انتہائی تیز ہوتی ہے۔

سؤر اپنے جسم پر حفاظتی بالوں کی کمی اور پسینہ آنے کی نااہلی کا مداوا کرنے کے لیے اپنی جسم کی کھال کو بیرونی رطوبت سے ضرور گیلا کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ تازہ اور صاف ستھرے کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اگر اور کچھ میسر نہ ہوتو پھر وہ اپنے بول و براز سے ہی اپنی کھال کو ڈھانپ لیتا ہے۔ 84 فارن ہیٹ سے کم درجہ حرارت میں گھریلو احاطوں کے اندر رکھے گئے پالتو سؤر اپنا فضلہ اپنے سونے اور کھانے کی جگہ سے

پرے الگ جگہ کرتے ہیں جبکہ 84 درجے سے زائد درجہ حرارت ہونے کی صورت میں وہ بغیر کسی تمیز کے پورے ڈربے میں فضلے کا اخراج شروع کر دیتے ہیں۔ جتنا درجہ حرارت بڑھے گا۔ وہ اتنے ہی غلیظ تر ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ اس نظریے میں صداقت موجود ہے کہ مذہبی لحاظ سے سؤر کی نجاست دراصل اس کی جسمانی طور پر گندگی اور غلاظت پر منحصر ہے صرف سؤر میں یہ خاصیت نہیں کہ وہ ہر جگہ پر غلیظ اور گندا رہتا ہے بلکہ یہ خصوصیات مشرق وسطیٰ کے گرم اور خشک علاقوں کے ٹھکانے کی ہیں جو سؤروں کو اپنے ہی بول و براز کے ذریعے ٹھنڈک کے اثر کا زیادہ سے زیادہ محتاج بناتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کے گھروں میں سب سے پہلے پالے جانے والے جانور، بھیڑ بکریاں تھیں اور ممکنہ طور پر یہ 9000 سال قبل مسیح کا دور تھا۔ سؤروں کے اس علاقے میں گھریلو پالتو جانور بننے کی ابتدا تقریباً 2000 سال بعد از تاریخ کی ان جگہوں میں جہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی، ماہرین آثار قدیمہ نے ''ہڈی شماریاں'' کیں تو پتہ چلا کہ گھروں میں پالے جانے والے سؤروں کی تعداد مقابلتاً تقریباً ہر دور میں اس عہد کے دوسرے جانوروں سے کم تر تھی جو خوراک کے لئے کام آنے والے جانوروں کی بچی کھچی ہڈیوں کا بمشکل 5 فیصد تھی۔ ایک ایسی مخلوق سے جسے سائے کی ضرورت ہو، کیچڑ کی ضرورت ہو، اس سے دودھ بھی حاصل نہ کیا جاسکتا ہو اور اسے خوراک بھی وہی درکار ہو جو انسان کھاتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

جیسا کہ میں نے ہندوؤں میں گائے کے گوشت کھانے کی ممانعت کے سلسلے میں بتایا تھا کہ صنعتی فروغ سے پہلے کے ماحول میں، کسی بھی جانور کو خاص طور پر گوشت کے لیے پالنا ایک عیاشی ہے۔ اس عام اصول کا اطلاق، صنعتی پسماندگی کے شکار گلہ بان چراوہوں پر بھی ہوتا ہے جو اپنے مویشیوں کے ریوڑوں کو خصوصی طور پر گوشت کے لیے شاذ ہی استعمال کرتے ہیں۔

قدیم زمانے میں مشرق وسطیٰ کی کسانوں اور چرواہوں پر مشتمل مخلوط آبادی میں گھریلو جانوروں کی قدرو قیمت، دودھ اور پنیر، کھالوں کے چمڑے، گوبر اور نسوں کے ریشوں کا ذریعہ ہونے اور ہلوں کو کھینچنے کے باعث ہوتی تھی۔ بھیڑ بکریوں اور مال مویشی سے ان چیزوں کی بکثرت مقدار حاصل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار زائد فائدہ کمزور

گوشت کا بھی تھا۔ چنانچہ شروع ہی سے سؤر کا گوشت رسلا، نرم اور چکنا ہونے کی خاصیتوں کے باعث قدر قیمت پر تکلف غذا سمجھا جاتا تھا۔

7000 قبل مسیح اور 2000 قبل مسیح کے درمیانی عرصے سؤر کا گوشت مزید پر تعیش خوراک بن گیا۔ اس عرصے کے دوران میں مشرق وسطیٰ کی آبادی میں 60 گنا اضافہ ہوا، آبادی میں اضافے کے ساتھ ہی جنگلات کی بھی بے تحاشا ہی ہوئی۔ خصوصاً اس مستقل نقصان کی وجہ سے جو بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑوں سے پہنچا۔ سائے اور پانی کی کمیابی جو سؤروں کی افزائش اور پرورش کے لئے موزوں قدرتی شرائط ہیں، وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں۔ یوں سؤر کا گوشت ماحولیاتی اور اقتصادی لحاظ سے پہلے کی نسبت زیادہ عیاشی بن گیا۔

گائے کا گوشت کھانے کی مذہبی ممانعت کی طرح ''جتنی ترغیب بڑھتی ہے خدائی امتناعی احکامات کی سختی اتنی زیادہ ہوتی ہے''، اس اصول کو عام طور پر مناسب تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے دیوتاؤں کی طرف سے جنسی تحریص (مثلاً زنا اور بدکاری وغیرہ کی) مخالفت اور انسداد میں ہمیشہ دلچسپی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کا اطلاق میں صرف تحریص آمیز غذا پر کرتا ہوں۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ سؤروں کو پالنے کے لئے ناموزوں مقام ہے لیکن سؤر کا گوشت ایک خوش ذائقہ ضیافت ہے۔ لوگ عام طور پر اپنی مرضی یا ارادے سے ایسی ترغیبوں پر قابو نہیں پا سکتے اس لئے ''یہودا'' (یہودیوں کے خدا) کا پیغام تھا کہ سؤر نہ صرف بطور غذا ناپاک ہے بلکہ چھونے میں بھی نجس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس پیغام کو اسی وجہ سے دہرایا۔ ماحولیات کے نقطۂ نظر سے سؤروں کو بڑی تعداد میں پالنا غیر موزوں ہے اور چھوٹے پیمانے پر ان کی پرورش سے ترغیب اور تحریص میں اضافہ ہوگا اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کے استعمال سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے اور اس کے بجائے توجہ بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کی پرورش پر مرکوز کی جائے۔ سؤر ذائقے میں مزیدار سہی لیکن اس کی خوراک اور پھر اسے ٹھنڈک میں رکھنا مہنگا سودا ہے۔

ابھی کئی سوال باقی ہیں۔ بالخصوص یہ کہ بائبل میں ممنوع قرار دی گئی باقی مخلوقات مثلاً گدھ، باز، شکرہ، سانپ گھونگے، پترا مچھلی وغیرہ ایسی ہی ممانعت کی زد میں کیوں آئیں اور وہ یہودی اور مسلمان بھی جو اب مشرق وسطیٰ میں نہیں رہتے کم و بیش اسی قطعیت اور

جذبے سے قدیم غذائی نظام کی ممنوعات پر عمل پیرا ہیں۔ عام طور پر مجھے یوں لگتا ہے کہ اکثر ممنوعہ جانور اور پرندے دراصل دو میں سے کسی ایک زمرے میں شامل ہیں۔ ایک قسم مثلاً مچھلی خور شکرے، گدھ اور باز تو استعداد کے لحاظ سے غذا کے کوئی اہم ذریعے نہیں، دوسری قسم مثلاً گھونگے، پتڑا مچھلی وغیرہ، ظاہر ہے کہ زراعت اور گلہ بانی کی ملی جلی آبادی میں دستیاب ہی نہیں ہوتی۔ ممنوعہ مخلوقات کی ان دونوں قسموں میں سے کسی کے متعلق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا جس کا میں نے جواب دینا ہے کہ بظاہر انوکھی اور فضول خرچی پر مبنی مذہبی ممانعت کا کیا جواز ہے۔ صاف سی بات ہے کہ کھانے کے لئے گدھوں کا پیچھا کر کے یالق ودق ویران ریگستانوں میں پچاس میل کا مشکل سفر طے کر کچھوے یا گھونگھے کے نیم وا (آدھ کھلے) کھوپڑیوں کے سخت پردوں میں سے ایک پلیٹ کے برابر گوشت کی تلاش میں وقت ضائع نہ کرنا کوئی غیر منطقی بات نہیں۔

یہ مناسب لمحہ ہے جب میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کروں کہ مذہبی لحاظ سے جائز، سب غذائی معمولات کی ماحولیاتی مناسبت سے تائیدی وضاحتیں موجود ہیں۔ ان مذہبی امتناعات کے سماجی پہلو بھی ہیں۔ مثلاً بھی ہیں۔ مثلاً لوگوں میں اپنے متعلق اس شعور کو اجاگر کرنے میں مدد دینا کہ وہ ایک امتیازی شان کا حامل طبقہ ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل مشرق وسطیٰ کے اپنے آبائی وطنوں سے دور رہنے والے مسلمانوں اور یہودیوں کی طرف سے غذائی قواعد پر جدید طریقوں سے عمل پیرا ہو کر بطریق احسن ہوتی ہے۔ ان معمولات کے بارے میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس طرح یہودیوں اور مسلمانو کو غذائیت کے ایسے اجزا سے محروم رکھ کے نعم البدل فوری طور پر دستیاب نہیں ان کی عملی اور دنیاوی فلاح کو قابل ذکر حد تک گھٹایا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔ لیکن اب مجھے اجازت دیں کہ میں ایک اور قسم کی ترغیب کی مزاحمت کروں ...... اور وہ ترغیب ہے ہر بات کی وضاحت کی ترغیب۔ میرا خیال ہے کہ سؤر سے متنفر لوگوں سے متعلق اور بہت کچھ معلوم ہوگا اگر ہم معمّے کے دوسرے فریق یعنی سؤر کے چاہنے والوں کی طرف متوجہ ہوں۔

ایک طرف مسلمانوں اور یہودیوں میں مذہبی جذبات کے تحت سؤر کے خلاف نفرت آمیز حقارت کے انبار ہیں تو دوسری طرف اس کے عین الٹ سؤر سے انس و محبت رکھنے کے احساسات بھی ان کے گہرے جوش وخروش اور جذبات کے عکاس ہیں۔ یہ جوش و

MashalBooks.org

جذبہ محض اس کے گوشت کی لذت اور چاشنی کی بنا پر نہیں بلکہ باورچی خانے سے وابستہ پوری امریکی اور چینی روایات کے مطابق سؤر کے گوشت کا اور چربی کی بڑی قدروقیمت ہے۔ سؤر سے پیار اور چیز ہے لیکن یہ تو انسان اور سؤر کے درمیان مکمل یک جہتی، یگانگت اور ایک دوسرے کے ساتھ ربط اور میل جول کی کیفیت ہے۔ جہاں سؤر کی موجودگی مسلمانوں اور یہودیوں کے نزدیک انسان کی عظمت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہے وہاں سؤر کے دلدادہ لوگوں کے لئے، کوئی بھی شخص سؤر کی صحبت کے بغیر انسان نہیں بن سکتا۔

سؤر سے پیار اور محبت میں، گھر کے ایک فرد کی طرح اس کی پرورش کرنا، اپنے قرب میں اس کو سلانا، اس سے باتیں کرنا، اسے تھپتھپانا اور چمکارنا، اسے اس کے نام سے پکارنا، گلے میں ڈوری ڈال کر کھیتوں میں ساتھ لے جانا، اس کے بیمار یا زخمی ہو جانے کی صورت میں رونا، اپنی کھانے کی میز سے پسندیدہ کھانوں کے لقمے کھلانا بھی شامل ہے۔ لیکن ہندوؤں کی گائے سے محبت کے برعکس سؤروں کی محبت میں ضروری صورتوں میں ان کی قربانی اور خاص موقعوں پر ان کا گوشت کھانا بھی شامل ہے۔ رسمی اور مذہبی دستور کے تحت سؤر کا کاٹنا اور تقدیس کی حامل دعوتوں میں اس کے استعمال سے سؤر سے انسان کی محبت کو جلا ملتی ہے۔ انسان اور اس کے درمیان تعلق میں پیش بینی اس سے کہیں وسیع تر ہے جو ایک ہندو کسان اور گائے کے باہمی تعلق میں ہے۔ سؤر سے محبت کا درجہ کمال سؤر کے گوشت کو میزبان کے انسانی گوشت پوست اور سؤر کی روح کو اپنے باپ دادا کی روح میں حلول کرنا ہے۔

سؤر کی محبت سے آپ کے متوفی والد کی توقیر اور عزت افزائی ہوتی ہے۔ اگر آپ اس کی قبر والی جگہ پر اپنی پیاری مادہ سؤر (سؤرنی) پر لاٹھیاں برسا کر اسے ہلاک کر دیں اور اسے اسی جگہ کھودے ہوئے تنور میں بھونیں۔ مٹھی میں بند ٹھنڈی اور نمکین سؤر کی چربی کو اپنے بہنوئی کے منہ میں ٹھونسنا بھی سؤر سے محبت میں شامل ہے اور بہنوئی بھی وفادار اور خوش رہتا ہے۔ سؤر سے محبت کی سب سے نمایاں صورت ایک نسل میں ایک یا دو بار منعقد کی جانے والی وہ عظیم الشان دعوت ہوتی ہے جس میں تقریباً تمام بالغ سؤروں کو کاٹ کر انہیں پیٹ بھر کر کھایا جاتا ہے۔ اس بسیار خوری کا مقصد اپنے آباو اجداد کی سؤر کے گوشت کی طلب پوری کرنا، عوام کی تندرستی اور صحت مندی کو یقینی بنانا اور مستقبل میں ہونے

والی جنگوں میں فتح حاصل کرنا ہوتا ہے۔

مشی گن یونیورسٹی کے پروفیسر ''ریپورٹ'' نے سؤر اور سؤر کی محبت سے سرشار نیوگنی کے بسمارک پہاڑی سلسلے میں آبادی مارنگ نام سے موسوم قبائلیوں کے گروہوں کے درمیان باہمی تعلق سے متعلق جو ایک تفصیلی تحقیق کی ہے۔ ''پگز فار اینسیسٹرز'' نامی اپنی کتاب میں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ سؤر کی محبت کس طرح بنیادی انسانی مسائل کے حل میں مددگار ہوتی ہے۔ مارنگ قبیلے کے مخصوص حالات زندگی میں زندہ رہنے کے لیے مختلف متبادل صورتیں نہیں ہیں۔

مارنگ قبیلے کی ہر ذیلی شاخ، گروہ یا خاندان، اوسطاً تقریباً بارہ سال کے عرصے کے دوران میں ایک دفعہ سؤروں کا ایک میلہ منعقد کرتا ہے۔ یہ تہوار اپنی مختلف تیاریوں، چھوٹے پیمانوں کی قربانیوں اور آخر میں بہت بھاری قربانی سمیت تقریباً ایک سال کے عرصے تک جاری رہتا ہے۔ مارنگ زبان میں اسے ''کائیکو'' کہا جاتا ہے۔ اپنے اس تہوار کے مکمل طور پر ختم ہونے کے فوراً بعد اگلے دو تین ماہ میں یہ قبیلہ اپنے دشمن قبیلوں کے ساتھ جنگ میں الجھ جاتا ہے جس کا نتیجہ جانی نقصان اور آخرکار انجام اپنے زیر قبضہ ملکیتی علاقے میں اضافہ یا کمی ہوتا ہے۔ لڑائی کے دوران میں مزید سؤر قربان کئے جاتے ہیں اور فاتح ہو یا مفتوح دونوں کو جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بالغ سؤروں سے پوری طرح محروم ہو چکے ہیں۔ جن کی وجہ اور مدد سے وہ اپنے اپنے آباو اجداد کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ یوں لڑائی اچانک بند ہو جاتی ہے اور جنگ جو اپنے مقدس مقامات کی مرمت میں لگ جاتے ہیں تاکہ وہاں چھوٹے درخت جنہیں ''رم بم'' کہتے ہیں، کاشت کئے جائیں۔ قبیلے کا ہر بالغ مرد اس مذہبی رسم میں شریک ہوتا ہے۔ یہ شرکت ''رم بم'' کے پودے پر، جب وہ زمین میں رکھا جاتا ہے، ہاتھ رکھ کر پوری ہوتی ہے۔

جنگی شعبدہ باز اسلاف (کی روحوں) کو خطاب کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ ان کو سؤروں کی نایابی کا سامنا ہے اور وہ شکر کرتے ہیں کہ وہ زندہ بچ گئے ہیں۔ وہ اپنے آباو اجداد کو یقین دہانی کراتا ہے کہ جنگ اب ختم ہو چکی ہے اور عداوت کا دوبارہ آغاز اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک ''رم بم'' کا پودا زمین میں رہے گا۔ چنانچہ آئندہ سب لوگوں کی توجہ اور کوشش سؤر پالنے کے لئے وقف ہوں گی۔ جب سؤروں کا اتنا بڑا غول

رتیار ہو جائے گا جو ایک زبردست ''کائیکو'' کے تہوار میلے کے لیے کافی ہو، تا کہ اپنے موروثی بزرگوں سے مناسب طور پر اظہار تشکر کیا جا سکے صرف تب ہی ''جنگ جو'' رم بم کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے اور میدان جنگ میں واپس لوٹ جانے کا سوچیں گے۔

''سمباگا'' نامی ایک قبیلے پر تفصیلی تحقیق کے نتیجے میں ''ریپورٹ'' نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ سارا چکر...... جس میں کائیکو کا تہوار، اس کے بعد جنگ، رم بم کے پودوں کی کھیتی، جنگ بندی، سؤروں کے نئے ریوڑوں کی افزائش، رم بم کے پودوں کو پھر جڑوں سے اکھاڑنا اور پھر کائیکو کا نیا تہوار ...... یہ سب سؤر پالنے والے اجڈ اور جنگلی دیوانوں کا محض نفسیاتی یا جذباتی ڈرامہ نہیں بلکہ اس پورے چکر کا ہر حصہ، ایک مختلف لالاجزاً مرکب میں، اپنی اپنی جگہ پر صحیح و سالم صورت میں ادغام ہے جو اس ماحولیاتی نظام میں خود بخود باقاعدگی لاتا ہے جس سے ''سمباگا'' قبیلے کی انسانی اور حیوانی آبادی کے سائز (مقدار) اور تقسیم میں مطابقت پیدا ہوتی ہے ...... ایسی مطابقت جو دستیاب وسائل اور پیداواری گنجائش سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

مارنگ قبائل میں پائی جانے والی سؤر سے محبت کے ضمن میں ایک مرکزی نوعیت کا سوال یہ ہے: لوگ کیوں کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنے متوفی بزرگوں کا مناسب طریقے سے شکرگزار ہونے کے لیے ان کے پاس سؤروں کی کافی تعداد موجود ہے؟ مارنگ خود یہ بتانے سے قاصر تھے کہ ''کائیکو'' کو مناسب طور پر منانے کے لیے کتنے سالوں پر محیط درمیانہ عرصہ گزرے یا سؤروں کی کتنی تعداد درکار ہوتی ہے۔ جانوروں کی کسی معینہ تعداد یا درمیانی عرصے سے متعلق اتفاق رائے کا امکان حقیقی معنوں میں خارج از بحث ہے کیونکہ ''مارنگ'' قبائل کا کوئی کیلنڈر نہیں اور ان کی زبان میں تین (3) سے اوپر کے ہندسوں کے لئے الفاظ بھی نہیں۔

1963ء کے ہونے والے ''کائیکو'' میلے میں جو ''ریپورٹ'' نے دیکھا، 169 سؤر اور ''سمباگا'' قبیلے کے تقریباً 200 افراد شریک تھے۔ اس چکر کے دورانیے اور طوالت کا دارومدار، آبادی کے روزمرہ معمولات کے تعلق سے، ان اعدادوشمار کی اوسط سے ہے۔

سؤروں کی پرورش اور اس کے ساتھ یہاں کی نباتاتی پیداوار (یامز، ٹارد اور سویٹ پوٹیٹو) (ان تینوں قسم کے پودوں کی جڑیں کھانے کے کام آتی ہیں) کی کاشت کا

MashalBooks.org

انحصار بنیادی طور پر ''مارنگ'' خواتین کی محنت پر ہے۔ سؤر کے چھوٹے بچوں کو بھی وہ اپنے شیر خوار چھوٹے بچوں کے ساتھ اٹھا کر باغات میں لے جاتی ہیں۔ جب ان کا دودھ چھڑا لیا جاتا ہے تو ان کی مالکہ انہیں کتے کی طرح اپنے ساتھ پیچھے پیچھے چلنا سکھاتی ہے۔ چار پانچ ماہ کی عمر میں سؤروں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ جنگل میں ادھر ادھر سے اپنی خوراک خود تلاش کریں اور کھائیں، جب تک شام کو ان کی بچی کچھی خوراک کھانے کی دی جاتی ہے۔ ہر خاتون کے سؤروں کی عمریں بڑھنے اور ان کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ انہیں شام کا کھانا مہیا کرنے کے لئے اسے زیادہ محبت کرنی پڑتی ہے۔

''رپپورٹ'' نے دیکھا کہ ''رم بم'' کے پودے ابھی زمین ہی میں تھے کہ ''سمباگا'' خواتین جتنی جلد ممکن ہو اپنے باغات کے سائز بڑھانے، مزید نباتاتی غذائی پودوں کی کاشت کرنے اور سؤروں کی تعداد بڑھانے کے سلسلے میں کافی دباؤ میں تھیں تاکہ اگلا کائیکو میلہ منعقد کرنے کے لیے کافی سؤر موجود ہوں۔ پیشتر اس کے کہ دشمن ایسا کرے، پختہ عمر کے سؤر کا وزن 135 پونڈ ہوتا ہے۔ یہ ایک اوسط درجے کے بالغ ''مارنگ'' سے زیادہ بھاری ہوتے ہیں اور دن کو ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنے لئے چارہ تلاش کرتے اور کھاتے ہیں۔ پھر بھی خاتون خانہ کو ان کی شام کی خوراک کے لیے اتنی ہی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے جتنی ایک بالغ انسان کے لیے درکار ہوتی ہے۔ 1969ء میں ''رم بم'' کو جڑوں سے اکھاڑتے وقت، زیادہ پرعزم ''سمباگا'' خواتین 135 پونڈ وزنی چھ (6) سؤروں کے مساوی الحجم تعداد میں بچوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے علاوہ، اپنے کنبے کے لئے کاشتکاری، کھانا پکانا، بچوں کی پرورش، تیمارداری، دیکھ بھال اور ان سے پیار، شیر خوار بچوں کو اٹھائے پھرنا اور گھریلو سامان مثلاً جالی کے تھیلے کمر بند اور جانگیوں وغیرہ کی تیاری بھی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ''رپپورٹ'' نے حساب لگایا ہے کہ صرف 6 سؤروں کی پرورش رپورٹ پر ایک صحت مند اور اچھی خوراک کھانے والی ''مارنگ'' خاتون کی جتنی توانائی خرچ ہوتی ہے۔ وہ اس کی کل توانائی کی روزانہ صلاحیت کا 50 فیصد حصہ ہے۔

سؤروں کی آبادی میں اضافے کے ساتھ عام طور پر انسانی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بالخصوص ان برادریوں میں جو پچھلی جنگ میں فاتح رہے ہوں۔ سؤروں اور انسانوں کی خوراک کا لازمی ذریعہ وہ باغات ہیں جو بے ترتیبی سے کاٹے اور جلائے جاتے

ہیں۔ یہ باغات بسمارک کے پہاڑی سلسلے کی ڈھلوانوں پر واقع وسیع وعریض جنگلوں کا حصہ ہیں۔

اس خطے کے دوسرے علاقوں میں واقع باغبانی کے ایسے ہی نظاموں کی مانند مارنگ کے باغات کی زرخیزی کا دارومدار اس نائٹروجن پر ہے جو درختوں کے جلنے سے ان کی راکھ میں شامل ہوتی ہے اور زمین کی مٹی میں ملتی ہے۔ یہ باغات ختم ہو جائیں تو موسلا دھار بارشیں نائٹروجن اور زمین کی زرخیزی کے دوسرے اجزاء کو دھو ڈالتی ہیں۔ اس کا واحد حل ایک اور جگہ کو منتخب کرنا اور جنگل کے ایک اور حصے کو جلانا ہے۔ ایک عشرے یا تقریباً اتنے ہی سالوں کے بعد پرانے باغات میں ایک دفعہ پھر بالیدگی اور ہریالی آتی ہے، اس طرح کہ انہیں دوبارہ جلایا اور ان میں دوبارہ پودے لگائے جا سکتے ہیں۔ باغات کی ان پرانی جگہوں کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ نئے جنگلات کی نسبت ان کو صاف کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن ''رم بم'' کی جنگ بندی کے دوران جگہ کی بحالی کم پڑنے لگتی ہے۔ جنگلات والی نئی جگہوں پر باغات پھر لگانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ غیر استعمال شدہ جنگلات والا علاقہ بکثرت دستیاب ہوتا ہے لیکن باغ لگانے کی نئی جگہ ہر فرد پر زائد بوجھ بنتی ہے اور ''مارنگ'' خود کو اور سؤروں کو خوراک مہیا کرنے کے لیے جو محنت مزدوری کرتے ہیں، معاوضے کی صورت میں انہیں اس سے کم تر وصول ہوتا ہے۔

مزدوروں کا کام نئے باغات کو صاف کرنا اور جلانا ہوتا ہے اور انہیں اس وجہ سے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے کیونکہ پہلے استعمال میں نہ آنے والے درختوں کی اونچائی اور موٹائی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن عورتوں کو کہیں زیادہ تکلیف جھیلنا پڑتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ نئے باغات دیہات کے مرکز سے زیادہ فاصلے پر ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ عورتوں کو اپنے کنبے اور سؤروں کو پالنے کے لیے زیادہ بڑے باغات لگانا ضروری ہیں بلکہ انہیں وقت کا زیادہ تر حصہ کام پر آنے جانے میں صرف کرنا پڑتا ہے اور اپنی توانائی کا بڑا حصہ بھی سؤر کے اور اپنے چھوٹے بچوں کو باغ تک اور پھر وہاں سے واپس اپنے گھروں تک کاشت شدہ ''یامز'' اور ''شکر قندی'' کے بھاری وزنوں سمیت، گھسیٹنے اور کھینچنے میں خرچ کرنا ہوتا ہے۔

ایک مزید پریشانی ان کوششوں میں اضافہ کے باعث ہوتی ہے جو باغات کو بالغ عمر کے سؤروں کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے کرنا پڑتی ہے، ایسے سؤروں سے جنہیں گھوم

MashalBooks.org

پھر کر کھانے پینے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے ہر باغ کے گرد ایک مضبوط باڑ ہونی چاہیے جو سؤروں کے اندر داخل ہونے میں رکاوٹ ہو'' تاہم 150 پونڈ وزنی بھوکی سؤرنی ایک خوفناک حریف ہے۔ اگر سؤروں کا ریوڑ بڑا ہوتا باڑوں میں شگاف پڑنے اور باغات پر حملوں کے واقعات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی غصیلے باغبان کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ حملہ آور سؤر کو مارڈالتا ہے۔ ایسے نااتفاقی پر مبنی واقعات ہمسایوں کی آپس میں کشیدگی اور ناراضی کے احساسات کا موجب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ''ریپورٹ'' کہتا ہے کہ سؤروں کی وجہ سے پیدا ہونے والی کشیدگی کے واقعات میں اضافے سؤروں کی تعداد میں اضافوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔

ایسے ناخوشگوار واقعات کی روک تھام اور اپنے باغات کی حفاظت کے مدنظر ''مارنگ'' اپنے گھروں کو ایک دوسرے سے دور، وسیع علاقے تک پھیلی ہوئی الگ جگہوں پر لے جاتے ہیں اور کافی وسیع وعریض علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اس پھیلاؤ کے باعث نئی دشمنیوں کی صورت میں کسی گروہ کا تحفظ کم تر ہو جاتا ہے۔ یوں ہر شخص اعصابی پریشانی کا زیادہ شکار نظر آتا ہے۔ عورتیں اپنے کام کی زیادہ سے متعلق شکایت کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے خاوندوں سے بات بات پر جھگڑتی اور بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔ جلد ہی مرد سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ شائد سؤر کافی جمع ہو گئے ہیں، وہ ''رم بم'' کو دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہ قد میں کتنا اونچا نکل آیا ہے۔ عورتیں زیادہ بلند آواز میں شکایت کرتی ہیں اور آخر کار مرد، کافی حد تک اتفاق رائے سے اور سؤروں کو گنے بغیر فیصلہ کرتے ہیں کہ ''کائیکو'' شروع کرنے کا لمحہ آن پہنچا ہے۔

1963ء کے ''کائیکو'' سال کے دوران میں ''سمباگا'' قبیلے نے اپنے سؤروں کا تعداد کے حساب سے 3/4 حصہ اور وزن کے حساب سے 7/8 حصہ کاٹ ڈالا۔ ان کے گوشت کا زیادہ تر حصہ اپنے رشتہ داروں اور عسکری اتحادیوں میں بانٹ دیا جنہیں سال بھر کی پرمسرت تقریبات میں شمولیت کی بطور خاص دعوت دی گئی تھی۔ 7 اور 8 نومبر 1963ء کو ہونے والی موسمی رسومات میں 96 سؤروں کو کاٹا گیا اور ان کا گوشت اور چربی براہ راست یا بالواسطہ طور پر انداز 2000 سے 3000 لوگوں میں تقسیم کی گئی۔ سمباگا نے تقریباً 2500 پونڈ سؤر کا گوشت اور چربی ہر مرد عورت اور بچے کے لئے 12 پونڈ فی کس کے

MashalBooks.org

حساب سے رکھ لی۔ انہوں نے اس مقدار کو متواتر سات دنوں تک بلا روک ٹوک بسیار خوری میں استعمال کیا۔

''مارنگ'' جان بوجھ کر ''کائیکو'' کو ایک موقع سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اپنے اتحادیوں کا، ان کی طرف سے ماضی میں دی گئی مدد کے احسان کا بدلہ چکاتے ہیں اور مستقبل کے تحت ''کائیکو'' کی دعوت قبول کرتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ آیا واقعی ان کے میزبان اتنے خوش حال اور طاقتور ہیں کہ مستقل حمایت کے اہل ہیں بلاشبہ ان اتحادیوں کو سؤر کے گوشت کا لالچ بھی ہوتا ہے۔

مہمانوں کی سج دھج بھی قابل دید ہوتی ہے۔ وہ موتیوں اور پیسوں والی نیکلیس گلے میں ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنگرو کے چمڑے کے موزہ بند، کمر پر مدھم گلابی رنگ کی پیٹیاں، شوخ سرخ رنگ کے جانگئے، جو دھاری دار ہوتے اور جن پر باجے کی شکل کے پتے ہوتے ہیں اور جانگئے کے اوپر ان کے کولہوں پر کھل جانے والے پیڈ، جن سے لباس کو اتارا جا سکتا ہے، سروں پر عقاب اور طوطے کے پروں سے بنائے ہوئے تاج کے اوپر روئی یا بھوسے بھرے ہوئے بہشتی پرندوں کے پتلے، ہر شخص نے اپنے چہرے کو خوش نما بنانے کے لئے پہروں صرف کئے ہیں تاکہ اپنی شکل کو کسی نہ کسی اصلی ڈیزائن میں ڈھال سکے۔ اس بانکپن اور بہشتی پرندے والی امتیازی کلغی سے آراستہ لباس میں ہلالی شکل کی سیپیاں ہوتی ہیں جن کے ہونٹ سنہری ہوتے ہیں۔ مہمان اور میزبان اپنا زیادہ وقت اپنی نمود و نمائش میں صرف کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے خصوصی طور پر تیار کئے گئے ڈانس کے میدان میں ناچتے ہیں۔ ان کا مقصد دیکھنے والی خواتین کے عاشقانہ تعلق اور مرد جنگجوؤں سے فوجی اتحاد کی راہ ہموار کرنا ہوتا ہے۔

''سمباگا کے ڈانس کے گراؤنڈ میں ایک ہزار سے زائد لوگوں کا مجمع تھا'' رپورٹ نے 1963ء میں لکھا ''یہ مجمع سؤروں کے بڑے پیمانے پر کٹائی کے بعد کی رسومات میں حصہ لینے کے لیے جمع ہوا تھا۔ سؤر کی نمکین چربی کے پیکٹوں کی اونچی اونچی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں جو ایک تکون نما تقریباتی عمارت کی کھڑکیوں کے پیچھے رکھی تھیں۔ رپورٹ بیان کرتا ہے کہ بہت سے لوگ عمارت کی چوٹی پر چڑھ گئے اور وہاں سے ایک ایک نے باری باری ہجوم کے سامنے ان لوگوں اور قبیلوں کا اعلان کیا جنہیں عزت اور

فضیلت دی جارہی تھی۔ جیسے ہی کسی اعزاز پانے والے کا نام پکارا جاتا وہ اپنی لٹھ کولہراتا اور نعرے لگاتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھتا۔ اس کے حمایتی جنگی نعروں سے چیختے چلاتے، ڈھول بجاتے، ہتھیاروں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ کھڑکی کے قریب پہنچنے پر "سمباگا" اس اعزاز یافتہ شخص کے منہ میں ٹھنڈی نمکین چربی ٹھونس دیتا، جس کی مدد کے لیے وہ پچھلی جنگ کے دوران میں آیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کے پیروکاروں اور ساتھیوں کے لیے نمکین چربی سے بھرا ہوا تھیلا بھی اس کے حوالے کرتا۔ چربی کو منہ میں لٹکائے وہ مرد غازی واپس لوٹتا اور اس کے ساتھی اس کے ساتھ ہی نعرے لگاتے، گاتے، اپنے ڈھول بجاتے اور اور ناچتے، اس کے پیچھے ہوتے۔ ایک کے بعد دوسرے اعزاز پانے والوں کے نام جلدی جلدی پکارے جاتے اور کبھی کبھی کھڑکی کی طرف جانے والے اور وہاں سے واپس آنے والے گروہ ایک دوسرے میں پھنس بھی جاتے۔

بنیادی فنی نزاکتوں اور اختراعات اور دوسری طرف ماحولیاتی حالات کے جبر میں جکڑی "مارنگ" قوم کے پاس ان سب باتوں کی وضاحت اور جواز موجود ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ سؤر کے گوشت کی طلب "مارنگ" کی زندگی کا ایک پوری طرح جائز پہلو ہے۔ اس کی وجہ ان کی خوراک میں عام طور پر گوشت کی کمی ہے۔ گو وہ اپنی اصلی اور اہم ترین غذا جو سبزیوں پر مشتمل ہوتی ہے، میں کبھی کبھار مینڈکوں چوہوں اور شکار کیئے گئے چند ایک کنگروؤں کا اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن گھر کے پالتو سؤر کا گوشت ان کے لیے اعلیٰ درجے کی کی حیوانی چکناہٹ اور پروٹین کا بہترین مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ "مارنگ" پروٹین کی کسی شدید کمی کا شکار ہیں۔ اس کے برعکس، کثیر اقسام کی نباتات اور سبزیوں پر مشتمل غذا سے انہیں متنوع اور گونا گوں قسم کی بناتاتی پروٹین میسر آتی جو ان کی غذائی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ لیکن غذائیت کے کم سے کم معیار سے کچھ زیادہ بڑھ کر نہیں۔ تاہم سؤر سے پروٹین حاصل کرنے کی بات کچھ اور ہے عام طور پر حیوانی پروٹین، نباتاتی پروٹیکن کی نسبت زیادہ مؤثر اور توانائی بخش ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی انسانی آبادیوں کے لیے جن کی خوراک صرف سبزیوں تک محدود ہو (اور پنیر دودھ انڈے اور مچھلی وغیرہ کا کوئی دخل نہ ہو) گوشت کی طلب ہمیشہ ناقابل مزاحمت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مارنگ کا سؤر پالنا ماحولیاتی مناسبت سے ایک حد تک قابل فہم

ہے۔ درجہ حرارت اور ہوا میں نمی مناسب ترین ہے۔ سؤر بھی بھیگے اور پہاڑی ڈھلوانوں کے سایہ دار ماحول میں خوب پھلتے پھولتے ہیں اور اپنی خوراک کا زیادہ حصہ جنگل میں آزادانہ گھوم پھر کر حاصل کرتے ہیں۔ ان حالات ...... میں سؤر کے گوشت کی قطعی ممانعت کا معمول ...... جیسا کہ مشرق وسطیٰ میں ہے ان علاقوں کے لیے نامعقول اور معاشی لحاظ سے نقصان دہ ہوگا۔

دوسری طرف سؤروں کی تعداد میں ...... لامحدود اضافے کا نتیجہ انسانوں اور سؤروں میں مقابلے اور مسابقت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اضافے کی کھلی چھٹی ہو تو سؤروں کی افزائش جہاں عورتوں پر کام کا بوجھ بڑھنے کا سبب ہوتی ہے وہاں باغات کے لیے بھی خطرے کا باعث بنتی ہے جن پر مارنگ کی اپنی زندگی اور بقا کا انحصار ہے۔ جیسے جیسے سؤروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے مارنگ خواتین کی محنت و مشقت بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب وہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ انسانوں کو خوراک دینے کے بجائے سؤروں کو خوراک کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ پہلے سے زیر استعمال نہ ہونے والی زمینوں کو جب استعمال میں لایا جاتا ہے تو پورے زراعتی نظام کی استعداد میں کمی آتی ہے۔ اسی مرحلے پر کائیکو کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلاف اور آباواجداد کا کردار جہاں ایک طرف سؤروں کی تعداد بڑھانے کے لئے زیادہ کوششوں کو بروئے کار لانے کی ترغیب دیتا ہے وہاں دوسری جانب ادھر بھی دھیان دلاتا ہے کہ سؤر عورت کی زندگی اور باغات کو غارت کر کے نہ رکھ دیں۔ ان کا یہ کام خاصا مشکل ہے کیونکہ مکمل ممانعت پر عمل درآمد ہمیشہ جزوی ممانعت سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پھر یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ ''کائیکو'' سے متعلق ان کا اعتقاد کہ بزرگوں کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہوئے اسے جلد از جلد منعقد کرنا چاہئے، مارنگ کو ایسے جانوروں سے مؤثر انداز میں چھٹکارا دلاتا ہے جو پل کر وبال جان بن جائیں اور سؤروں کی تعداد کو ''ایک اچھی شے کی بے تحاشا کثرت'' کو روکنے میں مدد دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آباواجداد اتنے دور اندیش ہیں تو وہ سیدھے بھلے سؤروں کی تعداد سے متعلق ایک حد کیوں نہیں مقرر کر دیتے جسے ہر مارنگ عورت کو پالنے کی اجازت ہو؟ کیا یہ بہتر صورت نہیں کہ سؤروں کی تعداد مستقل طور پر مقررہ ہو، بجائے اس کے کہ یہ تعداد قلت اور بہتات کی دو انتہاؤں کو چھوتی رہے؟

یہ متبادل راستہ صرف اس صورت میں قابل ترجیح ہے اگر ہر مارنگ قبیلے کی آبادی کی شرح نمو صفر ہو، اس کے کوئی مخالف دشمن نہ ہوں۔ زراعت کی ایک بالکل مختلف شکل ہو۔ طاقتور حکمران ہوں اور قوانین تحریری شکل میں موجود ہوں ......مختصر یہ کہ وہ ''مارنگ'' نہ ہوں۔ کوئی بھی، خواہ وہ آباواجداد ہی کیوں نہ ہوں، یہ پیش گوئی نہیں کرسکتا کہ سؤروں کی کتنی تعداد ''ایک اچھی شے کی بہتات'' کے زمرے میں آتی ہے۔ اس مرحلے کا انحصار جب سؤر تعاد کے لحاظ سے تکلیف کا سبب بن جاتے ہیں، مخصوص یکساں اور مستقل وجوہات پر نہیں بلکہ ان تغیر پذیر حالات و واقعات پر ہے جو سال بہ سال مختلف ہوتے ہیں۔ اس پورے خطے کی کل آبادی کیا ہے اور اس میں ہر قبیلے کے کتنے لوگ ہیں۔ ان کی طبعی اور نفسیاتی قوت کس حال میں ہے ان کی عمل داری اور مقبوضہ ملکیت کی وسعت کتنی ہے۔ موجودہ زیر استعمال جنگلات کے علاوہ بقایا محفوظ جنگلات کا رقبہ جوان کے قبضے میں ہیں اور ان کی ہمسائیگی میں بسنے والے دشمن گروہوں کی صورت حال اور ان کے ارادے کیا ہیں، یہ سب باتیں ہیں جو سؤروں کے مناسب عددی حجم کے فیصلے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ سمباگا قبیلے کے متوفی بزرگارن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''تم چار سؤر رکھو گے اس سے زیادہ نہیں'' کیوں کہ اس امر کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ ''کندلائی''، ''ڈماگائی'' بمگا گالی''، ''تگوما''، ''انڈاگائی''، ''امونمنیٹ'' اور باقی سب قبیلوں کے اسلاف اس تعداد پر راضی ہوں گے۔ یہ سب گروہ زمینی وسائل میں حصہ داری کے لئے اپنے اپنے حق کو جائز اور مضبوط بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ جنگ یا کم از کم جنگ کی سی کیفیت کے ماحول سے ان مطالبوں اور حقوق کی جانچ اور آزمائش ہوتی ہے۔ بزرگ عمائدین کے سؤر کے گوشت کے لیے نہ مٹنے والی تشنگی اور طلب بھی ''مارنگ'' قبیلوں کی انہی باہمی مسلح جانچ پڑتالوں اور آزمائشوں کا شاخسانہ ہے۔

اپنے اسلاف اور بزرگان کی خوشنودی کے لئے یہی کافی نہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوراک پیدا کرنے کی جتنی ہو سکے کوشش کی جائے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سؤروں کے ریوڑ کی صورت میں ہو۔ ایسی کوششیں گو کہ سؤروں کی بہتات پر منتج ہوتی ہیں لیکن یہ متعلقہ گروہ (قبیلے) کی بقا اور اپنے زیر قبضہ زمین کے دفاع کی صلاحیت کو بھی بڑھاتی ہیں۔

ایسا کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ پہلے اس طرح کہ اپنے بزرگوں کی سؤر کے لیے طلب کو پورا کرنے کے لئے جو زائد محنت اور کاوشیں درکار ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے ''رم بم'' کی جنگ بندی کے دوران میں پورے قبیلے کے لیے پروٹین کی جسمانی کھپت، مقدار کے لحاظ سے بڑھ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ زیادہ دراز قامت، تنومند اور طاقتور تندرست آبادی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ بندی کے خاتمے کا ''کائیکو'' کے ساتھ رشتہ جوڑنے سے آباواجداد کی ایک طرح حمایت حاصل ہوتی ہے کہ اعلیٰ درجے کی چکنائیوں اور پروٹین کا استعمال بھاری مقدار میں ، اس دوران میں ہوتا ہے جب انسان زبردست سماجی تناؤ میں مبتلا ہو۔ یعنی قبیلوں اور برادریوں کی آپس میں لڑائیاں چھڑنے سے عین پہلے کے مہینوں میں اور آخر میں اس طرح کہ غذائیت کے اعتبار سے بیش قیمت، سؤر کے گوشت کی شکل میں زائد خوراک کا وافر ذخیرہ ہونے کے باعث، مارنگ قبیلے اپنے اتحادیوں کو جنگ شروع ہونے سے پہلے جب ان کی بہت ضرورت ہوتی ہے دوبارہ اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں اور انہیں رفاقت کا صلہ دے سکتے ہیں۔

''سمباگا'' اور ان کے ہمسائے سؤروں کی افزائش اور فوجی قوت کے درمیان تعلق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ''کائیکو'' کے دوران میں کاٹے جانے والے سؤروں کی تعداد سے مہمانوں کو دعوت دینے والوں کی صحت، تندرستی، توانائی اور عزم کی پختگی کا صحیح اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے۔ ایسا قبیلہ جو سؤروں کی معقول تعداد جمع کرنے کا انتظام نہیں کرسکتا، اس سے اپنے زیر قبضہ علاقے کا اچھی طرح دفاع کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی اور وہ مضبوط اتحادیوں کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکتا۔ جب ''کائیکو'' میں بزرگوں کو کافی مقدار میں سؤر کا گوشت کھانے کو نہیں ملتا تو پھر میدان جنگ میں شکست کی پیشگی اطلاع دینا بھی محض تضیع اوقات ہے۔ ''ریپورٹ'' کا اصرار ہے اور صحیح بھی ہے کہ بنیادی طور ماحولیاتی نقطۂ نظر سے کسی گروہ کی ضرورت سے فاضل سؤروں کا تعدادی حجم، اس کی پیداواری اور عسکری قوت کا قابل اعتماد اشاریہ ہے اور اس کے علاقائی حق ملکیت کا معتبر جواز یا عدم جواز فراہم کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ پورا نظام، انسانی ماحولیاتی نقطۂ نظر سے علاقے کی نباتات، حیوانات اور انسانی آبادی کی مستعد متوازن تقسیم پر منتج ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بعض قارئین اب اصرار کریں گے کہ سؤر سے محبت اور انس

نامناسب اور ناموزوں ہے اور خوفناک حد تک بے فائدہ اور بے کار بھی کیونکہ اس سے وقفوں وقفوں کے بعد جنگ چھڑنے کے عمل کو مہمیز لگتی ہے۔ اور اگر جنگ نامعقول اور لغو ہے تو ''کائیکو'' بھی ایسے ہی ہے۔ اب پھر مجھے اجازت دیجئے کہ ہر چیز کی فوری وضاحت سے باز آؤں۔ اگلے باب میں میں ''مارنگ عسکریت'' کی عام وجوہات پر گفتگو کروں گا۔ لیکن فی الحال مجھے یہ کہنے دیں کہ جنگی ماحول کا باعث، سؤر سے محبت نہیں۔ لاکھوں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے سؤر کو دیکھا تک نہیں لیکن وہ جنگ لڑتے ہیں۔ پھر سؤر سے نفرت کرنے والے لوگ (قدیم دور کے ہوں یا جدید دور کے) وہ مشرق وسطیٰ میں مختلف گروہوں کے درمیان باہمی تعلقات میں امن کو فروغ دینے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ انسانی تاریخ اور ماقبل تاریخ کے ہر زمانے میں، جنگی جنون کے غلبے کی موجودگی میں ہم اس نظام پر خوف اور تعجب کا اظہار ہی کر سکتے ہیں جس کی تدبیر نیوگنی کے وحشیوں نے کی ہے کہ اس کے تحت...... جنگ بندی کے کافی طویل وقفے برقرار رہتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود، جب تک ہمسایوں کے ''رم بم'' پودے زیر زمین رہیں ''سمباگا'' قبائل کو اپنے اوپر حملے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ایسی اقوام کے متعلق جو ''رم بم'' کی بجائے میزائل کاشت کرتی ہیں شاید اتنا کچھ ہی کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

☆☆☆

MashalBooks.org

کہنہ طرز کی جنگ

مارنگ قبائل کی طرح پرانے زمانوں کے منتشر قبائل کے درمیان لڑی جانے والی جنگوں سے انسانی طرزِ زندگی کے بنیادی طور صحت مند ہونے سے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جب جدید دور کی قومی مملکتیں جنگ لڑتی ہیں تو ہم اکثر اس کی بالکل اور عین صحیح وجوہات سمجھ سکتے ہیں۔ پریشان ہوتے ہیں لیکن ہمارے پاس بظاہر معقول ان متبادل وضاحتوں کی کمی نہیں ہوتی جن میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔

تاریخ کی کتابیں ایسی جنگوں کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں جن میں متحارب فریقوں نے تجارتی راستوں، قدرتی وسیلوں، سستی مزدوری یا وسیع منڈیوں پر قبضہ جمانے کی جدوجہد کی۔ جدید بین المملکتی لڑائیاں افسوسناک ہوسکتی ہیں لیکن وہ بلا جواز نہیں ہوتیں۔ کشیدگی میں کمی نفع اور نقصانات میں ایک طرح کے منطقی توازن کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کا نیوکلیئر حملے سے فوائد کے مقابلے میں نقصان زیادہ ہوتو دونوں میں سے کسی کی طرف سے اپنے مسائل کے حل کے لیے جنگ شروع کرنے کا امکان نہیں۔ لیکن اس نظام کی بدولت نیوکلیئر جنگ سے بچنے کی توقع صرف اسی صورت میں کی جاسکتی ہے اگر جنگوں کا نیوکلیئر حقیقی تعلق اصل حالات سے ہو۔ اگر جنگیں غیر منطقی، غیر مقبول اور ناقابل توضیح وجوہات پر لڑی جائیں تو خود اپنی تباہی کا امکان اس راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ اگر جنگیں کئی لوگوں کے خیال کے مطابق اس لئے لڑی جاتی ہیں کیونکہ انسان اپنی سرشت میں لڑاکا، جنگ جو، تندخو اور ایک ایسا جوان ہے جو تفریحاً اپنی شہرت کی خاطر، یا بدلہ لینے کے لئے، یا جارحانہ رویے اور خون خرابے کا دلدادہ ہونے کے باعث پر تشدد جوش وخروش سے آمادہ فساد ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کرتا ہے تو پھر

MashalBooks.org

میزائلوں کا پر تپاک طریقے سے نیک خواہشات کے ساتھ خیر مقدم کیجئے۔

موجودہ دور میں پرانے زمانوں کی جنگوں کے بارے میں دی گئی وضاحتیں غیر منطقی اور معقول جواز کے بغیر ہوتی رہیں چونکہ جنگ کے نتائج اس میں حصہ لینے والوں کے لیے مہلک ہوتے ہیں اس لئے اس مفروضے پر بھی شک کی گنجائش موجود ہے کہ متحارب فریقوں کو لڑائی کی وجہ کا علم بھی ہوتا ہے لیکن گائیں ہوں یا سؤر، جنگیں ہوں یا فسوں کاری، ان سب کے سلسلے میں ہمارے لئے مخمصے کا جواب ان سے متعلق لوگوں کی آگاہی میں نہیں۔ جنگجو بذاتِ خود اپنی جنگوں اور لڑائیوں کی باقاعدہ وجوہ اور نتائج کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ عداوت اور دشمنی شروع ہونے پر جنگ کی وجوہات بیان کرنے کے لئے اپنے ذاتی احساسات کو بیان کرنے کا سہارا لیتے ہیں۔ ایک جنگجو قبیلے (جوبرو) کا فرد جب قتل و غارت کی مہم پر روانہ ہوتا ہے تو اپنے دشمن کی روح کو فتح کرنے کے کسی موقع ملنے پر بے حد مسرور ہوتا ہے۔ ''کرد'' قبیلے کا جنگجو اپنی بے خوفی ثابت کرنے کے لیے اپنے دشمن کے مردہ جسم کو چھونے کا آرزومند ہوتا ہے۔ جنگ کے کئی متوالے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہوتے ہیں اور کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں انسانی گوشت کھانے کی تحریک ہوتی ہے۔

یہ انوکھی خواہشات بالکل حقیقی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ جنگ کے نتائج ہیں، اس کی وجاہات نہیں۔ یہ خواہشات انسان میں تشدد کی خوابیدہ صلاحیت کو متحرک کرتی ہیں اور جارحانہ رویے کو منظّم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ گائے سے محبت یا سؤر سے نفرت کس طرح بھونڈی قسم کی جنگ کی بھی ایک اساس ہے۔ غیر متمدن لوگ جنگ کا سہارا اس لئے لیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس کئی مسائل کے حل کے لیے کوئی متبادل صورت نہیں ہوتی...... ایسی متبادل صورتیں جن میں مصیبتیں تکالیف اور قبل از وقت اموات کم ہوں۔

کئی دوسرے غیر ترقی یافتہ گروہوں کی طرح ''مارنگ'' بھی جنگ شروع کرنے کا جواز، تشدد کے واقعات کا انتقام لینا بیان کرتے ہیں۔ ''ریپورٹ'' نے جتنی بھی مثالیں جمع کیں، ان سب میں پہلے سے دوست قبیلے ایک دوسرے کے خلاف جنگ میں الجھ گئے، جس کی وجہ تشدد کے مخصوص واقعات کے الزامات تھے۔ ان اشتعال انگیزیوں میں سے اکثر کا تعلق عورتوں کے اغواء، زنا بالجبر، کسی باغ میں گولی مار کر سؤر کی ہلاکت، فصل چوری کرنے، چوری چھپے شکار کرنے یا جادو کے ذریعے موت یا بیماری کا سبب بننے سے تھا۔

ایک دفعہ دو ''مارنگ'' قبیلے آپس کی جنگ میں الجھ گئے جس میں انسانی جانوں کا اختلاف ہوا۔ ان کے جذبۂ دشمنی کو برقرار رکھنے میں کبھی کمی نہیں آئی۔ ہر میدانِ جنگ میں موت کا شکار ہو جانے والوں کے رشتہ دار انتقام لینے کی سوچ بچار میں غرق رہتے۔ وہ اس وقت تک ہرگز مطمئن نہ ہوتے جب تک وہ دشمن کے ایک آدمی کو موت کے منہ میں دھکیل کر حساب برابر نہ کر لیتے۔ لڑائی کا ہر دور اگلے راؤنڈ کے لیے خاطر خواہ ترغیب فراہم کر دیتا تھا۔ اور مارنگ جنگجو اکثر اس آرزو کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے کہ وہ دشمن گروہ کے مخصوص ارکان کو ختم کر سکیں گے۔ یہ مخصوص ارکان وہ ہوتے تھے جنھوں نے دس سال قبل کسی کے باپ یا بھائی کو مارا ہوتا تھا۔

مارنگ جنگ کی تیاری کس طرح کرتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ مقدس ''رم بم'' کے پودوں کو جڑ سے اکھیڑنے کے بعد جنگجو قبائل سؤر کے بہت بڑے جشن مناتے ہیں۔ جن کے ذریعے وہ نئے اتحادی جمع کرتے اور پہلے اتحادیوں سے دوستی کے رشتوں کو مستحکم کرتے ہیں۔ ''کائیکو'' کا یہ جشن ہنگامہ خیز ہوتا ہے، اس کے کئی مرحلے مہینوں جاری رہتے ہیں اس لئے چپکے سے اچانک حملہ آور ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ درحقیقت مارنگ کو یہ امید ہوتی ہے کہ کائیکو کی وجہ سے ان کی آسودگی اور خوش حالی کو دیکھ کر ان کے دشمنوں کے حوصلے پست ہوں گے۔ دونوں فریق جنگ میں پہلا آمنا سامنا ہونے سے قبل ہی پوری طرح تیاریاں کر لیتے ہیں۔ درمیان میں پڑنے والے لوگوں کے ذریعے دونوں متحارب گروپوں کے درمیان ایسے سرحدی علاقے کو جہاں جنگل نہ ہو میدان جنگ بنانا طے ہو جاتا ہے پھر دونوں فریق اس میدان کو باری باری صاف کرنے میں شریک ہوتے ہیں اور متفقہ طور پر طے شدہ دن کو جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

میدان جنگ میں جانے سے پہلے مارنگ اپنے جنگی جرنیلوں کے گرد ایک دائرے میں جمع ہوتے ہیں جو آگ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سسکیاں بھرتے اور اپنے آباد اجداد سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جنگی شعبدہ باز بانس کے سبز ڈنڈوں کو آگ کے شعلوں میں رکھ دیتے ہیں جب یہ بانس حرارت کے باعث چٹخنے لگتے ہیں تو جنگجو اپنے پاؤں اور بدن مضبوطی سے جما لیتے اور ''دوودو'' کا شور مچاتے میدان جنگ کی طرف ایک قطار میں چل دیتے ہیں۔ راستہ بھر وہ اچھلتے کودتے اور گاتے جاتے ہیں۔ ان کا درمیانی

فاصلہ اتنا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف سے چلائے گئے تیر کمان کی زد میں آتے ہیں۔ وہ میدان میں انسانی قد کے برابر لکڑی کے تختے (بطور ڈھال) گاڑ دیتے ہیں اور ان میں کبھی کبھی کوئی سپاہی اپنی ڈھال کی اوٹ سے باہر نکل کر اپنے مخالفین کو لعنت و ملامت کرنے لگتا ہے۔ اس مرحلے کے دوران میں ہلاکتیں کم ہوتی ہیں اور اگر کوئی زیادہ زخمی ہو جائے تو دونوں فریقوں کے اتحادی جنگ کو ختم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک بھی مزید انتقام پر مصر ہو تو لڑائی میں شدت آجاتی ہے، سپاہی لاٹھیوں اور برچھیوں سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں اور مخالف دھڑے ایک دوسرے سے زیادہ قریب آجاتے ہیں۔ کوئی بھی فریق دوسرے پر پرعزم انداز میں جھپٹ سکتا ہے تاکہ ہلاکتوں میں اضافہ ہو۔

جونہی کوئی شخص مارا جاتا ہے تو جنگ بندی ہو جاتی ہے۔ ایک دو دنوں کے لیے لڑائی میں شریک سب لوگ تجہیز و تکفین کی رسومات کی ادائیگی یا اپنے اسلاف کی مدح گوئی کے لیے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں فریقوں کے درمیان مقابلہ برابر کا رہا ہو تو وہ جلدی میدان جنگ میں واپس آجاتے ہیں۔ جیسے جیسے یہ جدوجہد طول پکڑتی ہے اتحادی اکتانے لگتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو جانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اگر یہ اکتاہٹ اور بیزاری ایک فریق کی نسبت دوسرے فریق میں زیادہ ہو جائے تو مضبوط گروہ کمزور کو میدان چھوڑ کر بھگا دینے اور اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ کمزور فریق اپنے منقولہ اثاثے جمع کر کے اپنے اتحادیوں کے گاؤں میں پناہ لیتا ہے۔ مضبوط قبیلے اپنی فتح کا پیشگی اندازہ لگا کر زیادہ فوائد سمیٹنے کی خاطر، دشمن کے گاؤں میں رات کے وقت داخل ہو کر آگ لگانے اور جتنے آدمی ان کے ہتھے چڑھیں انہیں مار ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب شکست ہو جاتی ہے تو فاتح دشمن کا پیچھا کرنے کی بجائے اس کے جدا ہو جانے والے ساتھیوں کو مارنے، عمارتوں کو جلانے، فصلوں کو تباہ کرنے اور سؤروں کو اغواء کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

مارنگ قبائل کے درمیان 29 میں سے 19 معلوم جنگوں کا خاتمہ ایک گروہ کے ہاتھوں دوسرے کی شکست پر ہوا۔ شکست دینے کے فوراً بعد فاتح گروہ واپس اپنے گاؤں چلا جاتا ہے، اپنے باقی بچے ہوئے سؤروں کو قربان کرتا ہے اور جنگ بندی کے عرصے کا آغاز

کرتے ہوئے ''رم بم'' کی ازسرنو کاشت کا منصوبہ بناتا ہے، یہ دشمن کی زمین پر براہ راست قبضہ نہیں کرتا۔

ایک فیصلہ کن شکست کا نتیجہ جس میں بہت سے لوگ مارے گئے ہوں کسی گروہ کی اپنی سابقہ ملکیتی حدود میں کبھی واپس نہ آنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہارنے والوں کی اگلی نسلیں اپنے اتحادیوں کی نسلوں میں مدغم ہو جاتی ہیں جبکہ ان کی ملکیتی زمینوں پر فاتح اور ان کے اتحادی قبضہ کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شکست خوردہ گروہ اپنی زمینیں اپنے اتحادیوں کو دے دیتے ہیں جن کے ہاں انہوں نے پناہ لی ہوتی ہے۔ پروفیسر اینڈریو وائڈ جنہوں نے بسمارک کے وسیع کوہستانی خطے میں جنگجو کے بعد کے عواقب ونتائج پر تحقیق کی ہے، بتاتے ہیں کہ شکست خوردہ گروہ کی پسپائی خواہ فیصلہ کن ہو یا نہ ہو، بہر حال امکان یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی نئی بستیاں دشمن کی سرحدوں سے کافی دور ہٹ کر بساتے ہیں۔

یہ سوال کافی دلچسپی کا حامل ہے کہ کیا مارنگ لوگوں کے درمیان ان جنگوں، لڑائیوں اور علاقائی تسلط کو حالات کے حسب ضرورت بنانے کے عمل کو آبادی کے دباؤ کا نتیجہ سمجھا جائے؟ اگر تو دباؤ سے مراد ہم غذا کے ذریعے ''حراروں'' کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کی فراہمی میں کسی گروہ کی مطلق ناکامی کو لیتے ہیں تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''مارنگ'' کے خطے میں آبادی کا کوئی دباؤ ہے۔ 1963ء میں جب ''سمباگا'' قبیلے نے سؤروں کا جشن منایا تو اس وقت قبیلے کی آبادی 200 تھی اور سؤروں کی تعداد 164 تھی۔

رپورٹ حساب لگا کر بتاتے ہیں کہ سمباگا کی اپنی علمداری میں غیر استعمال شدہ جنگلات پر مشتمل کافی زمینیں تھیں جو 84 اضافی انسانوں کی خوراک (یا 84 پلے پوسے بالغ سؤروں کی خوراک) کے لئے مکتفی تھیں اور وہ بھی جنگلات کو کوئی مستقل نقصان پہنچائے یا اپنے مسکن کے کسی دوسرے اہم حیات افروز پہلو کو گھٹائے بغیر! ...... لیکن مجھے آبادی کے دباؤ کی اس طرح تشریح پر اعتراض ہے جس کے ذریعے اسی دباؤ کو غذائیت میں حقیقی کمی کی ابتدا یا ماحول کو پہنچنے والے ناقابل تلافی نقصان کا اصل آغاز سمجھا جاتا ہے۔ میری رائے ہے کہ آبادی میں اضافہ جونہی حراروں یا پروٹین میں کمی کی طرف اشارہ کرتا نظر آئے تو ''آبادی کا دباؤ'' وجود میں آجاتا ہے اسی طرح اگر یہ اضافہ اس حساب سے ہو کہ افزائش اور کھپت بڑھنے کی شرح ماحول میں زندگی بخش قوتوں کو جلد یا بدیر گھٹانے یا ختم کرنے کا

باعث بنے تو یہ بھی بنے تو یہ بھی آبادی کے دباؤ کی موجودگی ہوگی۔

جس مرحلے پر غذائیت کی کمی یا معیار میں پستی واقع ہونا شروع ہوتی ہے، آبادی کا اس وقت کا وہ حجم ہی ماحولیات کے ماہرین کی زبان میں ''مسکن کی قوت برداشت'' کی بالائی حد ہوتی ہے۔ مارنگ کی طرح اکثر غیر مہذب پسماندہ معاشروں میں ایسی ترکیبیں اور معمولات ہوتے ہیں جن کی بدولت وہ افزائش آبادی کو ''ماحول کی قوت برداشت'' تک محدود یا اس سے کم تر رکھ سکتے ہیں۔ اس بات کے معلوم ہونے سے بہت پریشانی اور حیرانی پیدا ہوتی ہے کیونکہ کئی مخصوص معاشرے ''قوت برداشت'' پر گنجائش سے زائد بوجھ ڈالنے کے منفی نتائج کا ادراک رکھتے ہوئے پیش بندی کے طور پر آبادی، پیداوار اور کھپت میں پیشگی تخفیف لاتے ہیں، اس لئے کئی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ آبادی کے دباؤ کا انحصار تخفیف آبادی پر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ حفاظتی والو (Valve) اٹک کر پھنس جانے کے باعث بوائلر دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے، تا کہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ والو تو موجود ہے کیونکہ عام حالات میں یہ بوائلر کو پھٹ پڑنے سے بچاتا ہے۔

یہ بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ افزائش میں مخل ہونے والی یہ ترکیبیں جو تھرموسٹیٹ (تپش کو منضبط کرنے والا آلہ) ''سرکٹ بریکر'' (برقی رو بند کرنے والا آلہ) اور سیفٹی والو وغیرہ کے ثقافتی لحاظ سے مماثل ہیں کس طرح قبائلی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ دوسری حسب حال بن جانے والی اختراعات کی مانند جن معاشروں نے افزائش نسل میں رکاوٹ بننے والی ترکیبوں کو ایجاد یا اختیار کیا وہ زیادہ استقامت اور تسلسل کے ساتھ زندہ سلامت رہتے ہیں بمقابلہ ان کے جنہوں نے ''بوجھ سہارنے'' کی حد استطاعت سے متجاوز ہونے کی غلطی کا ارتکاب کیا۔ غیر متمدن اور وحشیانہ جنگجوئی بھی نہ تو متلون مزاجی اور اوندھی مت ہے اور نہ جبلی فطرت بلکہ یہ پیداواری عمل میں تخفف لانے والی ترکیبوں میں سے ایک ہے جو انسانی آبادی کو اس کے رہائشی مسکن کے اردگرد ماحول کی مناسبت سے توازن کی حالت برقرار رکھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگ اس سوچ کو ترجیح دیتے ہیں جس کے تحت جنگ و جدل کو دفاع کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے اسے ماحولیاتی متعلقات کے صحت مندانہ ربط کے لئے خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسا خطرہ جو ناقابل انسداد اور نامعقول رویے کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ میرے

بہت سے دوستوں کے خیال میں یہ کہنا گناہ ہے کہ جنگ کسی قسم کے مسئلے کا ایک معقول حل ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ غیر مہذب جنگی کارروائیوں سے متعلق میری اس وضاحت کے بعد کہ اس کی ماحولیاتی لحاظ سے مناسبت کے باعث اس خوش فہمی کی زیادہ گنجائش ہے جو جدید طرز کی جنگ و جدل ختم کرنے سے متعلق امکانات کے ختم ہونے کے ضمن میں ہوسکتی ہے۔ کم از کم ان جبلی تحریکوں پر موقوف نظریات کے مقابلے میں امید افزائی غنیمت ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر تو جنگوں کا باعث انسان کی فطری مردم کش جبلتیں ہیں تو ان کو روکنے کے لئے ہمارے بس میں کچھ نہیں، اس کے برعکس اگر جنگیں معروضی حالات اور تعلقات کے سبب ہوتی ہیں تو ہم ان حالات اور تعلقات میں تبدیلیاں لا کر جنگ کے خطرات کو کم کر سکتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ اپنے سر جنگ کے حمایتی ہونے کا الزام لوں، اس لئے مجھے درج ذیل وضاحت کی اجازت دیجئے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جنگ و جدل غیر متمدن اقوام کی زندگی کے طور طریقوں میں ماحولیاتی اعتبار سے حسب حال اور موافق ہے نہ کہ یہ، کہ جدید جنگیں اردگرد کے ماحول سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

اب نیوکلیئر ہتھیاروں نے جنگ کو اس حد تک ہلاکت خیز اور شدت آمیز بنا دیا ہے کہ اس سے مکمل باہمی تباہی و بربادی عمل میں آسکتی ہے۔ چنانچہ ہم نسل انسانی کی اس ارتقائی منزل اور مرحلے پر پہنچ چکے ہیں جس میں نئے ماحول سے مطابقت پذیری کی جانب بڑی پیش قدمی کا مطلب یا تو نیوکلیئر ہتھیاروں کا خاتمہ ہوگا یا خود جنگ کا۔

کئی مختلف قسم کی شہادتوں سے ''مارنگ'' کی جنگی کارروائیوں سے متعلق نظام کو باقاعدہ بنانے یا اسے برقرار رکھنے کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگی کارروائیاں اس مرحلے پر شروع ہوتی ہیں جب پیداوار اور کھپت کی افراط ہوتی ہے اور سؤروں اور انسانوں کی تعداد پہلی لڑائی کے خاتمے تک ہونے والی کمی پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ جنگی کارروائیوں کا ہر نیا چکر شروع ہونے سے پہلے سؤروں کی کٹائی کے جشن اور اس کے بعد کی عداوتوں کے سلسلے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد کا ہر بار یکساں ہونا ضروری نہیں، کیونکہ قبیلوں کے گروہ اپنی زمینی ملکیت کے حقوق کو جائز ٹھہرانے کی کوشش ماضی میں تیاریوں کی زیادہ سے زیادہ سطحوں تک پہنچنے سے پہلے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے پڑوس

MashalBooks.org

میں رہنے والے دشمنوں کی تعداد میں تیزی سے ہونے والا غیر متناسب اضافہ ہوتا ہے۔ کئی دوسرے لوگ اپنے جشن کا ئیکو میں اس وقت تک تاخیر کرتے ہیں جب تک ان کا مقامی علاقہ بوجھ برداشت کرنے کی استعدد اور اہلیت کی دہلیز کو پار نہ کر جائے، تاہم اس میں اہم بات یہ نہیں ہے کہ جنگ وجدل کے اس نظام میں باقاعدگی لانے کا اثر کسی ایک یا دوسرے مخصوص گروہ کی آبادی پر پڑتا ہے بلکہ ''مارنگ'' خطے کی آبادی بہ حیثیت مجموعی متاثر ہوتی ہے۔

قدیم طرز کی جنگی کارروائیوں سے نظام کو ہموار اور باقاعدہ بنانے کے اثرات لازمی طور پر لڑائی بھڑائی اور مقابلے میں ہونے والی اموات (ہلاکتوں) سے مرتب نہیں ہوتے۔ صنعتی انداز کی تنظیم، لڑائی بھڑائی اور مقابلوں میں بھی اموات کی تعداد آبادی کی شرح نمو پر خاطر خواہ طور سے اثر انداز نہیں ہوتی۔ بیسویں صدی کے دوران میں ......جنگوں میں ہونے والی کروڑوں کی تعداد میں ہلاکتوں سے آبادی میں بے رحمانہ اضافے کے غالب رجحان اور دباؤ میں خفیف سی کمی آئی۔ روس کی مثال لے لیں۔ جنگ عظیم اول میں لڑائی کی شدت اور قحط کے دوران میں اومالشویک انقلاب کے دوران میں زمانہ امن کے لیے آبادی کے تخمینے اور زمانہ جنگ میں اصل آبادی کے مابین فرق کا فیصد تناسب محض معمولی تھا۔ جنگ کے خاتمے کے ایک عشرے بعد روس کی آبادی پوری طرح سنبھل چکی تھی اور بحال ہوگئی تھی یعنی عین اس سطح پر تھی جس پر جنگ نہ ہونے اور انقلاب نہ آنے کی صورت میں ہونی چاہیے تھی۔ ایک اور مثال ویت نام کی ہے جہاں زمینی اور فضائی جنگوں کی غیر معمولی شدت کے باوجود 1960ء کے پورے عشرے میں آبادی یکساں اور ہموار انداز میں بڑھتی رہی۔

دوسری جنگ عظیم جیسی تباہ کاریوں کے حوالے سے مشی گن یونیورسٹی کے پروفیسر ''لونگ سٹون'' اکل کھرے انداز میں کہتے ہیں، ''جب ہم اس پر غور کریں کہ ایسی قتل وغارت کے واقعات ایک نسل کی زندگی میں تقریباً ایک (آدھ) بار رونما ہوتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان کا آبادی کی افزائش یا تعدادی حجم سے کوئی تعلق نہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اوسط درجے کی عام عورت انتہائی کثیر الاولاد ہوتی ہے اور وہ پچیس سے 35 سال کے عرصے میں جس کے دوران میں وہ بچے پیدا کرسکتی ہے بآسانی آٹھ یا نو بچوں کو جنم دیتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جنگ کے سبب مرنے والوں کی کل تعداد آبادی کے

10 فیصد سے کم تھی اور پیدائشوں کی تعداد میں فی عورت معمولی سا اضافہ چند سالوں میں اس کمی کو پورا کر سکتا تھا۔ (اس وقت شیر خوار بچوں کی شرح اموات میں کمی کے علاوہ عام شرح اموات میں تخفف کی مدد بھی شامل تھی۔)

میں آپ کو ''مارنگ'' کی اصل شرح اموات تو نہیں بتا سکتا لیکن ان کے ایک قبیلے ''یا نومامؤ'' جو برازیل اور وینزویلا کے درمیانی سرحدی علاقے میں آباد ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا بھر کے سب سے زیادہ جنگجو قدیم گروہوں میں سے ایک ہے ...... اس کے 15 فیصد بالغ لوگ جنگی سرگرمیوں کی وجہ سے موت کی بھینٹ چڑھتے ہیں ''یا نومامؤ'' سے متعلق مجھے اگلے باب میں اور بہت کچھ کہنا ہے۔

آبادی پر کنٹرول کا ذریعہ ہونے کے سلسلے میں جنگ اور لڑائی بھڑائی کی اہمیت کم تر ہونے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ لڑنے والے جنگجو مرد ہی ہوتے ہیں اور زیادہ تر جنگ کی بھینٹ بھی وہی چڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''یانومامؤ'' قبیلے میں 7 فیصد بالغ خواتین کے مقابلے میں 33 فیصد بالغ مرد میدان جنگ میں کام آتے ہیں۔ اینڈریووڈا کے مطابق ''مارنگ'' قبائل کی سب سے زیادہ خونریز پسپائی کے دوران میں ہلاک ہونے والوں میں 14 مرد 6 عورتیں اور 3 بچے شامل تھے، جبکہ شکست کھانے والے قبیلے کی کل آبادی 300 تھی۔ لڑائی میں مردوں کی اموات کو اس لئے کوئی اہمیت نہیں ملتی کیونکہ ان سے حقیقتاً سمباگا'' جیسے گروہوں کی افزائش نسل کی گنجائش پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہاں تک کہ اگر ایک بڑی جنگ میں 75 فیصد بالغ مرد بھی مارے جائیں تو زندہ بچ جانے والی عورتیں اس کمی کو ایک ہی نسل سے بآسانی پورا کر سکتی ہیں۔

اکثر پسماندہ معاشروں کی طرح ''مارنگ'' اور یانومامو قبیلوں میں بھی بہت سے لوگوں کی بیویاں کثیر تعداد میں ہوتی ہیں۔ سب عورتوں کی شادی، جونہی وہ بچے پیدا کرنے کی اہل ہوتی ہیں، کر دی جاتی ہے اور بچوں کی عمر کے اس سارے حصے کے دوران میں جب تک وہ بچے پیدا کر سکتی ہے ''شادی شدہ'' ہی رہتی ہیں۔ کوئی بھی عام سا مرد اکثر اوقات چار یا پانچ خواتین کو حاملہ رکھ سکتا ہے۔ جب کوئی ''مارنگ'' مرد مر جاتا ہے تو اس کے بہت سے بھتیجے اور بھائی اس کی بیوہ کو اپنی ازواج میں شامل کرنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ معاشی گزر بسر کے لحاظ سے اکثر مرد بالکل غیر اہم ہوتے ہیں اور جنگی مقابلوں میں ان کی

اموات سے ان کی بیواؤں یا بچوں کے لیے کوئی ایسی مشکلات پیش نہیں آتیں جن پر قابو نہ پایا جا سکے۔ جیسا کہ میں نے پچھلے باب میں ذکر کیا ہے ''مارنگ'' میں دراصل عورتیں ہی باغبانی کرتی ہیں اور سؤروں کی پرورش کرتی ہیں۔ دنیا بھر میں جنگل کاٹ اور جلا کر گزر بسر کرنے سب معاشروں میں یہی صورت حال ہے، اس کام میں مردوں کا حصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ باغبانی کرنے کے لیے جنگلات کے غلاف کو جلا کر صاف کرنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں، لیکن عورتیں اس مشقت بھرے کام کر از خود سرانجام دینے کی پوری طرح اہل ہوتی ہیں۔ اکثر پس ماندہ معاشروں میں جب کبھی بھاری وزن کا سامان اٹھانے کی ضرورت پیش آئے مثلاً لکڑی کا ایندھن یا سبزیوں کے ٹوکرے...... تو مردوں کو نہیں بلکہ عورتوں کو ہی موزوں ''لادو جانور'' سمجھا جاتا ہے۔ معاشی سرگرمیوں کے سلسلے میں ''مارنگ'' مردوں کی جو محدود سی شراکت ہے اس کے باعث آبادی میں عورتوں کا تناسب جتنا زیادہ ہو مجموعی طور پر خوراک کی پیداواری استطاعت اتنی ہی بہتر ہوتی ہے۔ جہاں تک غذا کا تعلق ہے مارنگ مرد سؤروں کی مانند ہیں وہ جتنی خوراک پیدا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ عورتیں اور بچے بہتر غذا کھا سکتے ہیں اگر وہ مردوں کی بجائے اپنی توجہ سؤروں کی افزائش پر مرکوز کریں۔

چنانچہ ''مارنگ'' کی جنگی کارروائیوں کا ان کے ماحول کے حسب حال ہونے اور ضرورت سے مطابقت پذیر ہونے کی خصوصیت کا ظالمانہ اثر لڑائی میں ہونے والی ہلاکتوں کے باعث افزائش آبادی پر نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے میرا خیال ہے کہ جنگی سرگرمیاں مارنگ کے ماحولیاتی نظام کو دو بالواسطہ اور غیر معروف نتائج کی وجہ سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق اس حقیقت سے ہے کہ جنگی سرگرمیوں کے نتیجے میں مقامی آبادیاں اپنے باغات کے اعلیٰ درجے کے رقبوں کو اس مرحلے پر خالی کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں جب وہ ابھی ''قوت برداشت'' کی حد کو چھپانے سے نیچے ہوتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ جنگی کارروائیوں کی وجہ سے شیر خوار بچوں کی شرح اموات بڑھ جاتی ہے اور یوں لڑائی کے نتیجے میں مردانہ اموات کا آبادی پر معمولی اثر نہ ہونے کے باوجود جنگی کارروائیاں خطے میں افزائش آبادی میں باقاعدگی لانے کا مؤثر ذریعہ بنتی ہیں۔

پہلے مجھے اعلیٰ درجے کی باغات والی زمین کے بارے میں وضاحت کرنے

Mashalbooks.org

دیں۔ کسی شکست کے بعد کئی سالوں تک نہ تو فاتح گروپ شکست خوردہ گروہ کی باغات کے لیے مخصوص وسطی اراضی کو استعمال کرتے ہیں اور نہ خود منظر سے اوجھل ہو جانے والے ...... یہ زمینیں درمیانی مرتفع سطح پر باغات کی متبادل جگہیں ہوتی ہیں۔ زمین سے یہ انخلا گو عارضی ہوتا ہے لیکن خطے کی ''قوت برداشت'' اور زرخیزی کو بحال کرنے میں مثبت اثرات کا حامل اور مددگار ہوتا ہے۔ 1953ء میں جب ''کنڈیگائی'' قبیلے نے ''سمباگا'' قبیلے کو شکست دی تو انہوں نے ''سمباگا'' والوں کے باغات تباہ کر دیئے، پھل دار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کاٹ دیئے، قبرستانوں اور سؤروں کی خندقوں (تنوروں) کی بے حرمتی کی، گھروں کو جلا دیا، تمام بڑے سؤروں کو ڈھونڈ کر کاٹ ڈالا اور سؤروں کے تمام بچوں کو اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے گئے۔ جیسا کہ ریپورٹ بتاتے ہیں ''لوٹ مار کرنے والوں کی توجہ مال غنیمت اکٹھا کرنے کی بجائے اس طرف دلائی گئی کہ وہ ''سمباگا'' کی اپنے علاقے میں واپسی کو مشکل بنا دیں۔ ''کنڈیگائی'' خود بھی ''سمباگا'' کے بڑے بزرگوں کی روحوں کے انتقام سے خوف زدہ ہو کر اپنے علاقے کی حدود تک واپس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے لڑائی کے کسی طلسماتی پتھر کو جالی دار تھیلوں میں بند کر کے ایک مقدس پناہ گاہ میں لٹکا دیا۔ یہ پتھر اس وقت تک نہیں اتارے گئے جب تک کنڈیگائی قبیلے کے لوگ اپنے بزرگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سؤروں کا اگلا جشن منانے کے قابل نہ ہوئے اور وہ پتھر جتنا عرصہ لٹکتے رہے ''کنڈیگائی'' مسلسل ''سمباگا'' کے بزرگوں کی روحوں سے خوفزدہ رہے اور وہ سمباگا کی حدود میں باغبانی کرنے یا شکار کھیلنے سے باز رہے۔ اس صورت حال میں بالآخر ''سمباگا'' خود ہی اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں پر واپس آ کر آباد ہو گئے۔ دوسری جنگوں میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں فاتحین یا ان کے اتحادیوں نے آخر کار ان زمینوں کو استعمال کیا جو شکستوں کے باعث عارضی طور پر خالی کر دی گئی تھیں۔ لیکن ہر صورت میں شکست کا فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ سرگرمی اور رغبت سے لگائے گئے جنگلات کے حصوں کو خالی چھوڑ دیا جاتا ہے جبکہ وہ علاقے جو پہلے زیر استعمال نہیں ہوتے (یعنی ہار جانے والوں کی حدود میں واقع سرحدی رقبے) زیر رقبے کو بار بار کاٹنا اور جلانا، جنگل کی بحالی کی قوتوں کے لیے خطرہ ہے۔ اگر ایک کے بعد دوسری بار جلائے جانے کا درمیانی عرصہ بہت تھوڑا ہو تو زمین کی مٹی خشک اور سخت ہو جاتی ہے اور درخت دوبارہ پھل پھول نہیں سکتے۔ باغات کی جگہوں پر گھاس پھوس کا قبضہ ہو جاتا ہے اور

پورا علاقہ آہستہ آہستہ قیمتی جنگلات کی بجائے گھاس پھوس کی جھاڑیوں والی کٹی پھٹی زمینوں اور گھاس کے میدانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، جن پر روایتی قسم کی زراعت کاری نہیں ہو سکتی۔ اس عمل کے نتیجے میں دنیا بھر کا کئی ملین ایکڑ رقبہ چراگاہوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

مارنگ کے علاقے میں جنگلات کی بربادی نسبتاً بہت کم ہوئی۔ بڑے اور جارح گروہوں کی عمل داری میں کچھ ٹکڑوں پر مستقل گھاس کے میدان چراگاہیں اور کم درجے کے جنگلات پائے جاتے ہیں مثلاً ''کنڈگائی'' کے علاقوں میں (یہی وہ گروہ ہے جو 1953ء میں ''سمباگا'' کی شکست کا ذمہ دار تھا) لیکن جنگلات میں ان کی استطاعت (حد برداشت) سے زیادہ لوگوں اور سؤروں کی پرورش جیسی تباہ کن کوششیں عام ہیں۔ نیوگنی کے پہاڑی علاقوں کے آس پاس کئی خطوں میں یہ معمول کافی عام ہے۔ مثال کے طور پر قومی ادارہ برائے صحت کے ڈاکٹر آرتھر سورن سن کی حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوبی خورے کے خطے میں وہاں کے لوگوں نے مرکزی علاقے میں چار سو مربع میل رقبہ پر محیط قیمتی جنگل کے ''مسکن'' کو بڑے وسیع پیمانے پر اور قابل بحالی نقصان پہنچایا ہے۔ متروک باغات اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کی جگہوں پر گھنی اور موٹی گھاس نکل آئی ہے۔ یہ آبادیوں کے غیر استعمال شدہ جنگلات کے کافی اندرونی حصوں تک منتقل ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ خطے میں جنگلات کی بربادی کے نظارے وہاں بھی عام ہیں جہاں کئی سالوں سے باغات لگانے کا سلسلہ جاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''مارنگ'' کا وقت کے مخصوص وقفوں سے منسلک رسوم و رواج یعنی جنگ اور ''رم بم'' امن اور سؤروں کی کٹائی کا چکر ان کے لیے اپنے ''مسکن'' کو ایسے انجام سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔

رسوم و رواج کے اس چکر میں سب اوٹ پٹانگ اور نرالی باتوں کے متعارف ہونے کے سبب جو کچھ ہوتا ہے یعنی ''رم بم'' کی کاشت سؤروں کی کٹائی، لڑائی کے طلسمی پتھروں کو لٹکانا اور جنگ بذات خود ان کے لیے ایک سادہ معاملہ ہے لیکن جو مجھے باقی سب باتوں سے زیادہ حیران کن لگتا ہے وہ وقت کی متعین حدود کا ہے۔ مارنگ کے خطے میں باغات کو، کم از کم لگاتار دس سے بارہ سال تک بغیر کاشت کے خالی رہنا ضروری ہے۔ پیشتر اس کے کہ انہیں جلایا یا دوبارہ زیر کاشت لایا جائے تاکہ وہ کمتر درجے کے گھاس کے میدان میں تبدیل ہو جانے کے خطرے سے محفوظ رہیں، سؤروں کا جشن بھی ایک نسل میں تقریباً

دو دفعہ یعنی دس یا بارہ سال کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم آخر کار اس کا جواب دے سکتے ہیں کہ ''مارنگ'' کے پاس اپنے اسلاف کا شکریہ ادا کرنے کے لیے سؤروں کی معقول تعداد کب ہوتی ہے اس کا معقول جواب یوں ہے کہ ان کے پاس سؤروں کی معقول تعداد اس وقت ہوتی ہے جب شکست خوردہ گروہ کے سابقہ باغات کے رقبے میں دوبارہ جنگل اگ آتے ہیں۔

''کاٹو اور جلاؤ'' کی معیشت پر انحصار کرنے والے دوسرے لوگوں کی طرح ''مارنگ'' بھی جنگلوں کو کھا کر زندگی گزارتے ہیں۔ یعنی فصلوں کو جلانا، پھر ان کی راکھ پر فصلیں کاشت کرنا، ان کے رسوم و رواج کا چکر اور رواجی معمول کی طرح لڑی جانے والی جنگ انہیں جنگل کو ''بہت تیزی سے بہت زیادہ کھانے'' سے باز رکھتی ہے۔ شکست خوردہ گروہ اپنی شکست کے بعد ان زمینوں سے پسپا ہوتا ہے جو باغات کے لیے نہایت موزوں ہوتی ہیں۔ اس طرح خطرے کی زد میں آئے ہوئے ان علاقوں میں جنہیں انہوں نے خود اور ان کے سؤروں نے تہس نہس کیا ہوتا ہے دوبارہ جنگل اگ آتا ہے اور انہیں اس کا سائبان میسر آ جاتا ہے۔ اپنے اتحادیوں کے ہاں عارضی قیام کے دوران میں شکست خوردہ لوگ اپنی عمل داری کے کچھ حصوں میں واپس آ کر انہیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ایسے حصے جو دشمنوں کی زد سے دور اور محفوظ جنگلی علاقے ہوں۔ اگر وہ اپنے اتحادیوں کی مدد سے سؤروں کے غول بنانے اور اپنی قوت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ اپنی زمینوں پر دوبارہ قبضہ جمانے اور ان سے ایک بار پھر پوری پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جنگ اور امن، قوت اور کمزوری، سؤروں کی افراط اور ان کی کمی، مرکزی باغات اور کناروں کناروں پر باغات ان سب کی بار بار اور متوازن وقوع پذیری سے پڑوس میں بسنے والے سب قبیلوں میں بھی تقلیدی جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اگرچہ فاتحین فوری طور پر اپنے دشمن کی سرزمین پر قبضہ جمانے کی کوششیں نہیں کرتے لیکن وہ شکست خوردہ دشمن کی سرحد سے پہلے کی نسبت قریب تر علاقوں میں باغات لگاتے ہیں۔

سؤروں کی تعداد میں زبردست تخفیف بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں کم از کم عارضی طور پر سہی ان کی عمل داری میں ''قوت برداشت'' سے زیادہ ''بوجھ سہارنے'' کے مرحلے کی طرف پیش قدمی کی رفتار گھٹ جاتی ہے۔ جب سؤروں کی آبادی اپنی انتہا کو پہنچتی

MashalBooks.org

ہے تو فاتحین لڑائی کے طلسمی پتھروں کو اتار لیتے ہیں۔ ''رم بم'' کو اکھاڑ دینے اور نئی حاصل ہونے والی مفتوحہ خالی پڑی زمین کو اپنی حدود میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش پر امن طریقے سے ہوتی ہے، اگر ان کے سابقہ دشمن ابھی ان سے مقابلے کی تاب نہ لا سکتے ہوں، لیکن اگر دشمن وہاں پھر واپس آ چکے ہوں تو پھر یہ کوشش انتقامی جذبے کے تحت ہوتی ہے۔

انسانوں، سؤروں، باغات اور جنگلات کی ایک دوسرے کے ساتھ باہم وابستہ کمی بیشی کے اتار چڑھاؤ سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ سؤروں کو وہ رسمی حرمت کیوں حاصل ہے جس کی مثال دینا کے باقی سؤروں والے علاقوں میں اور کہیں نہیں ملتی۔ نہ اس کا کوئی تصور ہے۔ چونکہ ایک جوان سؤروں اتنا ہی جنگل کھاتا ہے جتنا ایک بالغ انسان، اس لئے ان کی تعداد میں کمی بیشی کے ایک کے بعد دوسرے ہر دور کی انتہائی کیفیت کے عروج میں سؤروں کے قتل سے انسانوں کے قتل میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ آباواجداد سؤر طلب کرتے ہیں ورنہ انہیں اپنے بیٹے اور بیٹیاں کھانی پڑیں۔

ابھی ایک مسئلہ باقی رہتا ہے۔ 1953ء میں ''سمباگا'' کو اپنی عمل داری سے شکست کے باعث پسپا ہونا پڑا تو انہوں نے سات مختلف مقامی گروہوں کے ہاں پناہ لی۔ کئی جگہوں پر جن قبیلوں کے ہاں وہ پناہ گزین ہوئے وہاں کچھ اور پناہ گزین بھی دوسری جنگوں کے نتیجے میں موجود تھے جو ''سمباگا'' کی شکست سے پہلے اور بعد میں لڑی گئی تھیں۔ اس سے یہ نظر آتا تھا کہ شکست کھانے والے گروہوں کے علاقوں کو جس ماحولیاتی خطرے کا سامنا تھا وہ صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا اور پناہ گزین جلد ہی اپنے میزبانوں کے جنگلات کو کھانا شروع کر دیں گے اس لئے ماحول کو آبادی کے سبب ابتر ہونے سے بچانے کے لئے محض یہ کافی نہیں کہ لوگ ایک جگہ سے بے گھر ہو کر دوسری جگہ منتقل ہو جائیں بلکہ آبادی کی اصل افزائش کو محدود کرنے کی بھی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ یہ صورت حال ہمیں ان جنگی کارروائیوں سے حاصل ہونے والے دوسرے نتیجے کی طرف لے جاتی ہے جس کا ذکر میں نے ذرا پہلے کیا تھا۔

اکثر پس ماندہ معاشروں میں جنگی کارروائیاں آبادی کو قابو میں رکھنے کا اہم ذریعہ ہیں کیونکہ متحارب گروپوں کے درمیان بار بار ہونے والی شدید لڑائیوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نو عمر بچیوں کی نسبت نو عمر بچوں کو پالنا پوسنا اور جوان کرنا زیادہ منافع بخش لگتا ہے۔ بالغ

مردوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے اس گروہ کی عسکری قوت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے جسے وہ گروہ دستی ہتھیاروں سمیت میدان جنگ میں بھیج سکتا ہے اور اپنے پڑوسیوں کی طرف سے پڑنے والے دباؤ کی مزاحمت کے ذریعے علاقے پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے امکانات بھی اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے ولیم کی ڈویل نے 600 سے زائد پس ماندہ آبادیوں کا ان کے مختلف کوائف سے متعلق سروے کیا۔ اس سروے کے مطابق پندرہ سال تک کی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد کا باہمی تناسب اوسطاً 150 اور 100 کے قریب ہے لیکن کئی گروہ ایسے بھی ہیں جن کے ہاں لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے دگنی ہے۔ ''سمباگا'' لڑکوں اور لڑکیوں، ہر دو صنفوں کا تناسب 150 اور 100 کی اوسط کے قریب تر ہے تاہم جب ہم بالغوں کی طرف آتے ہیں تو ڈویل کے سروے کے مطابق مردوں اور عورتوں کی اوسط نسبت تقریباً برابر ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جواں عمر مردوں کی شرح اموات، جواں عمر عورتوں سے زیادہ ہے۔

جواں عمر کے مردوں کی شرح اموات زیادہ ہونے کی غالب وجوہات لڑائی میں ہونے والے جانی نقصانات ہیں۔ ''مارنگ'' قبیلے کے جنگ میں ہلاک ہونے والے مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ یعنی 10 دس اور (ایک) کی نسبت سے ہے لیکن پھر چھوٹی عمروں میں صورت حال اس کے برعکس کیوں ہے؟ ڈویل اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کئی اجڈ پسماندہ گروہ تو ننھی بچیوں کو کم سنی کے دوران کھلم کھلا اور علی الاعلان مار ڈالنے کا معمول اپناتے ہیں، شیر خوار بچیوں کو گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا ہے یا سیدھے بھلے ان کو جھاڑیوں میں بغیر کسی نگرانی کے رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر کم سن بچیوں کو مارنے کا عمل مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے اور لوگ اس سے انکار بھی کرتے ہیں کہ وہ بچیوں کو مار ڈالتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندو کسان نہیں مانتے کہ وہ اپنی گائیوں کو مار ڈالتے ہیں، جیسے بھارت میں جنسی لحاظ سے مویشیوں کا تناسب غیر متوازن ہے اسی طرح نو عمر بچیوں اور نو عمر بچوں کی شرح اموات میں اختلاف بھی بالعموم ان کی دیکھ بھال میں عدم توجہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ننھی بچیوں پر براہ راست حملوں کا نتیجہ نہیں۔ خوراک یا توجہ طلبی کے لیے بچوں کے رونے پر ماں کی طرف سے ان پر توجہ دینے میں محض معمولی سا امتیاز بھی مجموعی سطح پر پورے غیر متوازن انسانی جنسی تناسب کا سبب بن سکتا ہے۔

MashalBooks.org

صرف مہذب قوتوں کے دباؤ کی یلغار ہی سے نوعمر بچیوں کی ہلاکتوں کے معمول اور اس کے برعکس نوعمر بچوں سے ترجیحی سلوک کی وضاحت ہوسکتی ہے۔ خالصتاً علم حیاتیات کی رو سے عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ بیش قیمت اور کار آمد ہیں کیونکہ افزائش نسل کے سلسلے میں مرد فالتو اور زائد از ضرورت ہیں۔ ایک مرد سینکڑوں عورتوں کو حاملہ بنانے کے لیے کافی ہے، جبکہ صرف عورتیں ہی بچوں کو جنم دے سکتی ہیں اور عورتیں ہی انہیں دودھ پلا کر پال سکتی ہیں (ایسے معاشروں میں جہاں ماں کے دودھ کے متبادل بچوں کے لئے دودھ کی بوتلیں اور فارمولے نایاب ہیں) اگر نوعمر بچوں اور بچیوں کے خلاف کارروائی میں جنسی امتیاز ملحوظ ہو تو یہی پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ ایسی کارروائی میں نشانہ ستم بچے ہوں گے۔ لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ اس خلاف عقل حقیقت کو سمجھنے میں اور زیادہ مشکل پیش آتی ہے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ عورتیں مردوں کی کسی امداد کے بغیر از خود جسمانی اور ذہنی طور پر پیداواری اور معاشی ہر قسم کے بنیادی فرائض کی بجا آوری کی اہل ہیں۔ عورتیں ہر وہ کام سرانجام دے سکتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔ ہاں ایک فرق کے ساتھ کہ جہاں نری قوت درکار ہو وہاں شائد ان کی استعداد کار میں کچھ کمی ہوسکتی ہے۔ وہ تیر کمان کی مدد سے شکار کر سکتی ہیں، مچھلیاں پکڑ سکتی ہیں، پھندا لگا سکتی اور درخت بھی کاٹ سکتی ہیں، اگر انہیں یہ کام سکھایا جائے اور سیکھنے کی اجازت دی جائے۔ وہ بھاری وزن اٹھا سکتی ہیں اور اٹھاتی بھی ہیں، وہ کھیتوں اور باغات میں کام کر سکتی ہیں اور دنیا بھر میں کرتی بھی ہیں۔ ''مارنگ'' کی طرح کے دوسرے ایسے قبیلے بھی جن کا گزارا ''کاٹو اور جلاؤ'' طرز کی باغبانی اور زراعت پر ہے خوراک کی پیداوار میں زیادہ انحصار عورتوں پر کرتے ہیں حتیٰ کہ شکاری گروہوں مثلاً جنوبی افریقہ کی قدیمی اور اصل آبادی کی نسلوں پر مشتمل شکاریوں کی ٹولیوں میں بھی ان کی غذائی ضروریات پوری کرنے میں دو تہائی سے زائد حصہ عورتوں کی محنت و مشقت کا ہوتا ہے۔ جہاں تک ایام حیض اور حمل کے دوران میں بے آرامی کا تعلق ہے آزادی نسواں کے جدید قائدین کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ ''مسائل'' پیداواری عمل کے اوقات کار میں معمولی ردوبدل اور تبدیلیوں سے ختم ہو سکتے ہیں جنسی امتیاز پر مبنی تقسیم کار کی تکرار محض ایک حماقت ہے۔ جب تک ایک صورت پیش نہ آئے کہ ایک گروہ میں شامل سب خواتین ایک ہی وقت میں حمل کے ایک جیسے مرحلے میں ہوں اس وقت تک ایسے سب معاشی فرائض کو،

مثلاً شکار کھیلنا وغیرہ ...... جنہیں مردوں کا قدرتی استحقاق سمجھا جاتا ہے، خواتین تنہا بطریق احسن سرانجام دے سکتی ہیں۔

جنسی سرگرمیوں سے ہٹ کر واحد انسانی عمل جس میں مردوں کی مہارت ناگزیر اور لابدی ہے وہ مسلح تصادم ہے جس میں دستی ہتھیار (اسلحہ) استعمال ہوتا ہے۔ اوسطاً مرد عورتوں کی نسبت زیادہ دراز قد مضبوط رگ و ریشے اور پٹھوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مرد نیزے کو زیادہ دور تک پھینک سکتے ہیں، کمان کو زیادہ خم دے سکتے اور زیادہ بڑی برچھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مرد بھاگ بھی زیادہ تیز سکتے ہیں ...... خواہ کسی حملہ آور دشمن کی طرف ہو یا کسی شکست کھانے والے دشمن سے دور! آزادی نسواں کی کئی خواتین قائدین کے اس اصرار کی تائید کرنے سے کہ عورتوں کو بھی دستی ہتھیاروں کے ساتھ لڑنے کی تربیت دی جا سکتی ہے صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر کسی پس ماندہ اور اجڈ نے کبھی مردوں کی بجائے عورتوں کو اپنے عسکری ماہر کے طور پر تربیت دی ہوتی تو اس نے فاش غلطی کی ہوتی۔ اس گروہ نے یقیناً خودکشی کا ارتکاب کیا ہوتا کیونکہ کرہ ارض کے کسی بھی حصے سے ایسے کسی مستند واقعے کی مثال نہیں ملتی۔

جنگ میں کسی قبیلے کی بقا کے سلسلے میں مردوں اور عورتوں کی اہمیت کی ترتیب الٹ جاتی ہے۔ جنگ کے لیے تیار بالغ مردوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافے کو پرکشش بنانے کے لیے پسماندہ معاشرے عورتوں کی پرورش اور دیکھ بھال کو جنگ کے سبب سے محدود کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دراصل یہی وہ وجہ ہے اور جنگ بذات خود نہیں جس کے باعث جنگ آبادی کو قابو میں رکھنے کا ایک مؤثر ذریعہ بنتی ہے۔ ''مارنگ'' کو معلوم ہے کہ ''اسلاف'' ان کی مدد کو آتے ہیں جو لڑائی میں جوانوں کی کثیر تعداد کو جھونک کر اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اس نظریے کا حامی ہوں کہ رسوم و رواج کا پورا چکر ان کے اسلاف کی طرف سے ایک چالاکی اور شعبدہ بازی ہے جس کا مقصد ''مارنگ'' قبیلوں کو عورتوں کی بجائے سؤروں اور مردوں کی افزائش نسل کی ترغیب دینا ہے تاکہ جنگلات کی حفاظت ہو سکے۔

ان حقیقی وجوہات کا مزید کھوج لگانے کے سلسلے میں جو پرانی طرز کی بھونڈی نوعیت والی جنگ کا سبب بنتی ہیں مجھے اب بھی اس سوال کا سامنا ہے کہ مقامی گروہوں کی آبادی کو ''برداشت کی استعداد'' سے نچلی سطح پر رکھنے کے لیے کمتر تشدد کے حامل ذرائع

کیوں نہیں استعمال کئے جاتے۔ مثال کے طور پر کیا ''سمباگا'' کے حق میں یہ زیادہ مفید اور ان کے ''مسکن'' کے لیے بھی زیادہ سودمند نہ ہوتا اگر وہ اپنی آبادی پر ضبط تولید کے طریقوں سے قابو پاتے۔ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اٹھارویں صدی میں مانع حمل خول کی ایجاد سے پہلے حمل روکنے کی کوئی محفوظ فرحت بخش اور مؤثر ترکیب کہیں موجود نہیں تھی۔ نوعمر بچوں کو مارڈالنے کے علاوہ آبادی کے کنٹرول کا بہ رضا و رغبت مؤثر ترین ذریعہ اسقاط حمل تھا۔ بہت سی پسماندہ قومیں زہریلی دواؤں کے ایسے نسخوں سے واقف ہیں جن سے اسقاط حمل کو آسان بنایا جا رہا ہے۔ کئی دوسرے حاملہ عورت کو کپڑے کی ایک مضبوطی سے کسی ہوئی پٹی پیٹ کے نیچے باندھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ جب باقی سب تدبیریں ناکام ہوجائیں تو حاملہ عورت پشت کے بل لیٹ جاتی ہے اور اس کا کوئی خیر خواہ دوست پوری قوت سے اس کے شکم پر اچھلتا کودتا ہے یہ ترکیبیں خاصی حد تک مؤثر ہیں لیکن ان کے ضمنی ناخوشگوار نتائج اور اثرات میں بننے والی ماں کی موت بھی شامل ہے اور جتنے حمل گرائے جاتے ہیں یہ اموات گنتی میں ان سے ذرا ہی کم ہوتی ہیں۔

مانع حمل اور اسقاط حمل کے کسی مؤثر اور محفوظ ذریعے کی کمیابی کے باعث، پس ماندہ قوموں کو آبادی پر کنٹرول کا مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنے وضع کئے ہوئے قاعدے کے مطابق اپنی کوششوں کا رخ زندہ لوگوں کی طرف موڑنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کوششوں کی زد میں بچے آتے ہیں، بچے جتنے کم عمر ہوں اتنے ہی اس مقصد کے لیے موزوں ہوتے ہیں، اس لیے کہ پہلے تو وہ کوئی مزاحمت نہیں کر سکتے، دوسرے ان پر سماجی یا مادی لحاظ سے کمتر لاگت اور خرچ ہوا ہوتا ہے۔ نوعمر بچوں کے ساتھ جذباتی بندھن، لگاؤ اور تعلق خاطر کا منقطع ہونا بڑی عمر کے لوگوں کے مابین ایسا ہونے کی نسبت آسان تر ہے۔

اگر کوئی میرے استدلال کو بد اخلاقی اور غیر مہذب سمجھتا ہے تو اسے اٹھارویں صدی کے انگلستان کے بارے میں پڑھنا چاہیے۔ شراب کے نشے میں دھت ہزاروں عورتیں باقاعدگی سے اپنے نومولود بچوں کو دریائے ٹیمز میں پھینک دیتی تھیں، یا چیچک زدہ لوگوں کے لباس میں لپیٹ کر کوڑا کرکٹ کے ڈرموں میں چھوڑ جاتی تھیں۔ نشے سے مخمور اور مدہوشی کے عالم میں ان کے دھڑ کے اوپر والے حصے کو لپیٹ کر ان کے نیچے گرا دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی اپنے ننھے بچوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے کئی براہ راست یا بالواسطہ ترکیبوں کا سہارا

لیتی تھیں۔ ہمارے اپنے موجودہ دور میں بھی ہمیں صرف ناقابل یقین حد تک اپنی پارسائی کا زعم ہے جو یہ تسلیم کرنے میں مانع ہے کہ کم ترقی یافتہ قوموں میں اب بھی نوعمر بچوں کے قتل کا معمول وسیع پیمانے پر جاری ہے، جہاں نومولود بچوں کو پیدائش کے پہلے سال کے دوران میں ہلاک کر دینے کی شرح ایک ہزار میں دوسو پچاس تک عام ہے۔

''مارنگ'' ایک بدتر صورت حال کو جو مانع حمل ذرائع اور ابتدائی مرحلے پر اسقاط حمل کے مؤثر طریقوں کے وجود میں آنے سے قبل بنی نوع انسان کا عالمگیر سطح پر مقدر تھی ...... اپنے حق میں بہترین بناتے ہیں۔ وہ نوعمر بچیوں کی موت کو نوعمر بچوں کی موت سے زیادہ تناسب میں گوارا کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ اگر نوعمر بچے بھی اس ضرورت کی بھینٹ چڑھ جائے تو آبادی پر کنٹرول کے لیے کئی نرینہ نوعمر بچے بھی اس ضرورت کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ جنگ کی وجہ سے ہی نرینہ ننھے بچوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں پرورش سود مند ہے وہاں مادہ بچوں کے مقابلے میں ان کی شرح اموات بھی کم ہے۔ اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ ہی وہ قیمت ہے جو پسماندہ معاشروں کو نرینہ اولاد کی پرورش کے لیے ادا کرنی پڑتی ہے جب وہ مادہ اولاد کو پالنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

پرانی طرز کی جنگ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ اس مطابقت پذیر حکمت عملی کا حصہ ہے جو مخصوص ٹیکنیکی حالات، آبادی کی ضروریات اور ماحولیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں مسلح لڑائی اتنی عام کیوں رہی ہے ہمیں اسے جبلتی اثرات پر محمول نہیں کرنا چاہیے اور نہ بے جواز تلون مزاجی پر مبنی محرکات کے تصورات سے منسوب کرنا چاہیے۔ اس صورت حال میں ہمیں یہ امید رکھنے کا ہر طرح سے حق ہے کہ جب انسانیت جنگ سے ممکنہ فوائد سمیٹنے کی بجائے اس کے نقصانات سے زیادہ متاثر ہوگی تو متحارب گروہوں کے درمیان تنازعات کو سلجھانے کے دوسرے ذرائع جنگ کی جگہ لیں گے۔

وحشی مرد

مردوں کی برتری کی ایک شہادت تو مادہ اولادوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے سے ملتی ہے، میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مردوں کی برتری کے دوسرے مظاہر کا تعلق بھی مسلح تصادم کی ہنگامی ضروریات سے ہے۔

نوع انسانی کی منفی درجہ بندی کو بیان کرنے کے لیے ہمیں پھر ان نظریات میں سے کسی ایک قسم کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اول وہ نظریات جو نا قابل تغیر جبلتوں اور تحریکوں پر زور دیتے ہیں اور دوم وہ جو تغیر پذیر دنیاوی حالات سے ہم آہنگ معاشرتی موافقت کے متقاضی ہوں۔ میں آزادی نسواں کے اس نقطۂ نظر کا حامی ہوں کہ ''جسمانی ساخت (پیدائشی جنسی غیر مشابہت) پر مقدر کا انحصار نہیں۔ یہ تقدیر کا فیصلہ نہیں کرتی۔'' جس کا مطلب یہ ہے کہ پیدائشی جنسی عدم موافقت کا مردوں اور عورتوں کے درمیان گھریلو معاشی اور سیاسی دائروں میں حقوق اور اختیارات سے کوئی تعلق نہیں اور نہ غیر مساوی تقسیم کا کوئی جواز ہے۔ آزادی نسواں کے علمبردار اس حقیقت سے منکر نہیں کہ خصیوں کی بجائے بچہ دانیوں کی ملکیت سے لازمی طور پر زندگی میں مختلف قسم کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ جس بات سے وہ انکار کرتے ہیں وہ یہ تصور اور سوچ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی جسمانی فطرت (بناوٹ) جنسی، معاشی اور سیاسی حقوق کا عورتوں سے زیادہ حصہ آتا ہے۔

بچوں کو جنم دینے اور اس سے متعلقہ دوسری جنسی خصوصیات سے ہٹ کر دیگر سماجی ذمہ داریوں کی جنسی بنیاد پر تقسیم ان کے درمیان جسمانی ساخت میں کسی فرق کا خود بخود نکلنے والا ناگزیر نتیجہ نہیں۔ انسانی بناوٹ اور انسانی حیاتیات سے متعلق علم رکھنے والا کوئی شخص عورتوں کو معاشرتی لحاظ سے ادنیٰ جنس ٹھہرانے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ ایسا کیوں ہے؟

MashalBooks.org

اس لئے کہ حیوانات کی دنیا میں انسان کی ذات منفرد اور بے مثال ہے، جس کی وجہ اس کے موروثی جسمانی ساز و سامان اور اس کی بقا اور دفاع کے ذرائع کے مابین ربط و ضبط کی کمی ہے۔ ہم دنیا کی خطرناک ترین مخلوق ہیں ...... اس لئے نہیں کہ ہمارے دانت بڑے بڑے، پنجے تیز ترین، ڈنگ زہر سے بھرپور یا کھال انتہائی موٹی اور دبیز ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ ہم خود کو ایسے مہلک ہتھیاروں اور اسلحہ سے لیس اور آراستہ کر سکتے ہیں جو دانتوں، پنجوں، ڈنگوں اور کھال کے فرائض جسمانی صلاحیتوں کی نسبت زیادہ مؤثر طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ حیاتیاتی مطابقت کے لیے ہمارا لازمی ذریعہ ہمارا تمدن ہے، ہماری جسمانی ساخت نہیں۔ صرف اس بنا پر کہ مرد عورتوں سے زیادہ دراز قد اور بھاری بھرکم ہوتے ہیں یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ عورتوں پر غالب ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے نسل انسانی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ جانوروں اور گھوڑوں کی محکوم ہو...... ایسے جانوروں کی محکوم جو ایک اوسط درجے کا خاوند وزن میں اپنی بیوی سے جتنا بھاری ہوتا ہے اس فرق سے 30 گنا زیادہ بھاری ہو۔ انسانی معاشروں میں جنسی غلبے کا انحصار اس پر نہیں کہ کون سی صنف (مرد یا عورت) بڑی یا حق طلبی پر زیادہ مصر ہے بلکہ اس پر ہے کہ کون سی جنس دفاع اور جارحیت کے فن کو کنٹرول کرتی ہے۔

اگر مجھے اجسام و ابدان اور معاشرتی حالتوں سے متعلق علوم پر عبور ہوتا تو میں یہ پیشگوئی کرتا کہ مردوں کی بجائے عورتوں میں دفاع اور جارحیت کے ہنر پر دسترس حاصل کرنے کا زیادہ امکان ہے اور اگر ایک صنف دوسری صنف کو اپنے زیر اثر اور اپنا تابع رکھنا چاہے تو یہ فوقیت مردوں پر عورتوں کو حاصل ہوگی۔ جہاں میں دونوں جنسوں کے درمیان طبعی طور پر ان کے جسمانی اختلاف...... یعنی مردوں کا عورتوں کی نسبت قد و قامت، وزن اور قوت (بالخصوص دستی ہتھیاروں کے سلسلے میں) زیادہ ہونے سے متاثر ہوں وہاں عورتوں کی یہ خاصیت جو مردوں میں نہیں میرے زیادہ ذہن نشین ہے کہ عورتیں بچوں کی پیدائش، ان کی دیکھ بھال اور انہیں دودھ پلانے کی اہل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عورتیں نئی پود کی پرورش اور نگہداشت کو کنٹرول کرتی ہیں اور چونکہ وہ نئی پود کی نگہداشت کرتی ہیں اس لئے ان کے پاس گنجائش ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ایسے معمول میں اصلاح لا سکیں جو ان کے لئے خطرہ ہو۔ یہ ان کے اختیار میں ہے کہ نومولود بچوں سے اپنی حسب منشا بے اعتنائی کے ذریعے جنسی تناسب کو نرینہ کے مقابلے میں بھاری مادہ اکثریت سے بدل دیں۔ عورتیں یہ

MashalBooks.org

بھی کر سکتی ہیں کہ اپنی چھوٹی نرینہ اولادوں کو بہادر اور جری جواں مرد نوجوان بننے کی صلاحیتوں سے محروم رکھنے کے لیے انہیں چھوٹی عمر ہی میں پھرتیلا تندوتیز اور ہوشیار بنانے کی بجائے غیر متحرک، ست الوجود، کاہل اور بے کار رہنے دیں۔ ایسا وہ صلہ وستائش کے لالچ سے بہلا پھسلا کر کر سکتی ہیں۔ مجھے عورتوں سے یہ توقع ہے کہ وہ نرینہ کی بجائے مادہ اولادوں کو نڈر بے خوف اور جارح بنانے کے لیے اپنی کوششیں صرف کریں گی۔ اور میں یہ مزید توقع بھی رکھتا ہوں کہ ہر نسل کی محدود تعداد میں زندہ رہنے والے مرد شرمیلے، فرماں بردار، محنتی اور جنسی تعلقات کے ضمن میں ''نظرِ عنایت'' پر ممنون بھی ہوں گے۔ میری یہ پیشگوئی ہے کہ مقامی گروہوں کی سربراہی پر عورتوں کو اجارہ داری حاصل ہوگی۔ ''دشمن'' مذہب کے عقیدے کے مطابق بدروحوں کے اثرات کو دور کرنے یا قابو میں رکھنے کے لیے ان مافوق الفطرت جناتی وجودوں سے تعلق کے ضمن میں پادری کے فرائض بھی عورتیں سرانجام دیں گی اور خدا کے لیے مونث کا صیغہ استعمال ہوگا۔ اور آخر میں یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ ایک مثالی اور سب سے زیادہ رعب داب کی حامل شادی کی وہ قسم ہوگی جس میں ایک عورت کے بیک وقت ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں یعنی ایک عورت کئی مردوں کی جنسی اور معاشی خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔

نسوانی غلبے سے مشروط اس طرز کے معاشرتی نظاموں کا نظریہ پیش کرنے والوں نے انیسویں صدی کے دوران میں بنی نوع انسان کے لیے نسوانی برتری کے اصول کو بنیاد بنایا۔ مثال کے طور پر فریڈرک اینگلز کو جس نے اپنے خیالات امریکی ماہر انسانیات ہنری مارگن سے مستعار لئے، یقین تھا کہ جدید معاشرے ایک ایسے مرحلے سے گزرے ہیں جس میں سلسلہ حسب ونسب کا تعلق بلاشرکت غیرے عورت کے شجرے کی لڑی سے ہوتا تھا اور عورتیں ہی سیاسی لحاظ سے مردوں پر غالب تھیں۔

جدید دور کی آزادی نسواں کی حمایتی کئی خواتین بھی اس تصور اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر یقین رکھتی ہیں۔ وہ اس مفروضے پر قائم ہیں کہ ان کے مغلوب مردوں نے باہمی اتحاد کر لیا اور مل کر قبیلے یا خاندان کی نسوانی سربراہی کے نظام کو الٹ دیا۔ ان سے ہتھیار چھین لئے اور اس وقت سے متواتر عورتوں کے استحصال اور انہیں بے وقعت کرنے کی سازش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ خواتین جو اس تجزیے سے متفق ہیں ان کی

MashalBooks.org

پختہ رائے ہے کہ مردوں اور عورتوں کی طاقت اور اختیارات میں توازن کو صرف ایک ایسی فوجی جوابی سازش کے ذریعے ہی درست کیا جا سکتا ہے جو دونوں جنسوں کے درمیان گوریلا طرز کی جنگ ہو۔

اس نظریے میں ایک خامی ہے۔ آج تک اس موقف کی ایسے کسی مستند واقعہ سے تصدیق نہیں ہوسکی جس سے قبیلوں اور خاندانوں پر صحیح معنوں میں عورتوں کی سربراہی ثابت ہوتی ہے۔ ایسے کسی مرحلے کی واحد شہادت ایمیزون کے قبیلوں سے متعلق قدیم فرضی کہانیوں کے علاوہ یہ ہے کہ دنیا کے 10 سے 15 فیصد معاشرے اپنے خونی رشتے اور حسب ونسب کا سلسلہ خالصتاً عورتوں سے جوڑتے ہیں۔ لیکن وراثت کا سلسلہ عورتوں کے توسط سے تلاش کرنے کا مطلب ''مادری شجرہ'' تو ہے عورت کی سربراہی نہیں۔ گو کہ خونی رشتوں کے شمار میں مادری شجرہ کی شمالیت سے عورتوں کی حیثیت بہتری کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن قباحت یہ ہے کہ اس سے عورت کی سربراہی سے متعلق بڑے اور اہم پہلو موجود نہیں۔ عورتیں نہیں بلکہ مرد نئی خانگی، معاشی اور مذہبی زندگی میں چھائے ہوئے ہیں اور یہ بھی عورتوں کی بجائے مرد ہی ہیں جنہیں کئی گھرانوں میں میاں یا بیوی تک فوری رسائی کی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ والد گھرانے کے اندر اختیارات کا بڑا حامل نہیں تو ماں بھی اسی طرح نہیں۔ ایسے گھرانوں میں جہاں شجرہ نسب مادری پشتوں سے منسلک ہوتا ہے وہاں اختیارات کی مالک شخصیت پھر ایک اور مرد ہی ہوتا ہے یعنی ماں کا بھائی (ماموں) یا نانی کا بھائی یا نانی کی بہن کا بھائی۔

جنگوں کی کثرت کے باعث مادری شجرہ نسب کی پیش گوئی جن اصولوں پر کی جاتی ہے وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ عورتیں نظریاتی طور پر مردوں کو جنہیں انہوں نے خود پال پوس کر جوان کیا ہوتا ہے زیر کرنے بلکہ مطیع کرنے کی اہل ہیں۔ لیکن ایسے مردوں کی طرف سے جو کسی دوسرے گاؤں یا برادری میں پیدا ہوئے ہوں ایک مختلف قسم کا چیلنج درپیش ہوتا ہے۔ جونہی مردوں کو کسی بھی وجہ سے برادریوں کے مابین تنازعوں اور جھگڑوں کے بوجھ کا سامنا شروع ہوتا ہے تو عورتوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ خود اپنی اولاد زینہ کی تندخوئی سے متصف اس کی بڑی تعداد کو پالیں پوسیں اور جوان بنائیں۔

مردوں کی برتری ایک تولیدی نظام میں ایک مثبت اور حوصلہ افزاء ردعمل کا حامل

معاملہ ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک کج روی یا انحراف کو طول دینے کا عمل۔ مرد جتنے زیادہ آتش مزاج اور خونخوار ہوں، جنگ و جدل میں اتنی فراوانی آتی ہے اور ایسے مردوں کی اتنی ہی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ مرد جتنے زیادہ خونخوار ہوں جنسی بھوک میں وہ اتنے ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اور ایک وقت میں کئی بیویاں رکھنے کا رجحان بڑھتا ہے۔ یعنی ایک مرد کا کئی عورتوں پر قبضہ۔ اس رجحان کا اپنی جگہ نتیجہ عورتوں کی کمی میں شدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور کمتر حیثیت کے مردوں میں مایوسی بڑھتی ہے اور جنگ میں شمولیت کی ترغیب میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ایک دردناک عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ جب عورتوں کی تذلیل اور ہتک روا رکھی جاتی ہے اور ان کو نوعمری میں ہی مار ڈالا جاتا ہے۔ اس وجہ سے مردوں کا جنگ میں جانا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ وہ بیویوں پر اپنا قبضہ جما سکیں اور یوں آتش مزاج مردوں کی تعداد بڑھانے کا ذریعہ بنیں۔

مردوں کی نامعقول حد تک خود پسندی اور احساس برتری اور جنگ و جدل کے مابین تعلق کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مخصوص قدیم قبیلے کے جنسی جذبات کے پیکر عسکری گروہ کی طرز زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ میں نے اس مقصد کے لیے 10,000 (دس ہزار) آبادی والے ریڈ انڈینز امریکیوں کے قبائلی لوگوں ''یانومامو'' کو چنا ہے۔ جو برازیل اور وینیز ویلا کی سرحد پر آباد ہیں۔ ''یانومامو'' قبائیلیوں کو ان سے متعلق بڑے نسلی جغرافیہ نگار، پنسلوینیا یونیورسٹی کے پروفیسر نپولین شیگنان نے وحشی لوگ قرار دیا ہے۔ وہ سب تبصرہ نگار جن کا ان سے رابطہ ہوا اس پر متفق ہیں کہ وہ انتہائی لڑاکے، جارحیت پسند، جنگجو اور مردوں کے غلبے اور تسلط کے زیر اثر معاشروں میں سے ایک ہے۔

کسی بھی مثالی ''یانومامو'' کے سن بلوغت کو پہنچنے تک وہ لاتعداد جھگڑوں دو بدو لڑائیوں اور عسکری حملوں میں آنے والے زخموں اور زخموں کے نشانات سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ عورتوں کے تحقیر و تذلیل میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے، پھر بھی ''یانومامو'' مرد ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑے اور گالم گلوچ میں لگے رہتے ہیں۔ وجہ بدکاری کے حقیقی یا فرضی مبینہ واقعات اور بیویوں کی فراہمی سے متعلق وعدہ شکنیاں ہوتی ہیں۔ ''یانومامو'' عورتیں بھی زخموں اور مکوں کے نشانات سے چکنا چور ہوتی ہیں جو اکثر صورتوں میں اس تشدد کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ان پر زناکار اغوا کنندگان اور خاوندوں کی طرف سے روا رکھا جاتا

MashalBooks.org

ہے۔کوئی ''یانومامو'' بیوی اپنے مثالی بدمزاج، غصیلے، زودرنج اور نشہ باز جنگجو خاوند کی ظالمانہ نگرانی اور نگہبانی سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔سب ''یانومامو'' خاوندوں کا اپنی بیویوں سے برتاؤ ناروا اور درشت ہوتا ہے۔خاوند اگر مہربان ہوں تو صرف گھونسوں اور اعضاء کاٹنے پر اکتفا کرتے ہیں جبکہ خونخوار ہوں تو مجروح کر کے مار ڈالتے ہیں۔

اپنی بیوی پر جارحیت کا ایک پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے کانوں کے چھیدوں میں جو بانس کی ڈنڈیاں سی لٹکاتی ہیں انہیں جھٹکے دے کر کھینچتے ہیں۔خاوند زیادہ مشتعل ہو تو وہ کانوں کے چھیدوں کو پورا چیر کر کھول بھی دیتا ہے۔شیگنان نے ایک جگہ دیکھا کہ اپنی بیوی پر بدکاری کا شبہ ہونے کی بنا پر ایک شخص نے اس کے دونوں کان کاٹ دیئے،۔پڑوس کے ایک اور گاؤں میں ایک خاوند نے اپنی بیوی کے بازو سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا۔مرد اپنی عورتوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی اور ان کے مہمانوں کی ہر طرح سے خدمت کریں اور ان کے سب احکام بغیر کسی تاخیر اور احتجاج کے بلا چوں و چراں بجا لائیں۔اگر کوئی بیوی تعمیل حکم نہیں کرتی تو اس کا خاوند اس کی درگت ایک جلتی ہوئی لکڑی سے بناتا ہے، اس پر خنجر سے حملہ آور ہوتا ہے یا ایک جلتی ہوئی لکڑی اس ے بازو پر رکھ دیتا ہے۔اگر وہ بہت خفا ہو تو بیوی کی پنڈلی یا کولہے پر اخاردار (کانٹوں والا) نوکیلا تیر چلا دیتا ہے۔شیگنان کے بیان کئے گئے ایک واقعے میں تیر کا رخ پھر جانے کی وجہ سے وہ عورت کے معدے میں جالگا اور وہ موت سے بال بال بچی۔''پارور یوا'' نام کا ایک شخص جب بیوی سے ناراض ہو کر اس باعث طیش میں آیا کہ وہ اس کی خواہش سے کم رفتار پر اس کے ساتھ چل رہی تھی تو اس نے کلہاری نکالی اور اس پر حملہ کیا۔وہ پھرتی سے نیچے کو جھکی اور چیختی ہوئی بھاگ نکلی۔''پارور یوا'' نے کلہاڑی اس کے پیچھے پھینکی جو سنسناہٹ کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر گئی۔تب اس نے ایک چھرا لے کر اس کا پیچھا کیا اور پیشتر اس کے کہ گاؤں کا سربراہ مداخلت کرتا اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔

عورتوں کی طرف سے کوئی اشتعال دلائے بغیر بھی ان پر تشدد عام ہے۔شیگنان کے خیال میں اس کی وجہ مردوں کا ایک دوسرے پر یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ وہ مہلک حملے کرنے کے اہل ہیں۔کوئی شخص اگر برسر عام بیوی کو برچھی سے مارتا ہے تو اس سے اس کی ''شخصیت سازی'' میں مدد ملتی ہے۔عورتوں کی نہایت آسانی سے کسی دوسرے کی جگہ قربانی

کے بکرے کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک شخص نے جو دراصل اپنے غصے کا اظہار اپنے بھائی پر کرنا چاہتا تھا، اس کی بجائے اپنی بیوی پر تیر برسا کر اسے مار ڈالا۔ اس نے نشانہ تو کسی غیر اہم عضو کا باندھا لیکن تیر غلط جگہ لگنے سے وہ مرگئی۔

ایسی عورتوں کو اپنے مرد خونی رشتہ داروں سے محدود سا تحفظ ملتا ہے جو اپنے خاوندوں کے نرغے سے نکل کر بھاگ جائیں۔ شادیاں وٹے سٹے کی بنیاد پر ہوتی ہیں جس میں ایک مرد اپنی بہن کو بدلے میں دے کر دوسرے کی بہن سے شادی کرتا ہے۔ کسی بھی شخص کا برادر نسبتی اس کا معتمدترین رشتہ دار اور ساتھی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی صحبت میں کافی وقت گزارتے ہیں، اس دوران میں وہ ایک دوسرے کے نتھنوں میں ایسی نشہ آور دوائی کا سفوف پھونکتے ہیں جس کے زیر اثر انہیں طرح طرح کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں اور ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کا دراصل کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی جھولنے والے پلنگ پر اکٹھے سوتے ہیں۔ شیگنان نے ایک واقعہ بیان کیا ہے، کہ خاوند سے بھاگ جانے والی ایک عورت کا بھائی اپنی بہن سے اتنا برہم ہوا کہ اس پر اپنی کلہاڑی چلا دی۔ وجہ اپنے بہنوئی سے دوستانہ تعلقات میں ''خلل'' پڑتا تھی۔

''یانومامو'' قبیلے میں مردوں کی برتری کا ایک اہم پہلو نشہ آورادویات کے استعمال پر ان (مردوں) کی اجارہ داری ہے۔ ان میں سب سے زیادہ عام دوائی ''اینی'' ہے جو ایک جنگلی پودے کی بیل سے کشید کی جاتی ہے۔ ان نشہ آور ادویات کے استعمال سے مرد مافوق الفطرت نظارے دیکھتے ہیں جن سے عورتیں محروم رہتی ہیں۔ ان نظاروں کو دیکھنے سے وہ ''دشمن'' مذہب کے اعتقاد کے مطابق ''مرد شمن'' بن جاتے ہیں، یعنی مافوق الفطرت جناتی وجود سے اپنے تعلق کے ذریعے پادری کا روپ دھار کر بد روحوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ ''اینی'' کے سفوف کو سانس کھینچ کر استعمال کرنے سے وہ درد کی انتہائی شدت کو بھی محسوس نہیں کرتے۔ لڑائی اور حملوں کے دوران میں ہر قسم کے خوف سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔ سینے پر گھونسہ بازی اور سر پر سوٹے بازی کے مقابلوں کے دوران میں (جن کا ذکر میں ایک لمحہ بعد کروں گا) درد اور تکلیف سے بظاہر بے نیازی اور بے اعتنائی کے اظہار کی وجہ غالباً اس دوائی کے ضمنی اثرات ہوتے ہیں۔ نشے میں پوری طرح دھت ہونے سے قبل ان لوگوں کی بھیانک مدہوشی کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ وہ عجیب وغریب طرح

سے غراتے اور بڑبڑا کر شور مچاتے ہیں، ان کی ناک سے سبز غلاظت بہہ رہی ہوتی ہے، وہ پاؤں اور ہاتھوں کے بل چلتے اور نظر نہ آنے والی ''بدروحوں'' سے گفتگو کرتے ہیں۔

''یانومامؤ'' اپنی مردانہ فضیلت کو یہودی عیسائیوں کی روایات کی طرح اپنی پیدائش کی ابتدا سے متعلق مفروضات اور تصورات سے صحیح ثابت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آغاز کائنات پر دنیا میں صرف خونخوار مرد ہی تھے جو چاند کے خون سے بنے ہوئے تھے۔ ان ابتدائی مردوں میں سے ''کانا براما'' نامی ایک مرد کی ٹانگیں حاملہ ہوگئیں۔ اس کی بائیں ٹانگ سے ایک عورت نے جنم لیا اور دائیں ٹانگ سے نسواں صفت مرد برآمد ہوئے یعنی وہ ''یانومامؤ'' جو ''دوبدو'' لڑائی کے خلاف ہیں اور جنگ میں بزدل ثابت ہوتے ہیں۔

ایسے دوسرے معاشروں کی طرح جن میں مرد حاوی ہوتے ہیں ''یانومامؤ'' کے خیال میں حیض (ماہواری) کا خون برائی ہے اور خطرناک بھی۔ جب کسی لڑکی کو پہلی دفعہ ماہواری آنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اسے خاص طور پر بنائے گئے بانس کے پنجرے میں بند کر کے مقفول کر دیا جاتا ہے اور خوراک کھائے بغیر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر ماہواری کے ایام میں اسے علیحدہ رکھ کر گھر میں کسی سائے تلے تنہائی میں دوزانو ہو کر بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔

''یانومامؤ'' عورتوں کو ان کے بچپن کے آغاز ہی سے نشانہ ستم بنایا جاتا ہے جب کسی لڑکی کا چھوٹا بھائی اسے مارتا ہے اور جواب میں وہ بھی اسے مارتی ہے تو لڑکی کو اس گستاخی کی سزا دی جاتی ہے، تاہم چھوٹے لڑکوں کو خواہ وہ کسی کو بھی ماریں کبھی سزا نہیں دی جاتی۔ ''یانومامؤ'' باپ کو اگر اس کا چار سالہ بیٹا ناراضی میں اس کے منہ پر تھپڑ لگائے تو وہ خوشی کے مارے چیخنے لگتا ہے۔

میں نے اس امکان پر غور کیا ہے کہ ''یانومامؤ'' کی دونوں صنفوں کے کردار سے متعلق شیگنان نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں شاید کسی حد تک نسل نگار کے اپنے مردانہ تعصب کا دخل ہو۔ خوش قسمتی سے ''یانومامؤ'' پر ایک خاتون نے بھی تحقیق کی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کی پروفیسر جوڈتھ شیپر و نے بھی ''یانومامؤ'' عورتوں کے بنیادی طور پر غیر فعال اور جامد کردار کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے وہ بیان کرتی ہے کہ جہاں تک شادی کا تعلق ہے تو یہ بات قطعی ہے کہ مرد ''ادلہ بدلہ'' کرتے ہیں اور عورتیں ایک دوسرے کے بدلے میں دی

اور لی جاتی ہیں۔''یانومامو' کے ہاں شادی کے لئے جو اصطلاح مستعمل ہے اس کا ترجمہ جو ڈتھ شیپر و نے ''کسی شے کو پرے دھکیلنا'' کیا ہے اور طلاق کے لیے کسی چیز کو''پرے پھینکنا''۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ آٹھ یا نو سال کی عمر میں لڑکیاں اپنے خاوندوں کی خدمت شروع کر دیتی ہیں۔ وہ ان کے قریب ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے چلتی ہیں اور ان کے لیے کھانا پکاتی ہیں یہاں تک کہ کوئی مرد اپنی آٹھ سالہ دلہن سے مباشرت کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ڈاکٹر شیپر و نے کئی خوفناک مناظر بھی دیکھے ہیں جن میں چھوٹی بچیاں اپنے قریبی خونی رشتہ داروں سے فریاد کرتی ہیں کہ ان کے منسوب خاوندوں سے ان کی گلو خلاصی کرائیں۔ ایک واقعے میں ہچکچاہٹ اور اعتراض کرنے والی دلہن کے دونوں بازو بغلوں سے باہر نکل آئے جب اس کے اپنے رشتہ داروں نے انہیں ایک طرف کھینچا اور خاوند کے رشتہ داروں نے دوسری طرف۔

شیگنان بیان کرتے ہیں کہ''یانومامو' بیویاں اپنے خاوندوں کے اپنے ساتھ برے سلوک کی ہر دم متوقع رہتی اور وہ خاوند کی نظروں میں اپنی وقعت کا اندازہ خاوندوں کی طرف سے معمولی پٹائیوں کی کثرت تعداد سے کرتی ہیں۔ ایک دفعہ دو عورتوں کی آواز انہوں نے سن لی جو اپنے سروں پر لگنے والی چوٹوں پر گفتگو کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ دوسری کا خاوند درحقیقت اس کی کتنی زیادہ دیکھ بھال کرتا ہوگا کہ وہ اکثر و بیشتر اسے سر پر ہی مارتا ہے۔ ڈاکٹر شیپر و اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ گھونسوں اور زخموں کے نشانات سے خالی سراپا''یانومامو' خواتین کے لیے تشویش کا موجب تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اس ضمن میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا کہ''جن مردوں سے میرا رابطہ رہا انہوں نے درحقیقت میری دیکھ بھال اچھی طرح سے نہیں کی۔'' اس پس منظر میں گو کہ ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ''یانومامو' عورتیں اپنی پٹائی کی خواہش مند ہوتی ہیں لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی پٹائی کی توقع رکھتی ہیں۔ وہ کسی ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتیں جس میں مرد کمتر درجے کے حیوان صفت ہوں۔

''یانومامو' قبیلے کے مردوں کی برتری اور فضیلت میں مخصوص قسم کی شدت سے متعلق ان کی ہم خیالی اور فکری ہم آہنگی کا بہترین اظہار ان کی دو بدو لڑائیوں کے مقابلوں میں ہوتا ہے جن میں مدمقابل دو آدمی ایک دوسرے کو قوت برداشت کی حد تک زخمی کرتے

ہیں اس کا مرغوب طریقہ چھاتی پر مسلسل گھونسے بازی سے ضربیں لگا کر ایک دوسرے کو مضروب کرنا ہے۔

ذرا چشم تصور سے اس منظر کو دیکھئے۔ شر انگیزی پر آمادہ شور وغل مچاتے لوگوں کا ایک مجمع ہے۔ ان لوگوں کے جسموں پر سرخ و سیاہ نقش ونگار ہیں، بالوں پر گوند سے پرندوں کے سفید پر چپکائے ہوئے ہیں اور آلہ تناسل رسی کی مدد سے سیدھے اوپر کے رخ پیٹ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے تیر کمانوں، کلہاڑیوں، سوٹوں اور چھروں کو فضا میں لہراتے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے کو دھمکائیں تو ان ہتھیاروں کو زور و شور سے کھڑ کھڑاتے ہیں۔ یہ لوگ مہمانوں اور میزبانوں کی حیثیت سے منقسم ''یانومامو'' کے ایک گاؤں کے مرکزی میدان میں اکٹھے ہوئے ہیں جنہیں میدان سے ذرا پیچھے ہٹ کر وسیع دائرہ نما رہائش گاہوں میں چھجوں کے نیچے کھڑی ان کی عورتیں اور بچے متفکر انداز میں دیکھ رہے ہیں۔ میزبان بخیل اور کنجوس ہیں اور انہوں نے سب سے اچھی خوراک اپنے لئے رکھ چھوڑی ہے۔ جب مہمانوں کو ان کے الوداعی تحفے بھی دیے جا چکے ہیں تو اب تک وہ اپنے گھروں کو واپس کیوں نہیں گئے؟ اس تکرار کے بعد ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہیں چھاتیوں پر گھونسے بازی کے دو بدو مقابلوں کا چیلنج دیتے ہیں۔

میزبانوں کے گاؤں کا ایک آدمی (جنگجو) آگے بڑھ کر میدان کے وسط میں آجاتا ہے۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دیتا ہے، اپنے ہاتھ اپنی پشت پر رکھتا ہے اور اپنی چھاتی کو مخالف گروپ کی طرف جھکاتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی مہمانوں میں سے بھی آگے بڑھ کر اکھاڑے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخالف (مدمقابل) کو خاموشی سے دیکھتا ہے اور اس سے اس کے بدن کا رخ تبدیل کراتا ہے۔ وہ اپنے مدمقابل کے دائیں بازو کو اس طرح خم دیتا ہے کہ وہ سر پر ٹک جاتا ہے، پھر اس کے جسمانی رخ کے نئے زاویے کو پرکھتا ہے اور آخری ترتیب دیتا ہے اپنے مخالف کو مناسب مقام پر لا کر مہمان خود کو اس سے اپنے بازو کی لمبائی کے برابر فاصلے پر رکھتا ہے، اس طرح کہ پاؤں کی انگلیاں سخت زمین پر مضبوطی سے جمی رہیں وہ کئی دفعہ آگے بڑھ کر فاصلے کو جانچتا اور توازن کو صحیح کرتا ہے۔ پھر ذرا پیچھے ہٹ کر وہ اپنی پوری قوت اور طاقت سے اپنے مخالف کی چھاتی پر کندھے کے قریب زور دار گھونسے کا دھماکہ کرتا ہے۔ گھونسا کھانے والا لڑکھڑاتا، اس کے گھٹنے ڈگمگاتے

اور سرلرزنے لگتا ہے لیکن وہ کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر خاموش رہتا ہے۔ اس کے ساتھی چلاتے ہوئے کہتے ہیں ''ایک دفعہ اور۔'' یہ منظر پھر دہرایا جاتا ہے۔ پہلا آدمی (میزبان گروہ) جس کے پٹھوں پر زیبائشی پٹی پہلے ہی چڑھی ہوئی ہوتی ہے پیچھے کی طرف ہٹ کر اپنی پہلی پوزیشن پھر بناتا ہے۔ اس کا مخالف اسے سیدھ میں رکھ کر فاصلے کو جانچتا ہے، پیچھے ہٹتا ہے اور پھر اسی پہلی والی جگہ پر دوسرا گھونسہ مارتا ہے۔ گھونسہ کھانے والے کے ٹخنے پھر کانپنے لگتے ہیں اور وہ میدان میں بیٹھ جاتا ہے۔ حملہ آور فاتحانہ انداز سے اپنے بازو سر سے اوپر اٹھا کر لہراتا ہے اور مضروب کے گرد زور زور سے خوفناک طریق پر چیخیں مار کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے اور پاؤں اتنے زور سے زمین پر مارتا ہے کہ وہ گردوغبار میں نظر نہیں آتے۔ اس کے حمایتی خوشی سے شور مچاتے ہوئے اپنے لکڑی کے ہتھیاروں کو فاتحانہ انداز میں اوپر نیچے گھماتے ہیں۔ گر جانے والے آدمی کے ساتھی اسے پھر مجبور کرتے ہیں کہ وہ مزید عذاب جھیلے، گھونسے کے ہر حملے کے بدلے جو وہ کھاتا ہے اسے بھی جواب میں ایک گھونسہ مارنے کا حق ملے گا۔ اس لئے جتنے زیادہ گھونسے وہ کھائے گا اسے بھی تعداد میں اتنے زیادہ گھونسوں کی یلغار کا حق ہو گا۔ اور اپنے مدمقابل کے معذور ہو جانے کا میدان چھوڑ جانے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہو گا۔ گھونسوں کے مزید دو حملوں کو سہنے کے بعد پہلے آدمی (میزبان) کی چھاتی بائیں جانب سے سوج جاتی اور سرخ ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنے حمایتیوں کے شوروغل کے درمیان اشارہ دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کافی ہو چکی ہے اور اپنے مخالف مدمقابل سے کہتا ہے کہ وہ اپنا ''حصہ'' وصول کرنے کے لیے ساکن کھڑا ہو جائے۔

یہ مخصوص منظر جو میں نے بیان کیا ہے نپولین شیگنان کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔

چھاتی پر گھونسہ بازی کے ایسے کئی دو بدو مقابلوں کی طرح اس مقابلے کا نتیجہ بھی تشدد میں اضافے کی صورت میں نکلا، جب ایک گروپ دوسرے سے سبقت لے گیا۔ میزبانوں کے پاس ''قابل استعمال'' مضبوط چھاتیوں کی کمی ہو گئی لیکن انہوں نے امن کے لیے کوئی پیغام دینے میں پہل نہیں کی بلکہ انہوں نے مہمانوں کو ایک اور قسم کے ''ڈویل'' (دو بدو مقابلے) کا چیلنج دیا۔ اس میں آپ جامد و ساکت (بے حس) کھڑے ہو جاتے ہیں اور آپ کا مخالف اپنے کھلے ہاتھوں کے ساتھ آپ کی پسلیوں سے ذرا نیچے ضرب لگاتا ہے۔ اس حصے پر چوٹ سے انسان کا جسم مفلوج ہو جاتا ہے اور زمین پر بے سدھ ہو کر گر پڑتا ہے۔ وہ بے ہوشی کے

عالم میں ہانپنے لگتا ہے۔ مذکورہ واقعے میں اپنے اپنے منظورِ نظر سورماؤں کو مٹی میں اوندھے منہ لیٹے دیکھ کر جلد ہی دونوں طرف کے لوگ غصے سے بپھر گئے اور اپنے تیروں پر بانس کے زہر آلود نوکیلے سرے چڑھا دیئے۔ اس وقت اندھیرا ہونے لگا تھا اور عورتوں اور بچوں نے آہ وزاریاں شروع کر دیں۔ پھر وہ بھاگ کر مردوں کے پیچھے آ گئے جن کی اوٹ نے حفاظتی حصار کا کام دیا۔ میزبان اور مہمان میدان کے آر پار دونوں طرف ایک دوسرے کے آمنے سامنے دم سادھے کھڑے تھے شیگنان اس وقت تیر کمان برداروں کی ایک قطار کے پیچھے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ انہیں یہ دیکھ کر ایک گونہ گہرے اطمینان کا احساس ہوا کہ مہمانوں کی ٹولیوں نے جلتی ہوئی لکڑیوں کو ہاتھوں میں تھامے آہستہ آہستہ اس گاؤں سے نکل کر جنگل کی تاریکی کا رخ کیا۔

بعض دفعہ چھاتی پر گھونسہ بازی کے دو بدو مقابلوں میں تیزی لانے کا ایک درمیانی مرحلہ بھی ہوتا ہے دونوں مدمقابل نوکیلے پتھروں کی مدد سے گھونسوں کے حملے اتنی شدت سے کرتے ہیں کہ مخالفین خون تھوکنے لگتے ہیں۔ ایک اور طریقہ جس سے میزبان اور مہمان ایک دوسرے کی تواضع کرتے ہیں، وہ خنجر کے ذریعے مقابلہ ہے اس میں دونوں مخالف باری باری اپنے مدمقابل پر خنجر کی چپٹی سطح سے حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس میں ذرا سی چوک کا نتیجہ شدید ضرب کی صورت میں نکلتا ہے اور مقابلوں میں مزید شدت آ جاتی ہے۔

اس کے بعد اگلا سب سے زیادہ پر تشدد سلسلہ بلموں سے لڑائی ہے۔ کوئی شخص جسے اپنے مدمقابل سے خصوصی پرخاش ہوتی ہے اسے چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے سر پر آٹھ دس فٹ تک کی لمبی کھمبے کی شکل والی چھڑی سے ضرب لگائے۔ چیلنج دینے والا اپنی چھڑی زمین پر رکھ دیتا ہے پیچھے ہٹ کر اپنا سر نیچے کو جھکا دیتا ہے، اس کا مدمقابل اپنی چھڑی کا پتلا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بھاری سرے کو چیلنج کرنے والے کے سر پر پوری (ہڈی شکن) قوت کے ساتھ مارتا ہے۔ حملے کو برداشت کر لینے کے بعد اب دوسرے کی باری آتی ہے اور اسے فوری طور پر موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مخالف پر اسی طریقے سے حملہ کرے۔

شیگنان بتاتے ہیں کہ مثالی ''یانومامو'' لوگوں کے جسموں پر بدنما زخموں کے نشانات کی بھرمار ہوتی ہے۔ ''یانومامو'' ان نشانات پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ حجامت کے ذریعے اپنے سروں کو کھوپڑیوں سے بال صاف کر دیتے ہیں تاکہ ان کے زخموں کے

MashalBooks.org

نشانات نظر آتے رہیں اور بالوں سے صاف حصوں پر وہ سور کی سرخ چربی سے مالش کرتے ہیں تا کہ زخم کا نشان واضح طور پر نظر آئے۔ اگر کوئی ''یانومامؤ' چالیس سال کی عمر کا ہو تو اس کی کھوپڑی پر زخموں کے بیس تک بڑے نشانات اور داغ ہوتے ہیں۔ شیگنان کا کہنا ہے کہ اگر بلموں کے دو بدو مقابلوں کے کسی تجربہ کار ''یانومامؤ' کی کھوپڑی کو اوپر سے دیکھا جائے تو وہ سڑکوں کے نقشے کی مانند نظر آتی ہے۔

یہ ''دو بدو' مقابلے ایک ہی گاؤں کے لوگوں کے درمیان بھی اتنے ہی عام ہیں جتنے پڑوسی بستیوں کے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں، یہاں تک کہ قریبی رشتہ دار بھی اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اکثر مسلح مقابلے بازی (تصادم) پر اتر آتے ہیں۔ شیگنان نے کم از کم ایک ایسا مقابلہ ایک باپ بیٹے کے درمیان دیکھا۔ نوجوان نے کچھ کیلے جو اس کے باپ نے کسی جگہ لٹکائے تھے، چرا لیے۔ جب چوری پکڑی گئی تو باپ کو غصہ آ گیا اور اس نے گھر کی چھت میں سے ایک کڑی کھینچ کر بیٹے کے سر پر دے ماری۔ بیٹے نے بھی ایک چھڑی کھینچ ماری اور باپ پر حملہ آور ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ گاؤں کا ہر آدمی دونوں میں سے کسی ایک کی طرف داری میں کسی دوسرے کی مار پیٹ میں لگ گیا۔ جب لڑائی بڑھی تو اصل وجہ نزاع اوجھل ہو گئی اور انجام کٹی ٹوٹی ہوئی انگلیوں اور گھونسوں کی مار سے چکنا چور کندھوں کی صورت میں سامنے آیا۔ ایسے تصادم، کسی دوبدو لڑائی کے دوران میں، جونہی پاس کھڑے لوگ، خون کو وافر مقدار میں بہتا دیکھیں فوراً شروع ہو جاتے ہیں۔

''یانومامؤ' کے ہاں کشیدگی میں شدت لانے کے لیے ایک اور رواج بھی ہے جو خودکشی ہونے سے ذرا کم ہے...... وہ نیزوں کی لڑائی ہے۔ یہ نیزے چھ فٹ اونچے پودوں کو چھیل کر اور انہیں سرخ و سیاہ نقوش سے سجا کر بنائے جاتے ہیں انہیں کافی لمبائی تک تیز دھار بنا کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ہتھیار بڑے خطرناک زخم لگا سکتے ہیں لیکن موت کے پیغام بر ہونے کے لحاظ سے ذرا کم مہلک ہیں۔

جنگ ''یانومامؤ' کی طرز زندگی کا بنیادی اور قطعی اظہار ہے۔ ''مارنگ'' کے برعکس، لگتا ہے کہ ''یانومامؤ' کے ہاں کسی محفوظ قسم کی جنگ بندی کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ وہ پڑوس کے دیہاتوں کے ساتھ باہمی اتحاد کے سلسلوں میں شامل ہوتے ہیں لیکن برادریوں کے ان باہمی تعلقات میں مسلسل باہمی عدم اعتماد، کدورت پر مبنی افواہوں اور خود

غرضی کے باعث عین وقت پر دھوکہ دہی کی وجہ سے رخنہ پڑتا ہے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اتحادی اپنی دعوتوں میں کس نوع کی تفریحوں سے ایک دوسرے کی تواضح کرتے ہیں۔ ایسے مواقع باہمی دوستوں کو مستحکم بنانے کا ذریعہ ہونے چاہئیں لیکن آپس کے بہترین اتحادی بھی خوفناک اودھم اور فساد کا رویہ اختیار کرتے ہیں تاکہ اتحاد میں ان کی برادری کی شرکت کی اہمیت اور قدر و قیمت سے متعلق اندازے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔

چنانچہ ان مفروضہ دوستانہ دعوتوں کے دوران میں ساری اکڑفوں، رعونت، شیخی بگھارنے اور جنسی قوت کے مظاہروں کی وجہ سے ان کے اختتام کے بارے میں کوئی پیشگوئی اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی جب تک آخری مہمان اپنے گھر واپس نہ چلا جائے۔ محفل میں شریک سب لوگ ماضی کے ان مشہور واقعات سے بھی پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں جن میں میزبان گاؤں والوں نے جان بوجھ کر اپنے مہمانوں کو قتل کرنے کی سازش کی یا مہمانوں نے ایسے کسی امکان کے پیش نظر میزبانوں کو قتل کیا۔ 1950ء میں ایک گاؤں کے باہم خونی رشتوں میں منسلک لوگ جنہوں نے چھاتی کوٹنے کے دو بدو مقابلوں کی (جس کی تفصیل میں نے ابھی بیان کی ہے) میزبانی کی تھی، ایک مشہور دعوت میں دغا بازی کا شکار ہو گئے۔ وہ اپنے گاؤں سے ایک دوسرے گاؤں جہاں پہنچنے کے لیے دو دن کا سفر درکار تھا ایک اتحاد بنانے کے لیے گئے تھے۔ ان کے میزبانوں نے انہیں ناچنے میں یوں مصروف رکھا گویا اندیشے والی کوئی بات نہیں تھی۔ بعد میں وہ گھر کے اندر آرام کی نیت سے داخل ہوئے تو ان پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے حملہ کیا گیا۔ 12 (بارہ) آدمی مارے گئے، زندہ بچ جانے والے جب گاؤں سے نکل کر باہر کو بھاگے تو ان پر ایک مجمع پھر حملہ آور ہوا جو جنگل میں چھپا ہوا تھا۔ یوں اور بھی بہت سے آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔

''یانومامو'' ہمیشہ دھوکہ بازی اور دغا بازی سے خائف رہتے ہیں۔ وہ جو اتحاد بناتے ہیں ان کی بنیاد لوگوں یا وسائل کے کسی مشترکہ مفاد کی بجائے عسکری برتری کے لحاظ سے تازہ ترین عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ کی کیفیت پر ہوتی ہے۔ اگر کسی گاؤں کی عسکری قوت میں کوئی بڑی رکاوٹ یا مزاحمت حائل ہو تو اسے اپنے اوپر مسلسل حملوں کی توقع رکھنی چاہیے، یہاں تک کہ سابقہ اتحادیوں کی طرف سے بھی ایسے کسی گاؤں والوں کے لیے جس کی کئی مرد جوان لڑائی میں مارے گئے ہوں۔ سب سے زیادہ امید افزا صورت حال یہی

ہے کہ وہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ رہنے کے لیے دوسرے گاؤں میں چلے جائیں۔لیکن کوئی گروہ بھی جذباتی وجوہات کی بنا پر پناہ نہیں دیتا۔ عارضی طور پر پناہ، خوراک اور تحفظ دینے کے بدلے میں اتحادی گروہ شکست خوردہ گروہ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیویاں انہیں تحفے میں دیں۔

دشمن کی تاک میں گھات لگا کر بیٹھنا، باغیانہ غداری کی حامل دعوتیں اور صبح سویرے کے چوری چھپے حملے،''یانوماموٗ' جنگ و جدل کے یہ تین طریقے ہیں۔ ایک دفعہ جب وہ شیخیاں بگھارنے اور دو بدو لڑائیوں کے مرحلے سے گزر جاتے ہیں ان کا مقصد اپنے کسی بھی قسم کے نقصان کے بغیر دشمن کے اتنے زیادہ جوانوں کو مارنا اور اتنی زیادہ عورتوں کو اپنے قبضے میں لینا ہوتا ہے جتنی ممکن ہوں۔ ایک حملے میں''یانوماموٗ' جنگجو چوری چھپے رات کے وقت دشمن کے قریب پہنچ جاتے ہیں، کوئی آگ روشن نہیں کرتے اور نمی سے آلودہ جنگل کی تاریکی میں کانپتے ہوئے صبح نمودار ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی جنگجو کی انتہائی شجاعت کا عظیم کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے گاؤں میں گھس جائے اور کسی شخص کو جو ایک لٹکے ہوئے پلنگ میں نیند کی حالت میں ہو قتل کر دے، ورنہ عام طور پر حملہ آور ایسے مردوں کو قتل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اگر دشمن چوکس ہو اور بڑی ٹولیوں کی صورت میں چل رہا ہو تو پھر حملہ آور گروہ اندھا دھند ان پر تیروں کی بارش برسا دیتا ہے اور پھر نتائج کا علم ہوئے بغیر اپنے گھر کو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کے حملے بلاناغہ اور مسلسل جاری رہتے ہیں۔ ایک گاؤں کو پچیس 25 ماہ کے عرصے میں پندرہ15 مرتبہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان حالات میں شیگنان کی زندہ سلامت بچ جانے کی غیر معمولی چابک دستی کو خراج تحسین پیش کرنا پڑتا ہے۔

''یانوماموٗ' آخر اتنے لڑاکے بھڑاکے کیوں ہیں؟ پروفیسر شیگنان نے ''یانوماموٗ' کی طرف سے پیش کی جانے والی وضاحت کو قبول کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اکثر دوبدو لڑائیوں اور تشدد کے دوسرے واقعات کا سبب عورتوں کی وجہ سے ہونے والے تنازعات اور جھگڑے ہوتے ہیں۔عورتوں کی تعداد یقینی طور پر کم ہے، اس کے باوجود کہ مردوں کی تعداد کا ایک چوتھائی حصہ لڑائیوں میں مارا جاتا ہے۔ 100 عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد 120 ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ سربراہ ایسے دوسرے لوگ جو اپنے ظلم اور بے رحمی کی وجہ سے

مشہور ہیں بہ یک وقت چار پانچ بیویاں رکھتے ہیں اور مجموعی لحاظ سے 25 فیصد لوگوں کی دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوتی ہے۔ والد اپنی بیٹیوں کی منگنی کم سنی میں ہی بارسوخ لوگوں سے کر دیتے ہیں تا کہ ان کی حمایت حاصل ہو یا بدلے میں اپنی شادی کر سکیں۔ چنانچہ گاؤں کی تمام بالغ عورتیں شادی شدہ ہوتی ہیں۔ یوں بہت سے نوجوان مردوں کے پاس مخالف صنف سے جنسی رغبت کی تسکین کا بدکاری کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ جواں سال متشدد مرد ناراض، مایوس اور خوفزدہ بیویوں سے شام کو ملاقات کا وقت اور جگہ طے کرتے ہیں اور اگلی صبح وہ جنگل کی اوٹ میں مقررہ جگہ پر ملتے ہیں جب لوگ گاؤں چھوڑ کر رفع حاجت کے لیے جاتے ہیں۔

کوئی ''یانومامؤ'' خاوند اپنے چھوٹے بھائیوں اور دوستوں کو بیوی سے جنسی تعلقات میں شرکت کی بخوشی اجازت دیتا ہے لیکن وہ لوگ جو عورت تک رسائی کسی کی ''بیوی کو مستعار لینے'' کے ذریعے حاصل کرتے ہیں انہیں اس کے عوض خاوند کا قرض خدمات کی فراہمی کے ذریعے یا لڑائی کے دوران میں چھینی گئی عورتوں کے ذریعے اتارنا ہوتا ہے۔ شہرت کا طالب کوئی نوجوان کسی دوسرے کا دست نگر نہیں بننا چاہتا۔ اس کی بجائے وہ گاؤں کی شادی شدہ عوروں کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر یا خوفزدہ کر کے ان سے خفیہ رابطوں کے ذریعے اپنا کام نکالتا ہے۔ چونکہ ''یانومامؤ'' لڑکیوں کی سن بلوغت سے پہلے ہی منگنیاں کر دی جاتی ہیں، اس لئے سب ''یانومامؤ'' مرد اپنے پڑوسیوں کی بیویوں پر للچائی ہوئی نگاہیں رکھتے ہیں۔ ''یانومامؤ'' خاوندوں کو بیویوں کی کسی سے خفیہ ملاقات یا راہ و رسم کا علم ہو جائے تو وہ طیش میں آ جاتا ہے...... زیادہ تر جنسی حسد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ بدکاری کے مرتکب شخص کو تحفوں اور خدمات کے ذریعے خاوند کو معاوضہ ادا کرنا چاہیے تھا۔

جنگ میں دشمن کے گاؤں پر حملے کا ایک بڑا مقصد عورتوں کو پکڑنا ہوتا ہے۔ جونہی کامیاب حملہ آور پارٹی خود کو کسی تعاقب کے اندیشے سے محفوظ پاتی ہے اس پارٹی کے سارے ارکان گرفتار کی گئی جنگی قیدی عورتوں سے اجتماعی زنا بالجبر کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب حملہ آور اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جاتے ہیں تو وہ قیدی عورتوں کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہس جو پیچھے گھروں میں رہ گئے تھے اور پھر وہ لوگ بھی انہیں زنا بالجبر کا نشانہ بناتے ہیں۔ بعد ازاں بڑی سخت سودا بازی مول تول اور دلیل بازی کے بعد قیدی عورتوں کو

مختلف جنگجوؤں کی بیویاں بنا کر بانٹ دیتے ہیں۔

''یانومامؤ'' کی سرزمین سے متعلق خوفناک کہانیوں میں سے ایک برازیل کی خاتون ہیلینا ویلیرو کی ہے۔ اس نے بیان کیا ہے کہ وہ ''یانومامؤ'' حملے کے دوران میں اس وقت پکڑی گئی جب اس کی عمر ابھی دس سال کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا وہ آپس میں لڑ پڑے۔ ایک دھڑے نے دوسرے کو شکست دے دی اور اس کے سب نرینہ چھوٹے بچوں کو ان کے سر چٹانوں سے ٹکرا کر مار ڈالا اور زندہ بچ جانے والی بچیوں کو گھر لے گئے۔ ہیلینا نے اپنے بچپن کا باقی اور جوانی کا زیادہ عرصہ ایک گروہ کے چنگل سے نکل کر کسی دوسرے کے قابو آجانے، پھر وہاں سے بھاگ کر خود کو ان سے بچانے کے لیے جنگل میں چھپنے اور دوبارہ گرفتار ہو کر مختلف لوگوں کی بیوی بنائے جانے میں گزارا۔ وہ دو مرتبہ زہر آلود تیروں سے زخمی بھی ہوئی اور کئی بچوں کو جنم دیا۔ بالآخر وہ بھاگ کر بچ نکلنے اور دریائے ''آری نوگو'' کے کنارے پر واقع تبلیغی جماعت کی کسی آبادی تک جا پہنچی۔

عورتوں کی کمی، کم عمری میں منگنیاں، بدکاری، بیک وقت کئی بیویاں رکھنا اور عورتوں کو قیدی بنا کر لے جانا، یہ سب باتیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ''یانومامؤ'' کے مابین جنگ کی وجہ جنسی طلب (بھوک) ہے۔ پھر بھی میرے نزدیک یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ اس نظریے سے ''عورتوں کی کمی کو مصنوعی طریقوں سے پورا کرنے'' کی وضاحت نہیں ہوتی۔ ''یانومامؤ'' مادہ اولادوں کی بڑی تعداد کو مستقل معمول کے طور پر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسا صرف ان سے امتیازی ''عدم توجہی'' کے ذریعے نہیں بلکہ ہلاکت کے مخصوص حربوں سے کیا جاتا ہے۔

مردوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی پہلی اولاد نرینہ ہو۔ عورتیں اپنی بیٹیوں کو ہلاک کرتی رہتی ہیں جب تک ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش نہ ہو۔ اس کے بعد دونوں صنفوں کے شیر خواروں کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ ''یانومامؤ'' عورتیں اپنے بچوں کو انگوروں کی بیلوں سے گلا گھونٹ کر، بچے کے گلے پر ایک سوئی رکھ کر اس کے دونوں سروں پر کھڑے ہو کر، اس کے سر کو کسی درخت سے ٹکرا کر، یا سیدھے بھلے طریقے سے شیر خوار بچے کو جنگل میں زمین پر اکیلا چھوڑ کر ہلاک کرتی ہیں۔ نوعمر بچوں کی ان ہلاکتوں کا ''اصل حاصل'' اور جنسی انتخاب کی شریفانہ صورت کی ایک وجہ نوعمر بچوں اور بچیوں کا تناسب 150 بچے

بمقابلہ 100 بچیاں ہوتا ہے۔ مردوں کو اپنے لئے بیوی کے حصول میں جن آزمائشوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی موجودگی میں اور ان کے پیش نظر ایک انتہائی مضبوط قوت ...... (ایسی قوت جو جنسی خواہشات سے مختلف اور مضبوط تر ہو) تشنگیوں اور جھگڑوں کے اصل مقصود و مطلوب ہی کو تباہ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

''یانومامو'' کی سرزمین پر نوعمر کی ہلاکتوں اور جنگ و جدل سے متعلق ایک پریشان کن اور پیچیدہ پہلو، بظاہر آبادی کے دباؤ کا نہ ہونا اور نظر آنے والے وسیلوں کی بے حساب فراوانی ہے۔ ''یانومامو'' اپنی غذا سے حاصل ہونے والی توانائی کی بڑی مقدار تخم سفید اور کیلے سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے جنگلی باغات میں اگتے ہیں۔ ''مارنگ'' کی طرح انہیں بھی جنگلات کو جلانا پڑتا ہے تاکہ یہ باغات لگائے جاسکیں، لیکن کیلے اور تخم سفید، شکرقندی یا ''یامز'' کی طرح نہیں بلکہ ان سے مستقلاً اور متواتر کئی سالوں تک محنت کے مقابلے میں پیداوار کی وافر مقدار حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ ''یانوموما'' دنیا بھر کے وسیع ترین جنگلی سلسلے کے وسط میں رہتے ہیں اس لئے جنگل کو وہ جو تھوڑا بہت جلاتے ہیں وہ ''درختوں کو کھانے'' کے خطرے کا باعث نہیں ہوتا۔ ایک مثالی ''یانومامو'' گاؤں میں رہنے والوں کی تعداد صرف 100 سے 200 تک کے درمیان ہوتی ہے۔ آبادی کی یہ تعداد اتنی مختصر ہے کہ آس پاس کے باغات کی جگہوں پر وافر مقدار میں تخم سفید اور کیلے با آسانی کاشت کرسکتی ہے اور اسے نقل و مکانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کے باوجود ''یانومامو'' کی آبادیاں متواتر اور مسلسل متحرک اور منقسم رہتی ہیں اور اپنے باغات بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ اگاتے رہتے ہیں۔ نقل مکانی کے اس عمل میں ان کی رفتار ایمیزون کے جنگلات میں بسنے والی ''کاٹو اور جلاؤ'' معیشت پر کار بند دوسری سب قوموں سے زیادہ ہوتی ہے۔

شیگنان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اکثر گروہوں میں منقسم ہوتے ہیں اور ایک سے دوسری جگہ نقل مکانی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی لڑائی اکثر عورتوں پر ہوتی ہے۔ اس بارے میں میری رائے کے مطابق صحیح تر بات یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائیاں عورتوں کی وجہ سے کرتے اور ہمیشہ جنگ کی حالت میں اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ وہ اکثر متحرک رہتے ہیں۔

یانومامو کوئی مثالی قسم کے ''کاٹو اور جلاؤ'' پر عمل پیرا باغبان نہیں۔ ان کے آباؤ اجداد خانہ بدوش شکاری تھے جو بڑے دریاؤں سے دور چھوٹی چھوٹی اور منتشر ٹولیوں اور

جماعتوں کی صورت میں رہتے تھے۔ ان کی اہم خوراک اجاڑ ویرانوں کی جنگلی پیداوار تھی۔ ہم اس بارے میں یقین کر سکتے ہیں کہ کم وبیش عہد حاضر کے دوران ہی میں انہوں خوراک کے بڑے اجزا کے طور پر کیلوں اور تخم سفید پر انحصار کرنا شروع کیا کیونکہ ان کے پودے جدید دنیا میں پرتگیزی اور ہسپانوی آبادکاروں نے متعارف کرائے تھے۔ حالیہ وقتوں تک ایمیزون میں ''امریکی انڈینز'' کی آبادیوں کے مراکز بڑے دریاؤں اور ان کی ذیلی شاخوں کے قرب و جوار میں واقع تھے۔ ''یانو ماموٗ'' اور ان جیسے دوسرے قبیلے عقبی حصوں میں آباد تھے اور دریاؤں کی قریبی آبادیوں کی نظروں سے اوجھل رہتے تھے، جن کے بڑے بڑے اور مستقل گاؤں تھے اور خاص قسم کی کشتیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ خاصی متحرک رہتی تھیں۔ انیسویں صدی کے اختتام پر دریائی علاقوں کی آخری بڑی انڈینز ویلا کے باشندوں کو نو آبادیوں میں وسعت تھی۔ ''انڈینز'' کی واحد نسل جو ایمیزون کے وسیع علاقوں میں باقی رہ گئی ہو ''پیدل انڈینز تھے۔'' ان کی خانہ بدوش طرز معاشرت نے انہیں سفید فام لوگوں کی گولیوں اور بیماریوں سے محفوظ رکھا۔

آج بھی ''یانو ماموٗ'' کی زندگیوں میں ''پیدل انڈینز'' کی طرز زندگی کے غیر مبہم شواہد دیکھنے کو ملتے ہیں وہ کشتیوں کو بنانا اور انہیں چلانا نہیں جانتے۔ اگرچہ ان کی بڑی آبادیاں دریاؤں کے کناروں پر یا ان کے آس پاس ہیں وہ مچھلیاں نہیں پکڑتے باوجود اس کے کہ ان دریاؤں کے بالعموم مچھلیوں اور دوسرے آبی جانوروں کی بہتات رہتی ہے۔ انہیں کھانے پکانے کے برتن بنانا نہیں آتا گو کہ تخم سفید کا بہترین مزہ اس کو ابال کر کھانے میں ہے اور آخری بات یہ ہے کہ وہ پتھر کی کلہاڑیاں بنانے کے فن سے بھی نا آشنا ہیں اگرچہ اب وہ اپنے باغات لگانے کے لیے فولادی کلہاڑیوں کے محتاج ہیں۔

آیئے میں آپ کو ''یانو ماموٗ'' سے متعلق حالیہ تاریخ کا قدرے غیر مصدقہ احوال سناؤں۔ خانہ بدوش یانو ماموں نے جو برازیل اور وینز ویلا کے درمیانی درو دراز پہاڑوں میں رہتے تھے اسپغول (تخم سفید) اور کیلے کے باغات لگانے کا تجربہ شروع کیا۔ ان فصلوں کی زیادہ پیداوار کے سبب ان کی فی کس غذائیت کی مقدار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یانو ماموں کی آبادی بھی بڑھنے لگی اور آج پورے ایمیزون کے طاس میں بسنے والے ''انڈینز'' میں ان کا شمار سب سے زیادہ آبادی والے قبیلوں میں ہوتا ہے لیکن کیلے اور

MashalBooks.org

اسپغول میں محسوس ہونے والا ایک نقص یہ ہے کہ ان میں پروٹین کی حد سے زیادہ کمی ہے۔ پہلے تو بطور خانہ بدوش شکاریوں کے وہ پروٹین کی ضرورت جنگلی جانوروں کو کھا کر جن میں ہرن، مگرمچھ، چھپکلی، بندر اور سانپ وغیرہ شامل تھے پوری کر لیا کرتے تھے لیکن باغات کی فصلوں میں پیداوار بڑھنے سے انسانی آبادی کی گنجائش میں بھی اضافہ ہوا اور یوں ان جانوروں کا شکار اتنی کثرت سے کیا جانے لگا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں تھی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں شکار کی کثرت سے جنگلی حیات بہ آسانی ختم ہونے لگتی ہے یا کہیں دور نکل جاتی ہے۔ پہلے ادوار میں ایمیزون کے قبائل نے اپنی گھنی آبادی کے باوجود ان نتائج سے بچنے کے لیے اپنے دریائی مسکنوں سے مچھلی کے شکار سے گریز کیا لیکن ''یانومامؤ' ایسا نہیں کر سکتے۔ایمیزون طاس کے محققین جین اور ایرک راس کی رائے ہے کہ ''یانومامؤ' دیہات میں مستقل لڑائی بھڑائی اور مارکوٹ کے مقابلوں کی وجہ شہوت پرستی کی ارزانی نہیں بلکہ پروٹین کی قلت ہے۔ میں اس سے متفق ہوں۔''یانومامؤ' نے ''جنگلات کھائے ہیں'' ان کے درخت نہیں بلکہ ان کے جنگلی جانور۔ اور اب وہ اس کے نتائج بکثرت جنگ وجدل، ظلم و ستم، ننھے بچوں کی ہلاکت اور سفاکانہ نفس پرستی کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔

''یانومامؤ' اپنی بھوک کا اظہار دو الفاظ سے کرتے ہیں ایک کا مطلب فاقہ ہے۔ خالی پیٹ جبکہ دوسرے سے مراد، ''سیر شکمی میں گوشت کی طلب' ہوتی ہے۔ گوشت کی بھوک ''یانومامؤ' گانوں، گیتوں اور نظموں کا مستقل موضوع ہے اور ان کی دعوتوں (خاطر و مدارات) کا مرکز ومحور بھی گوشت ہوتا ہے۔ ہیلینا ویلیر و نے اپنے محبوس ہونے کا جو حال لکھا ہے اس میں بتایا ہے کہ ایک ''یانومامؤ' عورت کے پاس کسی مرد کو جھکانے کے لیے جو گنتی کے چند طریقے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بطور شکاری اس کی ناقص کارکردگی کی شکایت کرے۔شکاری کو چاہیے کہ ''یانومامؤ' کی بستیوں سے کافی آگے دور تک جا کر شکار تلاش کرے تاکہ خالی ہاتھ واپس نہ آنا پڑے۔ شکار کی مہم کا دورانیہ دس سے بارہ دنوں تک کا ہوتا ہے تاکہ شکار میں جانوروں کی معقول تعداد ہاتھ آئے۔ شیگنان خود شکار کی ایک مہم پر جانے والوں میں شریک تھا۔ وہ حال سناتا ہے کہ یہ مہم پانچ دنوں کی تھی اور ایسے علاقے میں تھی جس میں کئی عشروں سے شکار نہیں کھلیا گیا تھا۔ اس شکار میں اتنا گوشت بھی اکٹھا نہ ہو سکا جو اس مہم میں شامل لوگوں کی خوراک کے لئے کافی ہوتا۔ چونکہ ایک مثالی ''یانومامؤ'

گاؤں اپنے قریب ترین پڑوس والے گاؤں سے ایک دن کے سفر سے کم مسافت پر واقع ہوتا ہے اس لئے زیادہ عرصے پر محیط مہموں پر جانے کے لیے دوسری بستیوں والوں کی شکار گاہوں سے گزر کر جانا اور پھر واپس آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ان بستیوں کے لوگوں میں ایک ہی کمیاب وسیلے سے بہرہ مند ہونے کا مقابلہ ہوتا ہے اور یہ وسیلہ عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ پروٹین ہوتی ہے۔

میں وحشی مرد کے پیچیدہ مسئلے سے متعلق اسی حل کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس سے یہ عملی اور واقعاتی وضاحت ہوتی ہے کہ ''یانومامو'' عورتیں اپنی نوخیز اولادوں میں ننھی عمر کی بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کی ہلاکت اور ان سے غفلت برت کر خود اپنے استحصال میں عملی طور پر کیوں شریک ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ''یانومامو'' مرد بیٹیوں پر بیٹوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ماں جو اپنے خاوند کو نرینہ اولاد نہیں دے سکتی بلاشبہ اس کی بے مروتی کا شکار ہوتی ہے اور ساتھ خاوند کے ہاتھوں اس کی پٹائی کے مواقع بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ میرا خیال ہے کہ اگر ایسا کرنا ان کے مفاد میں ہوتا تو ''یانومامو'' عورتیں آسانی سے جنسی تناسب کو الٹ کر مردوں کی بجائے عورتوں کے حق میں کر سکتی تھیں۔ عورتیں بچوں کو بستی سے دور جنگل میں جنم دیتی ہیں جہاں کوئی مرد موجود نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد شیر خوار بچوں کی ہلاکت کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق بیٹوں کے خلاف کسی استثنیٰ کے بغیر عمل میں لا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اپنی خواہش کے مطابق اپنی بے توجہی کا نشانہ بھی اپنے نرینہ بچوں کو بنانے کے لامحدود مواقع ہوتے ہیں جبکہ خاوندوں کو اس کا علم ہوسکتا ہے اور نہ ان کی طرف سے کسی جوابی کارروائی کا خطرہ۔

میں ایک اچھی مثال سے واضح کر سکتا ہوں کہ ''یانومامو'' عورتیں اپنے بچوں کی پرورش کے دوران میں ان کے جنسی تناسب کو کس طرح مکمل اختیار کے ساتھ کنٹرول کر سکتی ہیں۔ شیگنان بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک اچھی کھاتی پیتی گول مٹول صحت مند جوان عمر ماں کو کوئی ایسی چیز کھاتے ہوئے دیکھا (شائد یہ تخم سفید کا دلیہ تھا) جسے ایک نو عمر بچہ بھی بہ آسانی کھا سکتا تھا، اس کے پاس ہی اس کا سوکھا پتلا میلا کچیلا بھوک سے نڈھال بیٹا تھا جو اس کھائی جانے والی چیز تک پہنچنے کوشش کر رہا تھا تاکہ تھوڑی سی کھا سکے۔ شیگنان نے ماں سے پوچھا کہ وہ بچے کو کیوں نہیں کھلا رہی۔ ماں نے جواب دیا کہ تھوڑا

عرصہ پہلے بچے کو شدید ڈائریا ہو گیا تھا جس کے بعد اس کے دودھ پینا چھوڑ دیا اور یوں ماں کا دودھ خشک ہو گیا اور اب اس کے پاس کھلانے کو کچھ نہیں۔ اس نے کہا کہ اور کوئی غذا اس کے لئے موزوں نہیں کیونکہ بچے کو اور کوئی دوسرے شے کھانے کی سمجھ نہیں۔ شیگنان نے اصرار کیا کہ جو کچھ وہ خود کھا رہی تھی وہی بچے کو بھی کھلائے۔ بچے نے اسے بڑے اشتیاق سے کھایا، جس سے شیگنان اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنے نو خیز بچے کو فاقوں کے ذریعے آہستہ آہستہ موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔

نرینہ بچوں کی نسبت مادہ بچوں کی زیادہ کو ایک منظّم طریقے سے ہلاک کرنے یا انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ مرد بیویوں کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی مثال دی ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس سلسلے میں مردوں کی خواہش سے بچ نکلنے یا ٹال مٹول کرنے کے کئی مواقع ہوتے ہیں۔ اصل میں ''یانومامو'' عورتیں اپنے مفاد میں لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی زیادہ تعداد کو پال پوس کر جوان بناتی ہیں اور ان کا اپنا مفاد ہی اس عمل کا موثر جواز ہے۔ یہ مفاد اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ''یانومامو'' کی آبادی اپنے مسکن کو اپنے مفاد کے لیے استعمال میں لانے کے سلسلے میں بے اعتدالی برتنے کے سبب پہلے ہی زیادہ ہے۔ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کا تناسب زیادہ ہونے کا مطلب فی کس پروٹین کی زیادہ مقدار (کیونکہ مرد شکاری ہوتے ہیں) اور آبادی میں اضافے کی کمتر شرح ہے۔ اس کے معنی جنگ و جدل کی زیادتی بھی ہے۔ لیکن ''مارنگ'' کی طرح ''یانومامو'' کے لیے جنگ وجدل بیٹیوں کو چھوڑ کر صرف بیٹوں کو پالنے پوسنے کی قیمت ہے۔ لیکن ''یانومامو'' اس استحقاق کے لیے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مسکن کی قوت برداشت کو گنجائش سے زیادہ دباؤ کے ذریعے پہلے ہی زوال پذیر کر چکے ہیں۔

آزادی نسواں کی حامی کئی خواتین جنسیات کے حوالے سے جنگ کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ مصر ہیں کہ عورتیں مردوں کی طرف سے کی جانے والی سازش کا شکار ہیں کیونکہ صرف مردوں کو ہی ہتھیاروں کے ذریعے مارنا سکھایا جاتا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیوں نہ عورتوں کو بھی عسکری ہنر سکھائے جائیں؟ کیا کوئی ''یانومامو'' گاؤں لڑنے بھڑنے کے لیے ایک زیادہ مہیب اور خطرناک، خوفناک قوت نہیں ہوگا جس

MashalBooks.org

کے مرد اور عورتیں دونوں تیر کمانوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہوں بہ نسبت ایسے گاؤں کے جس کی عورتیں سایوں میں چھپی اپنی تقدیر کے فیصلے کی منتظر ہوں؟

معاشرے میں سفاکی اور بے رحمی سکھانے کی کوشش صرف مردوں تک کیوں محدود رہیں؟ کیوں نہ مردوں اور عورتوں دونوں کو حملہ آور ہونے کے ڈھنگ اور طریقے سکھائے جائیں؟ یہ اہم سوالات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جواب انسانوں کو...... خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں...... تندخود، کمینہ اور ظالم بننے کی تربیت ہے۔

اس معاملے کو جس طرح میں دیکھتا ہوں اس کے مطابق دو مستند اور قدیم حکمت عملیوں کے ذریعے معاشرے لوگوں کو بے رحم بناتے ہیں بے رحمی کی حوصلہ افزائی کا ایک طریقہ سب سے زیادہ ظالم شخصیات کو خوراک، آرام و آسائش، بطور انعام دینا ہے۔ دوسرا طریقہ ظالم لوگوں کے جنسی تقاضوں اور استحقاق کی تکمیل کے لیے انہیں بہترین صلاحیتوں کی فراہمی ہے۔ ان دو طریقوں میں سے دوسرا طریقہ زیادہ مؤثر ہے کیونکہ خوراک، آرام و آسائش اور جسمانی صحت سے محرومی کا نتیجہ فوجی لحاظ سے مطلوبہ اثرات کے الٹ ہوتا ہے۔ ''یانومامو'' کو ترغیب و تحریص سے مغلوب قاتلوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر ان کو معاشرتی فرائض بطور کرائے کے قاتل ادا کرنے ہوں تو ان کا توانا اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ جنسی طلب کی تسکین ظالم لوگوں کو کمک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ جنسی بھوک لڑنے کی اہلیت کو کم کی بجائے بڑھاتی ہے۔

میری یہ دلیل دور حاضر کے سگمنڈ فرائڈ، کونارڈ لورینز اور رابرٹ آرڈرے جیسے قبائلی مردوں کی برتری کے پرجوش حامیوں کی سوچ کے الٹ ہے۔ اس سلسلے میں ہماری سوچ اور سوجھ بوجھ کو جس انداز میں پروان چڑھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مرد قدرتی طور پر زیادہ بے رحم اور ظالم ہوتا ہے کیونکہ مردوں کا جنسی کردار جارحانہ ہوتا ہے۔ لیکن جنس اور جارحیت کو ایک دوسرے سے منسلک کرنا ایسے ہی مصنوعی ہے جیسے نوعمر بچوں کی ہلاکت کا تعلق جنگ سے جوڑنا۔

جنس، جارحیت پر مبنی توانائی اور بے رحمانہ رویے کا ذریعہ صرف اس لئے ہے کیونکہ مجلسی زندگی میں مردوں کی پرجوش حمایت اور نامعقول حد تک برتری پر مبنی نظاموں نے جنس کی صورت میں صلے دینے پر یوں قبضہ جمالیا ہے جیسے وہ جھگڑالو اور جارح مردوں میں

صلے بانٹتے ہیں، جبکہ جھگڑے اور زیادتی سے پرہیز کرنے والے پرامن مردوں کو ان سے محروم رکھتے ہیں۔

میں کھلے دل کے ساتھ صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کے باعث عورتوں کو بھی اس طرح کے ظلم وستم کی خوگر اور سنگدلی اور بے رحمی کی مرتکب بنانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ مفروضہ کہ عورت فطری اور قدرتی طور پر صابر وشاکر، نازک اندام، مادرانہ شفقت سے مملا مال نسوانی صفات کی مالک ہوتی ہے محض ایک ایسی صدائے بازگشت ہے جو مرادانہ خود پسندی پر مبنی دیو مالائی قصے کہانیوں پر مشتمل ہے جن کا تعلق مردوں کے فطری طور پر بے رحم اور ظالم ہونے سے ہے ...... اگر صرف مردوں کی طرح دہنگ خونخوار عورتوں کو ہی مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ہوتی......تو ہمیں ہر شخص کو یہ یقین دلانے میں کوئی دقت پیش نہ آتی کہ عورتیں فطرتی طور پر سنگدل اور وحشی ہوتی ہیں۔

اگر جنس کو سنگدلانہ رویوں کی قوت اور ان پر قابو پانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں صنفوں کو بیک وقت یکساں درجے تک خونخوار اور بے رحم ظالم نہیں بنایا جا سکتا۔ ان میں سے ایک یا دوسرے کو اس طرح تربیت دینی ہوگی کہ وہ غالب رہے دونوں کو بالکل مساوی حیثیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ دونوں کو بے رحم اور وحشی بنانا دونوں صنفوں کے درمیان حقیقی جنگ کے مترادف ہوگا۔ ''یانومامو'' میں ایسی صورت حال کا مطلب مردوں اور عورتوں کے درمیان مسلح تصادم کے ذریعے میدان جنگ میں کارہائے نمایاں کی بنیاد پر ایک دوسرے کو زیر اطاعت لانا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں جنس کو بہادری اور شجاعت کا صلہ بنانے کے لیے کسی ایک صنف کو بزدلی سکھانی ہوگی۔

ان معاملات پر غور وفکر مجھے آزادی نسواں کے حامیوں کی تمثیل (بلکہ گردان اور تکرار) میں کہ ''انسان کی جسمانی ساخت اس کا مقدر نہیں'' میں معمولی سی ترمیم پر آمادہ کرتی ہے۔ مخصوص حالات میں انسان کی ساخت (بناوٹ) سے اس کا مقدر وابستہ ہے۔ جب جنگ و جدل آبادی پر کنٹرول کا ایک نمایاں ذریعہ تھا اور جب جنگ کے طور طریقوں میں اصل اہمیت پرانے اور ہاتھ میں تھام کر استعمال ہونے والے ہتھیاروں کو حاصل تھی تو مردانہ برتری اور فضیلت پر منحصر طرز زندگی کو عروج نصیب تھا۔ جہاں تک آج کی دنیا میں ان

دونوں شرائط میں سے کسی کے بھی صحیح ہونے کا تعلق ہے اس حد تک آزادی نسواں کے حامیوں کی مردانہ بالادستی میں کمی کی پیش گوئی درست ہے۔ میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ اس انحطاط کی شرح اور بالآخر جنسی توازن قائم ہونے کے حتمی مواقع کا دارومدار روایتی پولیس اور فوجی قوتوں کے منظر سے مزید اخراج پر ہے۔ آیئے ہم توقع رکھیں کہ ایسا پولیس یا فوج کی نفری کے اخراج کے نتیجہ میں ہو اور جنگ کے لیے فوجی مہارت اور صف آرائی کے نتیجے میں نہیں، جس کا تعلق جسمانی طاقت سے نہیں ہوتا۔ ہم ''یانومامؤ'' سے بھی سبقت لے جاتے اگر جنسی انقلاب کے خالص نتیجے کے طور پر چھوٹے فوجی دستوں کی سربراہی یا نیوکلیئر سٹیشنوں کی انچارج کمان دار کی شکل میں عورتوں کی پوزیشن محفوظ ہوتی۔

☆☆☆

MashalBooks.org

دولت کی نمائش کے لیے دعوتیں

نسلی جغرافیہ کے عالمی عجائب گھر میں نمائش کے لیے موجود حیران کن طرز زندگی کو دیکھ کر ایک ایسی عجیب وغریب آرزو کا تاثر وتصور سامنے آتا ہے جسے ''شہرت کی تمنا'' کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ شہرت اور تعریف کے ایسے ہی بھوکے ہوتے ہیں جیسے دوسرے گوشت کے۔ حیران کن بات یہ نہیں کہ لوگ تعریف کے متمنی ہوتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بعض اوقات ان کی یہ دلی آرزو اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شہرت کے مقابلے پر اتر آتے ہیں جیسے دوسرے لوگوں میں زمین یا پروٹین یا جنس پر جوشِ ہمسری پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ مقابلہ بازی اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس کی خوفنا کی خود ایک انجام بن جاتی ہے پھر یہ مقابلہ بازی ذہن پر ایک ایسے خبط کی طرح مسلط ہوتی ہے جو مادی اور مالی نقصان کی معقول سوچ سے قطع نظر شائستگی سے یکسر بیگانہ کر دیتی ہے۔

وانس پیکارڈ نے اس سے ہم آہنگ رویے پر اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو مرتبہ اور حیثیت کی تلاش میں سرگرداں مقابلہ کرنے والی قوم قرار دیا بہت سے امریکی ساری عمر اپنے سماجی رتبے کو بلند تر کرنے کی کوششوں میں صرف کرتے ہوئے نظر آتے۔ مقصد ایک دوسرے کو مرغوب کرنا ہوتا ہے ہمیں اپنی دولت سے زیادہ دلچسپی لوگوں کی تحسین سے ہے جو وہ دولت کے حصول کے لیے ہماری محنت کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ ہماری یہ دولت کرومیم سے بنے ہوئے کھلونے اور دوسری وزنی اور بے کار اشیا ہیں۔ یہ حیران کن بات ہے کہ لوگ ''ویبلن'' کے الفاظ میں اپنا تعلق امیر طبقے سے ہونے کی خوش فہمی کے باعث جنھیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا کتنی کوشش صرف کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں ''ویبلن'' نے اس روش کو شان وشوکت کے اظہار کے لیے ''نمائشی کھپت'' اور

''نمائشی ضیاع'' کے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ اس جوشِ ہمسری اور مقابلے بازی کی حامل شدید خواہش کا اظہار موزوں طریقے سے کرتے ہیں۔ اس خواہش کا مظاہرہ زیبائش و آرائش موٹر کاروں دیگر سازوسامان اور پارچات کی تبدیلی کے لامتناہی سلسلے سے ہوتا ہے۔

موجودہ (بیسویں) صدی کے اوائل میں تاریخ انسانی کے ماہرین یہ جان کر حیران رہ گئے کہ کئی قدیمی قبیلے نمائشی اصراف اور ''نمائشی ضیاع'' میں اس حد تک ملوث تھے کہ ان کا مقابلہ جدید دور کے سب سے زیادہ فضول خرچ صارفین کی معیشت سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شہرت اور مرتبے کے بھوکے لوگ اپنی تعریف اور توصیف کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے میں مصروف پائے جاتے تھے اور ہر مقابلہ بڑی بڑی دعوتیں دینے سے ہوتا تھا۔ دعوت دینے والے حریف ایک دوسرے کا موازنہ دعوتوں میں دی جانے والی خوراک کی مقدار سے کرتے تھے جو ان کی دعوت میں مہیا کی جاتی تھی اور کوئی دعوت صرف اس صورت میں کامیاب قرار دی جاتی تھی جب مہمان کھا کھا کر حواس کھو بیٹھیں اور جب تک ایسا نہ ہو وہ کھانے سے ہاتھ نہ کھینچیں جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر اور انگلیاں منہ میں مار کر قے کریں اور اس کے بعد مزید کھانے کے لیے واپس آ جائیں۔

مقام و مرتبہ حاصل کرنے کی دوڑ میں سب سے زیادہ منفرد اور نرالی مثال ''امریکی انڈینز'' میں دیکھی گئی جو پہلے جنوبی الاسکا کے ساحلی علاقوں برٹش کولمبیا اور واشنگٹن میں آباد تھے۔ یہاں بلند مرتبہ پانے کی امنگ سے سرشار لوگ جنون اور دیوانگی کی حد تک بے ضرورت نمائشی خرچ اور ''نمائشی ضیاع'' کے مرتکب ہوتے تھے جسے ''پوٹ لاچ'' کہا جاتا تھا۔ اگر ''پوٹ لاچ'' کی دعوت دینے والا کوئی مقتدر سربراہ ہوتا تو وہ اپنے حریفوں کو شرمندہ کرنے اور اپنے پیروکاروں اور حامیوں سے مستقل داد تحسین پانے کی کوشش میں خوراک، پارچات اور نقدی، ہر شے کو تباہ و برباد کر دیتا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی شہرت کی خاطر اپنے گھر تک کو جلا دیتا تھا۔

''پوٹ لاچ'' کی مشہوری ''رتھ بینڈکٹ'' کی کتاب ''تہذیب و تمدن'' کے نمونے سے ہوئی جس میں اس نے بیان کیا کہ کس طرح ''کیوا کیول'' جو جزیرہ دینکوور کے قدیمی باشندے تھے ''پوٹ لاچ'' کو روبہ عمل لاتے تھے ''بینڈکٹ'' کے خیال میں پوٹ لاچ خود بینی، خود ثنائی اور احساس برتری کے زیر اثر طرز زندگی کے ''کیوا کیول'' تمدن کی

خصوصیات کا ایک حصہ تھی۔ یہ وہ ''پیالہ'' تھا جو خدا نے انہیں دیا تھا کہ اس میں سے وہ پی سکیں تب سے ''پوٹ لاچ'' اس اعتقاد کی نشانی اور یادگار ہے کہ تہذیب وتمدن نا قابل تحقیق قوتوں اور مخبوط الحواس شخصیات کی اختراع ہیں۔ اس کتاب (تہذب وتمدن کے نمونے) کو پڑھ کر بہت سے شعبوں کے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ طرز ہائے زندگی کی سادہ، عام فہم الفاظ میں تشریح کی کوششوں کے حق میں شہرت کی آرزو مہلک ہے۔

یہاں میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ''کیوا کیول'' لوگوں میں ''پوٹ لاچ'' کسی دیوانگی خبط یا وہم کی بجائے قطعی معاشی اور ماحولیاتی حاًلت کا نتیجہ تھی۔ ان حالات کی عدم موجودگی میں شہرت کی امنگ اور دادطلبی کا اظہار بالکل مختلف معمولات زندگی سے ہوتا ہے۔ بے ضرورت نمائشی اصراف کی جگہ ضروری خریداری لے لیتی ہے غیر ضروری ضیاع ممنوع قرار پاتا ہے اور جوش ہمسری کے مقابلہ باز شوقین نہیں پائے جاتے۔

''کیوا کیول'' ساحل سمندر کے قریب برساتی جنگلوں کے درمیان صنوبر اور دیار کے چوبی تختوں سے بنے ہوئے مکانات میں بستیوں کی صورت میں آبادیوں میں رہتے تھے۔ وہ بڑی بڑی کشتیوں پر سوار ہو کر چٹانوں کے بیچوں بیچ وینکوود کے تنگ سمندری راستوں میں مچھلیاں پکڑتے اور شکار کھیلا کرتے تھے۔ وہ سمندری سفر کرنے والے تاجروں کے ہمیشہ منتظر ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کو متوجہ کرنے کی خاطر وہ اپنی بستیوں کو نمایاں کرنے کے لیے ساحل پر درختوں کے ایسے تنے ایستادہ کر دیتے تھے جن پر نقوش کندہ کئے ہوتے تھے جسے ہم غلط طور پر ''ٹوٹم پول'' (کسی قبیلے کا امتیازی نشان) کہتے ہیں۔ ان کھمبوں پر بنائے گئے نقوش کسی قبیلے کے آباواجداد کے ان اعزازات کی علامات ہوتی تھیں جن کی بنا پر بستیوں کے سربراہ ان پر اپنا حق جتاتے تھے۔

کوئی ''کیوا کیول'' سربراہ اپنے پڑوسی سرداروں کی طرف سے ملنے والی عزت اور تعظیم وتکریم پر کبھی قانع نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے مقام ومرتبے کو ہمیشہ غیر محفوظ سمجھتا تھا۔

بلاشبہ یہ درست ہے کہ اس کے خاندانی اعزازات، جن کا وہ حق مانگتا تھا اس کے آباو اجداد کی ملکیت تھے۔ لیکن ایسے اور لوگ بھی موجود ہوتے تھے جو اپنے شجرۂ نسب کا سلسلہ انہی اجداد سے ملاتے تھے اور خود کو سربراہ تسلیم کرانے میں اس کے حریف ہوتے تھے۔ اس لئے ہر سربراہ اس ضرورت کو محسوس کرتا تھا کہ اپنے استحقاق کو جائز اور برحق ثابت

کرے۔ اس کے لیے مقررہ طریقہ کار ''پوٹ لاچ'' دعوتوں کا انعقاد تھا۔ ایسی ہر دعوت ایک میزبان سربراہ اور اس کی برادری کی طرف سے ایک مہمان سردار اور اس کی برادری کے رتبے کا حق دار تھا اور وہ مہمان سردار سے بلند تر تھا۔ اس نکتے کو ثابت کرنے کے لئے میزبان سربراہ اپنے حریف سربراہ اور اس کے ساتھیوں کو بڑی مقدار میں بیش قیمت تحائف دیتا تھا۔ مہمان یہ تحائف وصول کر کے سبکی محسوس کرتے تھے اور عہد کرتے تھے کہ وہ ایک جوابی ''پوٹ لاچ'' دعوت کریں گے جس میں ان کا اپنا سربراہ، زیادہ قیمتی تحائف اور وہ بھی زیادہ مقدار میں دے کر ثابت کرے گا کہ وہ پہلے میزبان سے زیادہ بڑا ہے۔

''پوٹ لاچ'' دعوتوں کی تیاریوں کے سلسلے میں تازہ اور خشک مچھلی، مچھلی کا تیل، گٹھلی کے بغیر رسیلے پھل، جانوروں کی کھالیں، کمبل اور دوسری قیمتی اشیا کا ذخیرہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔ مقررہ دن پر مہمان میزبانوں کے گاؤں پہنچتے اور سربراہ کے گھر جاتے۔ یہاں وہ سالمن مچھلی اور جنگلی پھول ڈٹ کر کھا کھا کر پوری طرح سیر ہوتے جبکہ ناچنے والوں کے طائفے بارش برسانے اور بجلی کڑکانے کے اہل پرندے دیوتاؤں اور بلاؤں کے روپ بہروپ کا سوانگ بھرنے والے نقاب اوڑھے ان کی تواضع کرتے۔

میزبان سربراہ اور اس کی رعایا کے لوگ صاف ستھری ڈھیریوں کی شکل میں دولت کے انبار سجا دیتے جو مہمانوں میں تقسیم کی جانی مقصود ہوتی تھی۔ مہمان آزردہ نگاہوں سے میزبان کو تکتے رہتے تھے جب کہ وہ اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے ڈینگیں مارتا پھرتا تھا کہ وہ کتنا کچھ ان کو دینے والا تھا۔ وہ مچھلی کے تیل سے بھرے ڈبوں، پھلوں کی ٹوکریوں اور کمبلوں کے ڈھیروں کی گنتی کرتے ہوئے تمسخرانہ اور تضحیک آمیز انداز میں اپنے حریفوں کی مفلسی پر تبصرہ کرتا تھا۔ بالآخر، تحفوں سے لدے ہوئے مہمانوں کی اپنے گاؤں کو واپسی شروع ہوتی۔ حسد کی آگ میں جل کر مہمان سربراہ اور اس کی رعایا کے لوگ حساب برابر کرنے کا حلف لیتے۔ اس مقصد میں کامیابی صرف اپنے حریفوں کو ایک جوابی دعوت پر مدعو کرنے اور انہیں قیمتی اشیا کے تحفے، ان کی طرف سے دئے گئے تحفوں کی نسبت زیادہ بڑی مقدار میں قبول کرنے پر مجبور کرنے سے ہوسکتی تھی۔ اگر سب ''کیوا کیول'' بستیوں کو ایک اکائی سمجھا جائے تو ''پوٹ لاچ'' کی یہ دعوتیں شہرت اور نادر قیمتی اشیا کے مخالف سمتوں میں بہاؤ کا لامتناہی سلسلہ بن جاتی تھیں۔

MashalBooks.org

کسی اولوالعزم سردار اور اس کے زیر اطاعت لوگوں کو ''پوٹ لاچ'' دعوت کے ضمن میں بہ یک وقت مختلف دیہات کے کئی حریفوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ تخمینہ لگانے والے ماہرین اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتے تھے کہ ہر گاؤں میں حساب چکانے کے لیے کیا کچھ کیا جانا چاہیے۔ اگر کوئی سربراہ ایک جگہ اپنے حریفوں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہوتا تو بھی اسے کسی دوسری جگہ اپنے مخالفین کا سامنا ہوتا تھا۔

کسی ''پوٹلیچ'' دعوت میں میزبان سربراہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتا تھا: ''میں واحد بڑا آدمی ہوں۔ اپنے جائداد گننے والے لاؤ تاکہ وہ، جتنا کچھ میں بانٹوں گا اس کو گننے کی ناکام کوششیں کرلے۔'' اس کے بعد سربراہ کے مقلدین، مہمانوں سے خاموشی کا مطالبہ کرتے اور یہ انتباہ کرتے کہ: ''اے قبیلے والو! سنو، شور نہیں مچاؤ۔ خاموش رہو ورنہ ہم اپنے سربراہ کی بے پناہ دولت کے پہاڑ الٹ دیں گے۔'' کئی ''پوٹلیچ'' دعوتوں میں قیمتی تحفے تقسیم کرنے کی بجائے انہیں تباہ اور ضائع کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات کامیاب ''پوٹلیچ'' کے بعد سربراہان ''چکنائی کی دعوت'' منعقد کرنے کا فیصلہ کرتے تھے جس میں کینڈل مچھلی سے حاصل ہونے والے تیل کے بھرے ڈبوں کو گھر کے وسط میں آگ پر الٹ دیا جاتا تھا۔ مہمان مضطرب ہو کر بیٹھے رہتے۔ جوں ہی آگ کے شعلے اوپر اٹھتے، چکنائی کا سیاہ دھواں کمرے میں بھر جاتا۔ مہمان ہوا میں ٹھنڈک سے کپکپی کی شکایت بھی کرتے، جبکہ دولت کو ضائع کرنے والا ڈینگیں مارتا یہ: ''زمین پر میں واحد ہستی ہوں۔ پوری دنیا میں واحد قوت ہوں جو سال کے شروع سے آخر تک مدّعو کئے جانے والے قبیلوں کے لئے اس دھوئیں کو بلند کرتی ہے۔'' کئی ''چکنی دعوتوں'' میں آگ کے شعلوں سے چھت کے چوبی حصے جل اٹھتے اور پورا گھر ''پوٹلیچ'' کی نذر ہو جاتا جو مہمانوں کی بے انتہا شرمندگی اور میزبانوں کی بے حد خوشی کا باعث بنتا۔

رتھ بینڈکٹ کی رائے میں نمائشی دعوتوں کا سلسلہ ''کیوا کیول'' سربراہوں کی اس دھن کا نتیجہ تھا جو مقام و مرتبے کی طلب کے لیے ان کے دل و دماغ پر سوار تھی، وہ لکھتی ہیں کہ: ''دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے معیار سے پرکھا جائے تو ان کے سربراہوں کی تقریریں کسی شرمندگی کے بغیر اپنی برتری کے دیوانہ وار احساس کی آئینہ دار ہیں۔'' وہ مزید کہتی ہیں کہ ''کیوا کیول'' لوگوں کی ساری سرگرمیوں کا اصل مقصد خود کو اپنے حریفوں کے

مقابلے میں بالاتر اور اعلیٰ تر دکھانا ہوتا تھا۔'' ان کے خیال میں بحرالکاہل کے شمال مغرب کا پہلا اور اصلی اقتصادی پورا نظام اسی دیوانہ وار خبط کی تسکین کے لئے وقف تھا۔

میرا خیال ہے کہ ''بینڈکٹ'' سے بھول ہوئی ہے۔ ''کیوا کیول'' کا اقتصادی نظام مقام و مرتبے کی حریفانہ کشمکش کے تابع نہیں تھا بلکہ مرتبے کی یہی رقابت اقتصادی نظام کی معاون تھی۔

''کیوا کیول'' کی نمائشی دعوتوں کے اس معمول میں بے جا اختلاف کے پہلوؤں کو چھوڑ کر، اس کے باقی سب لوازمات، کرہ ارض کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے قدیم اور پسماندہ معاشروں میں موجود ہیں۔ مکمل تجزیے سے ''پوٹلیچ'' کی مخفی مصلحتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مسابقت کی دوڑ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو ایسی قوموں میں جنہوں نے ابھی مکمل طور پر حکمرانی حاصل نہیں کی وہاں دولت کی افزائش اور تقسیم کی تقریباً عالمگیر ترکیب ہے۔

آج ملنیشیا اور نیوگنی میں دی جانے والی دعوتیں قدیم دور کی مقابلے بازی کی خاطر دی جانے والی نمائشی دعوتوں کی جھلکیاں دیکھنے کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ اس پورے علاقے میں نام نہاد ''بڑے لوگ'' موجود ہیں اور ان کی مزعومہ بڑائی کی وجہ، کثیر تعداد میں دعوتیں ہیں جو ان میں سے ہر ایک عمر بھر دیتا رہا ہے۔ ہر دعوت دینے سے پہلے بڑا بننے کی خواہش سے مغلوب ہر شخص کو اس کے لئے درکار ضروری دولت اکٹھی کرنی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر جزائر ''سولمین'' کے ''کاؤکا'' زبان بولنے والے شہرت اور نام و نمود کے بھوکے لوگوں میں اگر کوئی شخص ''بڑا آدمی'' بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے بیوی بچوں سے ''یامز'' (کچالو کی قسم کی ایک سبزی) کے زیادہ باغات کاشت کرانے سے آغاز کرتا ہے۔ جیسا کہ آسٹریلوی ماہر انسانیات ''جان ہاگبین'' بیان کرتے ہیں کہ ''بڑا آدمی'' بننے کا خواہشمند اپنے رشتہ داروں اور ہم عصر ساتھیوں سے مچھلی کے شکار میں مدد لیتا ہے۔ اس کے بعد اپنے دوستوں سے سؤرونیوں کا طلب گار ہوتا ہے اور یوں اپنے سؤروں کے ریوڑوں کی تعداد اور حجم میں اضافہ کرتا ہے۔ جب ان کے بچے پیدا ہونے لگتے ہیں تو زائد جانوروں کو وہ اپنے ہمسایوں کے ہاں رکھتا ہے۔ جلد ہی اس کے رشتہ دار اور دوست محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ''بڑا آدمی'' بننے والا ہے۔ وہ اس کے وسیع باغات اور سؤروں کے بڑے ریوڑ دیکھتے ہیں تو وہ آنے والی دعوت کو کامیاب اور یادگار بنانے کے لئے اپنی

MashalBooks.org

کوششیں اور بڑھا دیتے ہیں۔ جب وہ ''بڑا آدمی'' بن جاتا ہے تو وہ اسے یاددہانی کراتے ہیں کہ انہوں نے اس کی مدد کی تھی۔ آخر میں وہ سب اکٹھے ہو کر ایک نہایت عمدہ مکان تعمیر کرتے ہیں۔ پھر یہ لوگ مچھلی کے شکار کی آخری مہم پر نکلتے ہیں۔ عورتیں ''یامز'' کی فصل کی کٹائی کرتی اور ایندھن کے لیے لکڑیاں، کیلوں کے پتے اور ناریل جمع کرتی ہیں۔ جب مہمان پہنچتے ہیں ''پوٹلیچ'' (دعوت کی طرح) دولت کے انبار، صاف ستھری ڈھیروں کی صورت میں نمائش کے لیے سجا دیئے جاتے ہیں تا کہ ہر کوئی انہیں گن سکے اور تعریف کرے۔

''اتانا'' نامی ایک نوجوان کی دعوت کے دن ''ہابگبین'' نے درج ذیل اشیا کی گنتی کی: 250 پونڈ خشک مچھلی، 3000 پونڈ پھل، یامز اور ناریل کیک 11 عدد یامز اور ناریل کے حلوے کے پیالے اور 8 سؤر کے بڑے ڈونگے۔ یہ سب اس زائد محنت اور کام کا براہ راست نتیجہ تھا جس کا اہتمام ''اتانا'' نے کیا تھا۔ لیکن کئی دوست موقع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے از خود اپنے ساتھ کچھ تحائف لائے اور انہیں بھی سامان میں شامل کر دیا گیا۔ ان کی طرف سے دیئے گئے سامان کے بعد ان اشیا کی تعداد یوں ہو گئی: مچھلی 300 پونڈ، پھل 5000 پونڈ، حلوہ 19 پونڈ، سؤر 13۔ ''اتانا'' ان تحائف کو 257 حصوں میں بانٹنے لگا، اس طرح کہ ہر ایک کو ایک حصہ ملے۔ لیکن اپنے مددگار لوگوں اور تحائف لانے والوں کے لیے دوسروں کی نسبت زیادہ مقدار ہو۔ ہابگبین نے نوٹ کیا کہ اتانا کے اپنے لئے دیگ کی کھرچن کی طرح صرف بچا کچا سامان ہی باقی رہا۔ ''گواڈل کنال'' میں شہرت کے طلب گاروں کے نزدیک یہ عام سی بات ہے جو ہمیشہ کہتے ہیں کہ ''دعوت دینے والوں کے اپنے حصے میں صرف ہڈیاں اور باسی کیک ہوتے ہیں، گوشت اور چکنائی دوسرے لے جاتے ہیں۔''

''پوٹلیچ'' دعوت کی مانند ''بڑے آدمیوں'' کی دعوتوں کے دن بھی کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ ہر ''بڑا آدمی'' اس اندیشے سے خائف ہو کر کہ کہیں وہ اپنا مقام و مرتبہ کھو کر عوامی سطح کی حیثیت میں نہ دھکیل دیا جائے وہ خود کو اگلی دعوت کے پروگرام اور اس کی تیاریوں میں مصروف ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ چونکہ ہر گاؤں اور ہر برادری میں کئی ''بڑے لوگ'' ہوتے ہیں اس لئے ان منصوبوں اور تیاریوں کے سلسلے میں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی اطاعت اور فرماں برداری کے حصول میں بڑی پیچیدہ مقابلے بازی اور اکھاڑ پچھاڑ سے کام لینا پڑتا ہے۔ ''بڑے آدمیوں'' کو باقی (دوسرے) ہر شخص کی نسبت، محنت سخت تر، تردّد

MashalBooks.org

زیادہ، اور کھانے کو کمتر نصیب ہوتا ہے۔ ان کو ملنے والا واحد صلہ شہرت اور شان وشوکت ہوتی ہے۔

''بڑے آدمی'' کو ایک ایسے سرمایہ کار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کی افرادی قوت بھی خود اسی کی اپنی ذات پر مشتمل ہوتی ہے۔ روسی انہیں ''سٹاک ہیوڈائس'' کہتے ہیں جو پیداوار کی سطح میں اضافہ کر کے معاشرے کی خدمت بجا لاتے ہیں۔ ''بڑے آدمی'' کی شان وشوکت اور رتبے کی امنگ کے باعث زیادہ لوگ زیادہ محنت کرتے اور یوں خوراک اور دوسری قیمتی اشیا کی پیداوار بڑھاتے ہیں۔

ان حالات میں جہاں ہر شخص کو گزر اوقات کے یکساں مواقع میسر ہوں، وہاں ''مسابقت'' کی دعوتیں، افرادی قوت کی پیداواری صلاحتیں، اس شدید حد تک متاثر نہیں ہوتیں کہ جنگ، بحران یا فصل کی ناکامی کی صورت میں تحفظ ممکن نہ رہے۔ اس کے علاوہ کسی ایسے رسمی سیاسی ادارے کے عدم موجودگی میں جو آزاد دیہات کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مشترکہ معاشی اکائی میں ڈھال سکیں وہاں مقابلے بازی کی دعوتیں معاشی توقعات کا ایک وسیع جال بن دیتی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وسیع تر آبادیوں کی پیداواری کوششیں یک جا ہو جاتی ہیں جو کسی ایک گاؤں کی کوششوں سے متحرک نہیں کی جا سکتیں۔ آخر میں یہ کہ مختلف دیہات میں ان کے مختلف محل وقوع سے متعلق ماحولیاتی اثرات، مثلاً ساحلی علاقہ، دلدل، کیچڑ یا نیم کوہستانی ہونے کے باعث، ان کی سالانہ پیداوار میں جو اتار چڑھاؤ اور کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس کے اثرات کو ''بڑے آدمیوں'' کی دعوت خود بخود برابر کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی سال کے دوران میں، سب سے بڑی دعوتیں ان دیہات والوں کی طرف سے ہوں گی جہاں بارش، درجہ حرارت اور ہوا میں نمی وغیرہ کے حالات سازگار ہوں گے۔

ان سب باتوں کا اطلاق ''کیوا کیول'' پر بھی ہوتا ہے۔ ''کیوا کیول'' سربراہان بھی ملینشائی باشندوں کے ''بڑے آدمیوں'' کی مانند تھے، سوائے اس فرق کے کہ وہ نسبتاً زیادہ سازگار ماحول میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے، زیادہ مفید ترکیبوں کو استعمال کرتے تھے۔ ''بڑے آدمیوں'' کی طرح وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ بازی کرتے تھے تاکہ مردوں اور عورتوں کو اپنی بستیوں کی طرف متوجہ کریں۔ جو سب سے بڑے سربراہان

ہوتے تھے وہی سب سے بڑے تقسیم کار (معطّی) بھی تھے اور سب سے زیادہ دعوتیں بھی ان ہی کی طرف سے ہوتی تھیں۔ سربراہ کی رعایا کے لوگ بھی اس کی شہرت یابی کی کاوشوں میں ہاتھ بٹاتے اور ہر طرح سے مددگار ہوتے تھے تاکہ اور زیادہ بلند سے بلند تر مرتبے اور اعزاز حاصل ہوں۔ سربراہ اپنے منقش امتیازی کھمبوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ کھمبے درحقیقت اس عظمت کا اظہار تھے کہ ''یہاں پر ایک ایسی بستی آباد تھی جس کا سربراہ بڑا طاقت ور اور عظیم تھا جو زبردست کارنامے سرانجام دیتا تھا اور اپنی رعایا کو قحط اور بیماری سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ان کھمبوں پر جانوروں کے سروں کے نشانات کندہ ہوتے تھے۔ اس کا مقصد اپنے موروثی حقوق کا مطالبہ تھا اور ان کے توسط سے سربراہ دراصل یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ خوراک اور آسائش فراہم کرنے پر قادر تھے۔ ''پوٹلیچ'' اپنے حریفوں کو یہ بتانے کا ذریعہ تھا کہ برداشت کرو یا چپ رہو۔

''پوٹلیچ'' میں ضرورت سے زیادہ مقابلہ بازی کے دباؤ کے باوجود یہ پرانے زمانوں میں پیداوار کے مرکزی دیہات سے کم پیداوار والی آبادیوں کو خوراک اور دوسری قیمتی اشیا منتقل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتا تھا۔ بلکہ میں زیادہ واضح اور پرزور الفاظ میں یہ کہوں گا کہ مسابقت کا یہ دباؤ ان اشیا کا تبادلہ یقینی بناتا تھا۔ مچھلی کی ضیافت، جنگلی پھل اور سبزیوں کی فصلوں سے پیداوار وغیرہ میں کمی بیشی کے باعث، جس کا قبل از وقت اندازہ نہیں ہوسکتا تھا، مختلف دیہات کے مابین ہونے والی نمائشی دعوتوں کا سلسلہ خطے کے مختلف حصوں کی آبادیوں کے حق میں مجموعی طور پر سودمند تھا۔ جب کسی آبادی کے قریبی ندی نالوں میں مچھلی بچے دیتی تھی اور ملحقہ باغات میں پھل پک کر تیار ہوتے تھے تو پچھلے سال مہمان بننے والے اب کی بار میزبان بن جاتے تھے۔ بالکل ابتدا میں ''پوٹلیچ'' دعوتوں کا مقصد یہ تھا کہ آسودہ حال اور مراعات یافتہ لوگ کچھ دیتے تھے اور غیر مراعات طبقے کے غریب اور نادار لوگ کچھ لیتے تھے۔ کھانے کے عوض ہر مفلس شخص کو صرف یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ حریف سربراہ بڑا آدمی تھا۔

رتھ بینڈکٹ کی توجہ ''پوٹلیچ'' کی بنیادی وجہ کی طرف کیوں نہیں گئی؟ علم بشریات کے ماہرین نے ''پوٹلیچ'' کا رتجزیہ اور اس پر تحقیق اس وقت کے بہت بعد میں شروع کی جب شمال مغربی اوقیانوس کے علاقے کے قدیمی باشندے روس، انگلستان، کینیڈا اور امریکہ سے

آئے ہوئے تاجروں اور آبادکاروں سے تجارتی اور محنت مزدوری کے تعلقات قائم کر چکے تھے۔ اس تعلق اور واسطے سے بہت جلد چیچک اور یورپ سے آمدہ دوسری وبائی امراض پھوٹ پڑیں۔ جس سے مقامی آبادی کا بہت بڑا حصہ ہلاک ہوگیا۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ ''کیوا کیول'' کی آبادی جو 1836 میں 23,000 تھی، گھٹتے گھٹتے 1886 میں 2,000 رہ گئی۔ اس کمی سے خود بخود قدرتی طور پر افرادی قوت کی مانگ میں شدت آئی۔ اس کے ساتھ ہی یورپی اقوام کی طرف سے ادا کئے جانے والے معاوضوں میں اضافے کے سبب ''پوٹلیچ'' کے پھیلے جال میں دولت کا بے پناہ اضافہ ہوگیا۔

ہڈسن بے کمپنی سے کیوا کیول لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں کمبل جانوروں کی کھالوں کے تبادلے میں وصول کئے۔ بڑی بڑی ''پوٹلیچ'' دعوتوں میں ان کمبلوں نے نہایت اہم شے کی طرح خوراک کی جگہ لی اور لوگوں میں بانٹے گئے۔ گھٹتی ہوئی آبادی کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ وافر تعداد میں کمبل اور دوسری قیمتی اشیا جمع ہوگئیں۔ اس کے باوجود افرادی قوت کی کمی نے جو صورت اختیار کی اس سے اپنی رعایا کو قابو میں رکھنے کی ضرورت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ ''پوٹلیچ'' منعقد کرنے والے سرداروں نے جائدادوں کو تباہ و مسمار کرنے کا حکم اس موہوم امید پر دیا کہ دولت کی فراوانی کے لیے قابل دید مظاہروں سے متاثر ہوکر لوگ اپنی خالی بستیوں میں واپس لوٹ آئیں گے، لیکن یہ سب کچھ ایک دم توڑتے ہوئے ایسے تمدن اور ثقافت کے آئینہ دار تھے جو نئی سیاسی اور اقتصادی صورت حال اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ قدیم دور کے ''پوٹلیچ'' سے ان کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔

مقابلے کی دوڑ میں دی جانے والی دعوتوں سے متعلق سوچ، ان کے بیان اور ان کے شرکاء کے تصورات، اس زاویہ نگاہ سے بالکل مختلف ہیں جو ''پوٹلیچ'' دعوتوں کی مالی مجبوریوں کے دباؤ اور مواقع سے موافقت کا ذریعہ ہونے سے دیکھتا ہے۔ معاشرتی سطح کی سوچ کے مطابق ...... طرز تمدن سے آگاہی کے بعد ''پوٹلیچ'' دعوتوں، ان کے شرکاء کی نظروں میں، ''بڑے آدمیوں'' یا ''پوٹلیچ سرداروں'' کی ناقابلِ تسکین شہرت کی خواہش کا اظہار ہیں۔ لیکن اس کتاب میں اپنائے گئے نقطہ نظر کے مطابق، شہرت کی ناقابل تسکین امنگ اور طلب کا اظہار ان مقابلے کی دعوتوں سے ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں تعریف و توصیف کی ضرورت

سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے لیکن ہر معاشرہ شہرت کا تعلق مقابلے بازی پر مبنی دعوتوں سے نہیں جوڑتا۔

مسابقت اور مقابلے کی آئینہ دار دعوتوں کو، شہرت اور ناموری کا ذریعہ ہونے کو، اس کے ارتقائی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے تا کہ ان کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔ ''اتانا'' کی طرح ''بڑے لوگ'' ہوں یا ''کیوا کیول'' سردار، وہ ایک طرح کا اقتصادی اور معاشی تبادلہ عمل میں لاتے ہیں جسے از سرِ نو تقسیم کیا جاتا ہے یعنی یہ کئی لوگوں کی پیداواری کوششیں یک جا کر کے ان سے حاصل ہونے والے نتائج اور اس طرح جمع ہونے والی دولت کو مختلف طبقوں کے لوگوں میں مختلف مقدار میں دوبارہ تقسیم کرنے کا عمل ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ''کاؤکا'' کے ''بڑے آدمی'' کے حصے میں بستی کے باقی سب لوگوں کی نسبت، محنت سخت تر فکر زیادہ اور کھانے کو خوراک کمتر آتی ہے، ''کیوا کیول'' سردار کے بارے میں درست نہیں۔ بڑی ''پوٹلیچ'' دعوتوں کا اہتمام کرنے والے سردار صرف سرمایہ کاری اور انتظامی امور سے متعلق فرائض، جو ایک بڑی دعوت کے لیے ضروری ہوتے تھے، سرانجام دیتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار مچھلی پکڑنے یا سمندری شکار کی مہموں کے علاوہ باقی سخت ترین کام اور فرائض اپنے تابع لوگوں کے ذمے چھوڑ دیتے تھے۔ ''پوٹلیچ'' دعوتوں کے بہت بڑے سربراہان کے پاس کچھ جنگی قیدی بھی ہوتے تھے جو ان کے لیے غلاموں کے فرائض ادا کرتے تھے۔ کھپت کے سلسلے میں حاصل اپنے استحقاقات کے ضمن میں، ''کیوا کیول'' سرداروں نے ''کاؤکا'' فارمولے کے برعکس عمل شروع کر دیا تھا اور گوشت اور چربی کا کچھ حصہ وہ اپنے لئے رکھ چھوڑتے تھے اور زیادہ تر ہڈیوں اور باسی کیکوں پر مشتمل حصہ اپنے پیروکاروں کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔

''اتانا'' سے شروع ہونے والا عمل کئی ارتقائی مرحلوں سے گزرا۔ خود ہی ''سرمایہ کار'' اور خود ہی ''افرادی قوت'' بننے والا ''بڑا آدمی'' کی منزل سے گزر کر (اس کے بعد) نیم موروثی سربراہان تک پہنچنے کے بعد، بالآخر وہ اس سفر کا انجام مملکت کی سطح کے معاشروں کی شکل میں دیکھتے ہیں جو موروثی بادشاہوں کی حکمرانی ہے ...... جو خود کچھ نہیں کرتے، کوئی بنیادی فرائض ادا نہیں کرتے، خواہ وہ صنعتی شعبوں سے متعلق ہوں یا زرعی شعبوں کی محنت ومشقت سے۔ دوسری طرف ہر شے کا اعلیٰ ترین اور وافر ترین حصہ اپنے پاس رکھ چھوڑتے

ہیں۔ شاہانہ سطح پر حکومت کرنے کے خدائی حق دار، یہ عالی مرتبت حکمران اپنی شان وشوکت اور شہرت قائم رکھنے کے لئے نمائشی محلات اور مندر، عالی شان مقبرے تعمیر کراتے ہیں تاکہ اپنے اس حق کو چیلنج کرنے والوں کو باطل اور اپنے موروثی حقوق کو جائز قرار دے سکیں...... ''پوٹلیچ'' دعوتوں کے ذریعے نہیں بلکہ مسلح قوت کے بل بوتے پر۔ اگر ہم الٹی سمت کو یعنی پیچھے کی طرف چلیں اور جائزہ لیں تو بادشاہوں کے دور سے ''پوٹلیچ'' سرداروں تک اور ''بڑے لوگوں'' تک پہنچتے ہیں۔ ان مرحلوں کے ذریعے ہم ایسی معاشرت اور طرز ہائے زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں جس میں افراد کے لیے نمودونمائش اور مقابلے بازی کے مظاہرے اور مواقع ناپید تھے۔ جس کے باعث کوئی سر پھرا بیوقوف اپنے بڑے پن کی شیخی بگارتا تو اس پر جادوٹونے کا اثر اور بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر اسے پتھر مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔

صحیح معنوں میں مساوات (ہر ایک کے لیے مساوی مواقع اور یکساں مرتبہ) کے حامل معاشروں کا طویل دور ماہرین انسانیات کے زیر تحقیق و مطالعہ رہا ہے جس میں دولت کی تقسیم کے لئے مقابلے کی دعوتیں نہیں ہوتیں۔ اس کی بجائے اشیا کی تقسیم کے لئے زیادہ تر طرفین کے مابین باہمی لین دین کا دو طرفہ طریقہ رائج ہے۔ ''دوطرفہ باہمی لین دین'' ایک ٹیکنیکی اصطلاح ہے جس کے ذریعے دو افراد کے درمیان اقتصادی ادل بدل عمل میں آتا ہے۔ اس ادل بدل میں کوئی بھی فریق، اپنی طرف سے دی جانے والی چیز کے بدلے میں کوئی مخصوص مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ کیا توقع رکھتا ہے اور کب رکھتا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ دوطرفہ تبادلے بظاہر بالکل کوئی لین دین دکھائی نہیں دیتے۔ ایک فریق کی توقعات اور دوسرے کی احسان مندی بیان نہیں کی جاتی۔ ایک پارٹی دوسری سے لئے چلے جانے کا عمل خاصے عرصے تک جاری رکھ سکتی ہے۔ اس میں دینے والی پارٹی کوئی مزاحمت اور روک ٹوک کرتی ہے اور نہ لینے والی کو کوئی پریشانی یا گھبراہٹ ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس لین دین کو خالصتاً تحفہ ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ در پردہ اس کی واپسی کی توقع موجود ہوتی ہے اور اگر دو افراد کے مابین لین دین کے سلسلے کا توازن بڑی حد تک بگڑ جائے تو دینے والا بالآخر بڑبڑانا اور چرچا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لینے والے کی صحت تندرستی اور عقل سے متعلق تشویش کا اظہار ہوتا ہے اور اگر صورت حال میں کوئی بہتری نہ ہو تو لوگ

اس شبہ میں پڑنا شروع ہو جاتے ہیں کہ لینے والا بدروحوں اور بھوت پریت کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ یا خود کسی جادوٹونے کا سہارا لے رہا ہے۔ مساوات اور سب کے لیے یکساں مواقع کے علمبردار معاشروں میں ایسے افراد کو، جوتواتر کے ساتھ باہمی لین دین کے قواعد کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں نفسیاتی مریض اور اپنی برادری کے لیے وبال جان سمجھا جاتا ہے۔

اشیا کے ان باہمی تبادلوں کو سمجھنے کے لئے، ان سے متعلق کچھ اندازہ ہم اس طریقے سے لگا سکتے ہیں جس کے تحت ہم اپنے گہرے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں سے اشیا اور خدمات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بھائیوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک دوسرے کے لئے جو کچھ کرتے ہیں، اس سب کی قیمت عین ڈالروں کے حساب سے لگائی جائے۔ انہیں خود کو ایک دوسرے کی قمیض یا فوٹوگراف کے البم عاریتاً لینے میں بالکل آزاد سمجھنا چاہیے اور کوئی ''عنایت'' یا رعایت سمجھ کر طلب کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے۔ بھائی بھائی یا دوست ہونے کی صورت میں دونوں قبول کرتے ہیں کہ اگر ایک دوسرے کو دینا زیادہ اور لینا اس سے کم ہے تو اس سے دونوں کے درمیان رشتہ متاثر نہیں ہوگا۔ اگر ایک دوست دوسرے کو کھانے پر بلاتا ہے تو دوسری یا تیسری مرتبہ بھی دینے یا اسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے خواہ پہلے کھانے کا بدلہ چکانا ابھی باقی ہو۔ لیکن اس روش کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کیونکہ کچھ عرصہ تک بدلہ دیے یا اتارے بغیر، یک طرفہ طور پر تحفے لئے چلے جانے سے استحصال کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اسے دوسرے کا مال ہڑپ کرنے والا سمجھا جائے۔ یہ گومگو اور کشش و پیچ سے ملتی جلتی ویسی ہی صورت حال ہوتی ہے جس کا ہم کرسمس کے موقع پر سامنا کرتے ہیں، جب ہم دینے کے لئے تحفوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں تو ''ادلے کا بدلہ'' کے اصول کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ تحفہ نہ بہت زیادہ قیمتی ہو نہ بہت کم قیمت۔ پھر بھی ہم اس پر لکھی ہوئی قیمت کا ''ٹیگ'' اتار دیتے ہیں تا کہ یہ محسوس نہ ہو کہ اس کی مالیت ہمارے پیش نظر ہے۔

لیکن اگر آپ کسی کے ''زیر بار احسان ہونے کا بدلہ اتارنے'' کو حقیقی معنوں میں مروّج دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو مساوات کے حامل معاشرے میں رہنا ضروری ہے جہاں مال متاع، نقدی اور روپے کی صورت میں نہیں ہوتا اور کوئی چیز خریدی یا

MashalBooks.org

بیچی نہیں جا سکتی۔ وہاں احسان مندی کے احساس کو زائل کرنے لئے مالیت کی بنیاد پر قدر و قیمت جانچنے کا کوئی تصور نہیں ہے کہ کسی شخص اس کا جواب اثبات یا نفی میں ہونے سے یہ بتا سکتا ہے کہ ان کے طریق زندگی کی بنیاد ''احسان مندی کے بدلے احسان مندی'' پر ہے یا کسی اور طرز پر، اصل اور صحیح اشتراکی معاشروں میں مادی ساز و سامان یا خدمات پیش کرنے پر شکر گزار ہونا، گستاخی کے مترادف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وسطی ملایا کے سمائی باشندوں میں بھی کوئی شخص اس پر ممنونیت کا اظہار نہیں کرتا جب کوئی شکاری اپنے ساتھیوں کو بالکل برابر حصوں میں گوشت بانٹتا ہے۔ رابرٹ ڈینٹن نے، جو سمائی باشندوں کے ساتھ رہتا رہا، دیکھا کہ ''آپ کا شکریہ'' کہنا گستاخی تھا۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو آپ گوشت کے اس ٹکڑے کی قیمت کا تعین کر رہے ہوتے ہیں جو آپ کو ملا یا پھر آپ شکاری کی کامیابی اور سخاوت پر حیران ہو رہے ہوتے ہیں۔

''کاؤکا'' کے ''بڑے آدمی'' جو شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے ہیں یا ''پوٹلیچ'' دعوتوں پر ڈینگیں مارنے والے مغرور سرداروں اور خود ہمارے اپنے خودنمائی اور فضیلت کے خواہاں لوگوں کے برعکس ''سمائی'' ایک ایسے طریق زندگی پر کاربند ہیں جس میں سب سے زیادہ کامیاب لوگ نمود و نمائش کے معاملے میں سب سے زیادہ گریز کرتے ہیں۔ برابری اور مساوات پر قائم، ان کے معمولات زندگی میں مقام و مرتبے کی حریفانہ کشمکش کے تحت، مال و دولت کی تقسیم یا نمود و نمائش پر مبنی اصراف اور ضیاع کی کسی شکل کا معنوی لحاظ سے تصور بھی محال ہے۔ برابری اور مساوات پر عمل پیرا اقوام کسی خفیف ترین ایسے اشارے کنائے سے، جس کا مقصد یہ احساس دلانا ہو کہ ان سے فیاضانہ سلوک کیا جا رہا ہے یا کسی ایسے شخص سے جو خود کو دوسرے سے افضل سمجھے، کنارہ کش اور خوفزدہ ہوتی ہیں۔

مساوات کے حامی شکاریوں اور ان کے ہمراہیوں کے نزدیک احساس مندی کے جذبے کے تحت اشیا کے تبادلے کے کیا معنی ہیں، اس بارے میں ٹورنٹو یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈلی ایک دلچسپ کہانی سناتے ہیں۔ ایک سال یا زیادہ تر عرصہ انہوں نے افریقا میں راس امید کے نزدیک ''کالاہاری'' کے ریگستان میں رہنے والے قدیم نسل کے لوگ (بش مین) کے ساتھ گزارا اور یہ مشاہدہ کرتے رہے کہ وہ کھاتے کیا تھے۔ افریقی ''بش مین'' بڑے متواضع تھے اور پروفیسر لی اپنے سپاس گزار ہونے کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن

ان کے پاس انہیں دینے کو ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو ان کے عام غذائی معمول اور سرگرمیوں میں رخنہ نہ ڈالے۔ جب کرسمس قریب آئی تو لی کو اس امکان کا علم ہوا کہ شائد ''بش مین'' ریگستانی صحرا کے کنارے پر واقع بستیوں میں عارضی قیام کریں گے جہاں سے وہ کبھی کبھی تجارتی لین دین کے ذریعے گوشت حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کو کرسمس کے موقع پر ایک عدد بیل بطور تحفہ پیش کرنے کی نیت سے وہ اپنی جیپ میں ایک سے دوسری، کئی بستیوں میں گئے تا کہ وہ ایک بڑا بیل خرید سکیں۔ کافی دور کے ایک گاؤں میں آخر کار انہوں نے ایک دیو قامت بیل تلاش کر لیا جو خوب موٹا تازہ تھا اور چربی کی تہہ اس کے بدن پر چڑھی ہوئی تھی ''بش مین'' کے لیے چربی والا گوشت بہت مرغوب غذا ہے کیونکہ جو جانور شکار میں ان کے ہاتھ لگتے ہیں وہ بالعموم لاغر اور کمزور ہوتے ہیں۔ اپنی قیام گاہ پر واپس آ کر ''لی'' اپنے ''بش مین'' ساتھیوں کو ایک طرف لے گئے اور باری باری ہر ایک کو بتایا کہ انہوں نے ایک اتنا بڑا بیل خریدا ہے جتنا بڑا انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا اور یہ بیل وہ کرسمس پر کاٹنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔

پہلا شخص جس نے یہ بات سنی، چونک سا گیا۔ اس نے لی سے پوچھا کہ اس نے بیل کہاں سے خریدا۔ اس کا رنگ کیا تھا اور اس کے سینگ کتنے بڑے تھے؟ پھر اس نے سر ہلا کر کہا ہاں میں نے وہ بیل دیکھا ہوا ہے۔ وہ تو ہڈیوں اور کھال کا ڈھانچہ ہے۔ آپ نے اسے کیوں خریدا؟ ایسا بے کار جانور خریدتے وقت آپ نے ضرور پی رکھی ہوگی۔ لی اپنے اس یقین کی بنا پر کہ درحقیقت اس کے دوست نے وہ بیل نہیں دیکھا تھا جس کا وہ ذکر کر رہا تھا بہت سے دوسرے، ''بش مینوں'' کو اعتماد میں لینا چاہا۔ لیکن ہر ایک کا ردعمل ایسا ہی اور اسی طرح پریشان کن تھا۔ ہر ایک نے یہ کہا کہ ''ایک نے وہ بے کار سا جانور خریدا ہے، ہم اسے کھائیں گے تو سہی لیکن یہ ہمیں سیر نہیں کر سکے گا۔ ہم اسے کھانے کے بعد گھر جا کر سوتے وقت معدوں کو خالی محسوس کریں گے۔'' آخر کار جب کرسمس پر وہ بیل کاٹا گیا تو اس کے جسم کے پورے ڈھانچے پر چربی کی ایک موٹی تہہ چڑھی ہوئی تھی اور لوگوں نے اسے پورے ذوق وشوق سے کھایا۔ ہر ایک حصے میں گوشت اور چربی وافر مقدار میں آئی۔ لی نے اپنے دوستوں سے رائے دینے اصرار کیا تو ایک شکاری نے تسلیم کیا کہ ''ہاں بلاشبہ ہم شروع سے جانتے تھے کہ حقیقتاً یہ بیل کس شے کی مانند موٹا تازہ تھا۔ لیکن جب کوئی نوجوان،

گوشت کی وافر مقدار والے جانور شکار کر لیتا ہے تو وہ خود کو ''سردار'' یا ''بڑا آدمی'' سمجھنے لگتا ہے اور باقی ہم سب کو اپنے ملازم یا خود سے کم تر خیال کرتا ہے اور ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے۔'' اس نے مزید کہا کہ ہم شیخیاں بگھارنے والے شخص کو رد کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کسی وقت اس کا غرور کسی کو مار ڈالنے پر اکسائے۔ اس لئے ہم ہمیشہ اس کی طرف سے بانٹے گئے گوشت کو بے کار محض کہتے ہیں۔ اس طرح ہم اسے نرم دل اور شریف بناتے ہیں۔

''اسکیمو'' (بحر منجمد شمالی کے باشندے) تحفے بانٹنے والے شیخی باز اور سخی لوگوں سے متعلق اپنے خوف کا اظہار اس ضرب المثل سے کرتے ہیں، ''تحفوں سے لوگوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کوڑوں سے کتوں کو'' اور بعینہ یہی کچھ ہوا بھی ہے۔ ارتقائی پیش رفت کے دوران میں، تحفے بانٹنے والوں نے شروع شروع میں وہ اشیا تحفوں میں دیں جو ان کی ذاتی زائد محنت سے حاصل ہوئی تھیں۔ جلد ہی لوگوں نے احسان کا بدلہ اتارنے اور یوں پہلے سے زیادہ تحفے وصول کرنے کے لیے زیادہ محنت و مشقت شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحفے دینے والے بہت زیادہ طاقتور ہو گئے اور انہیں احسان کا بدلہ اترنے سے متعلق آہستہ آہستہ معمول پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب وہ لوگوں کو ٹیکس ادا کرنے اور ان کی خاطر محنت و مشقت کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ان خدمات کے عوض وہ اپنے محلات اور گوداموں سے کسی چیز کو بانٹتے نہیں تھے۔ آج کے دور میں بھی جدید ''بڑے لوگوں'' اور سیاست دانوں کا مخلوط گروہ، موقع بہ موقع تسلیم کرتا ہے کہ ابھی تک ''غلام'' حاصل کرنے کا بہترین آسان تر طریقہ ان پر ہر وقت کوڑے برسانے کی بجائے کبھی کبھار انہیں پر تکلف دعوت دینا ہے۔

اگر اسکیمو ''بش مین'' اور سائی'' نسلوں کی طرح کے لوگ تحائف دینے کے نقصانات کو سمجھ سکتے ہیں تو دوسرے لوگوں نے تحائف دینے والوں کو پھلنے پھولنے کی اجازت کیوں دی اور بڑے آدمیوں کو اتنی چھوٹ کس لئے دی گئی وہ یوں پھول گئے اور حوصلہ پا کر ان ہی لوگوں کو غلام بنانے لگے جن کی محنت و مشقت نے ان کی شہرت اور ناموری کو ممکن بنایا۔ ایک مرتبہ پھر یوں لگتا ہے کہ میں سب کچھ بتانے کو بے تاب ہوں۔ لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ کچھ تجویزیں پیش کرسکوں۔

''زیر بار احسان ہونے کا ازالہ'' ایک قسم کا معاشی ''ادل بدل'' کا نظام ہے جو زیادہ تر ایسے معاشروں کے حسب حال ہے جہاں زائد از ضرورت پیداواری کوششوں پر مبنی محنت و مشقت کی ترغیب کسی گروہ کی بقا کے سلسلے میں نقصان دہ نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ایسے حالات کئی شکاری گروہوں اور ان کے ہمراہیوں مثلاً ''اسکیمو'' ''سیمائی'' اور ''بش مین'' وغیرہ کے ہاں موجود ہیں جن کی بقا کا تمام تر انحصار، ان علاقوں میں پائی جانے والی قدرتی نباتات وحیوانات کی متنوع اور مختلف اقسام پر ہے۔ اگر شکاری مل کر اچانک زیادہ جانوروں کو شکار کرنے اور زیادہ پودوں کو اکھاڑنے کی مشترکہ کوششوں میں لگ جائیں تو وہ اپنی حدود میں شکار کی رسم کو مستقل طور پر گھٹانے اور نقصان پہنچانے کے خطرے سے دو چار ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر لی نے دیکھا کہ ''بش مین'' اپنے معاش اور پیٹ پالنے کے لیے ہفتہ بھر کے دوران میں دس سے پندرہ گھنٹوں تک کام کرتے ہیں۔ اس انکشاف سے صنعتی معاشروں کے اس حقیر ترین تصور کو بیخ و بن سے ادھیڑ کر رکھ دیا کہ جتنی فرصت ہمیں آج میسر ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ پرانے عہد کے شکاری اور ان کے ساتھی ہم سے تھوڑا کام کرتے تھے جب کہ انہیں کسی ایک بھی مزدوروں کی لیبر یونین کی سہولت حاصل نہ تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کے ماحول ہفتوں اور مہینوں کی کڑی اور زائد مشقت برداشت نہیں کر سکتے۔ ''بش مینوں'' میں کوئی بڑا محنتی اور جفاکش کارکن جو اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ایک بڑی دعوت کا وعدہ کر کے ان سے زیادہ محنت و مشقت کا خواہش مند ہوتا ہے وہ اپنے معاشرے کے لیے یقینی خطرہ ہے۔ اگر کوئی پر عزم ''بش مین'' معتبر اپنے حامیوں کو ''کاؤکا'' کی مانند کام کرنے پر آمادہ کر لے تو وہ ارد گرد کے علاقے میں میلوں تک شکار کئے جانے والے جانوروں کو سال ختم ہونے سے پہلے پہلے یا تو مار ڈالے گا یا نایاب بنا کر لوگوں کو فاقوں کے سبب موت کے منہ میں دھکیل دے گا۔ اسی باعث ''بش مین'' لوگوں میں تقسیم نو کی بندر بانٹ نہیں بلکہ احسان کے بدلے احسان کا معمول غالب ہے اور سب سے زیادہ شہرت اس خاموش طبع قابلِ اعتبار شکاری کے حصے میں آتی ہے جو اپنے کارناموں پر تکبر نہیں کرتا اور کسی جانور کے شکار سے حاصل ہونے والے گوشت کو بانٹتے ہوئے کوئی تاثر نہیں دیتا کہ وہ تحفہ دے رہا ہے۔

مقابلے بازی کی دعوتوں کے رواج اور تقسیم نو کی دوسری صورتوں کے باعث

احسان کے بدلے احسان پر اعتبار اس وقت فروغ پانے لگا جب محنت ومشقت کے ذریعے اپنے ''مسکن کی قوت برداشت'' کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کے کسی اندیشے کے بغیر، خوراک کے قدرتی وسائل کی جگہ گھروں میں اگائے ہوئے پودوں اور پالتو جانوروں کی افزائش میں جتنی دلچسپی لیں گے، اتنی زیادہ خوراک پیدا کرسکیں گے۔ اس میں رکاوٹ ی ہے کہ عام طور پر لوگ اتنی زیادہ محنت نہیں کرتے جتنی درکار ہوتی ہے۔ اس مسئلے کا حل تقسیم نو تھی۔ چنانچہ جونہی لوگوں نے شہرت پسندوں اور جوشیلے کارکنوں کے ساتھ باہمی لین دین میں توازن قائم رکھنے کے لیے زیادہ محنت ومشقت شروع، تقسیم نو کے عمل کا آغاز ہوگیا۔ جب باہمی ادے بدلے کے لین دین عدم توازن کا شکار ہوئے تو وہ تحائف بن گئے اور جب تحفوں کے ڈھیر لگ گئے تو تحفے دینے والوں کی شہرت اور جوابی تحفوں سے نوازا جانے لگا۔ جلد ہی تقسیم نو کا معمولی ادل بدل کے لین دین پر غالب آگیا اور سب سے زیادہ شہرت ان متکبر شیخی باز اور حساب کتاب میں چالاک، تحفے بانٹنے والوں کو حاصل ہوئی جو پہلے پہل اپنی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں دھوکہ بازی اور مکروفریب سے اپنا مطلب نکالتے اور آخرکار ہر شخص کو اتنی زیادہ مشقت پر مجبور کرتے جس کا کوئی ''بش مین'' سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

جیسا کہ ''کیوا کیول'' کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلے بازی پر مبنی دعوتوں اور تقسیم نو کے فروغ کے لیے موزوں اور مناسب حالات بعض اوقات غیر زراعتی آبادیوں میں بھی رونما ہوتے ہیں۔ بحرالکاہل کے شمال مغربی ساحل پر آباد قوموں کے لئے سالمن مچھلی، اس کی دوسری اقسام جو ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہیں اور دوسرے سمندری جانوروں کی سالانہ ضیافت میں اضافہ بھی اسی ماحول سے مشابہت کا سبب بنتا تھا جو زرعی فصلوں کی پیداوار میں اضافے کے نتیجے میں وجود میں آتا تھا۔ سالمن اور کینڈل مچھلی کی زیادہ مقدار پکڑ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جب تک وہ مچھلی پکڑنے کے لیے قدیم طرز کے جالوں سے کام لیتے رہے اس وقت تک نہ تو کبھی مچھلی کی زیادہ مقدار ان کے ہاتھ آتی تھی اور نہ اگلے سال اس کی فراہمی پر کوئی اثر پڑتا تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے باہمی لین دین اور عزت وشہرت کے لئے تقسیم نو پر مبنی نظاموں کے تجزیے اور ان پر بحث سے ہٹ کر ہم یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ اہم طرز کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں، عزت اور شہرت کو ایک امتیازی طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی مغربی یورپ میں آمد کے ساتھ ہی ایک بار پھر مسابقت اور مقابلے بازی کے ذریعے دولت کا حصول فضیلت اور رتبے کی بلندی کا بنیادی معیار بن گیا۔ لیکن صرف اسی ایک صورت میں بڑے لوگوں نے ایک دوسرے کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی اور سب سے زیادہ عزت اور قوت اس فرد کے حصے میں آئی جو سب سے زیادہ مال و دولت کا مالک بنا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ابتدائی سالوں میں سب سے شہرت اور بلند رتبے کے حامل وہ لوگ سمجھے جانے لگے تھے جو امیر ترین تھے لیکن نہایت کفایت شعاری سے رہتے تھے۔ جب ان کا مال و متاع اور دولت زیادہ محفوظ ہو گئی تو سرمایہ داروں کے بالائی طبقے نے بڑے اعلیٰ پیمانے پر ''نمائشی مصرف'' اور ''نمائشی ضیاع'' کو اپنایا تاکہ اپنے حریفوں کو مرغوب کر سکیں۔ انہوں نے بڑی عظیم الشان عمارتیں بنائیں، عمدہ اور نفیس ترین لباس زیب تن کئے۔ خود کو ہیرے جواہرات سے آراستہ کیا اور محروم عوام کے تحقیر آمیز انداز کے ساتھ مخاطب ہونے لگے۔ اس دوران میں درمیانی (متوسط) اور نچلے طبقے کے لوگوں نے ان لوگوں کو عزت و احترام دینا جاری رکھا جو سب سے زیادہ محنت و مشقت کرتے، کم سے کم خرچ کرتے اور سنجیدگی کے ساتھ ہر قسم کے فضول خرچی، نمائشی اصراف اور نمائشی ضیاع میں رکاوٹ بنتے۔ لیکن صنعتی ترقی کی افزائش اور استعداد انتہا کو پہنچنا شروع ہوئی تو درمیانی اور نچلے طبقے کو بھی کفایت شعاری کی عادتوں اور رویوں کو ترک کرنا پڑا۔ اشتہاری بازی اور ابلاغ عامہ سے درمیانی اور نچلے طبقوں کو ترغیب ملی کہ وہ بچت کی عادت کو چھوڑ کر، خرید کرنے، خرچ کرنے، ہر چیز وافر مقدار میں ضائع کرنے یا تلف کرنے یا کسی نہ کسی طرح اس سے چھٹکارا پانے کی عادت اپنائیں۔ چنانچہ متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والوں مرتبے کے متلاشی لوگوں میں سب سے زیادہ شہرت انہیں ملتی ہے جو بے ضرورت نمائشی خرچ اور اصراف میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

لیکن اس دوران میں امرا طبقوں نے خود کو نت نئے قسموں کے ٹیکسوں میں گرفتار پایا جن کا مقصد ان کی دولت کی تقسیم تھا۔ نمائشی اصراف اور کھپت کے عظیم الشان مظاہرے خطرناک بن گئے۔ چنانچہ ایک بار پھر سب سے زیادہ شہرت اور ناموری ان کو ملنے لگی جن کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے اور جو اس کا سب سے کم مظاہرہ کرتے ہیں۔ بالائی طبقے میں نفرت انگیز خود نمائی اور اپنی دولت کے بل بوتے پر خود بینی ختم ہونے سے درمیانی

MashalBooks.org

طبقے پر اس دباؤ میں بھی کچھ کمی واقع ہوئی جس کے باعث وہ بے جا نمائشی اصراف میں ملوث تھے۔ اس سے مجھے یہ خیال آتا ہے کہ درمیانی طبقے کے نوجوانوں میں پھٹی پرانی زین پہننے اور صریح طور پر بے ضرورت اصراف کر رد کرنے کا تعلق کسی نام نہاد ثقافتی انقلاب کی بہ نسبت بالائی طبقوں کے رجحان کی نقل کرنے سے زیادہ ہے۔

ایک آخری نکتہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ''احسان کے بدلے احسان'' کی جگہ ''مرتبہ حاصل کرنے اور مسابقت کی مقابلہ بازی'' نے لی تو اس سے کسی مخصوص خطے کی انسانی آبادیوں کی بقا اور خوش حالی ممکن ہوئی۔ کسی طرف سے اس سارے عمل کی مصلحت دریافت کی جا سکتی ہے، جس کے تحت بنی نوع انسان کو چکنی چپڑی باتوں سے جھانسہ دے کر حیلوں بہانوں سے اسے زیادہ جانفشانی کے ساتھ محنت کرنے پر آمادہ کیا گیا تا کہ زیادہ لوگوں کو اسی پیمانے اور معیار کی (بلکہ اس سے بھی کم تر کی) خوراک اور مادی اور جسمانی خوش حالی مہیا کی جا سکے جو ''اسکیمو'' یا ''بش مین'' لوگوں کو حاصل ہے۔ اس چیلنج کا واحد جواب جو میری سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ کئی قدیم معاشروں نے اپنی پیداواری کوششوں کو بڑھانے سے انکار کر دیا اور اپنی آبادی کو بھی گنجان نہیں ہونے دیا۔ اس کی خالصتاً وجہ ان پر اس حقیقت کا انکشاف تھا کہ محنت و مشقت کی بچت پر مبنی نئی ترکیبوں کا اصل مقصد کارکنوں کے مقدر میں زیادہ محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں انحطاط ہوتا۔ لیکن ان قدیمی لوگوں کی تقدیر پر مہر ثبت ہو گئی جونہی ان میں سے کسی نے (خواہ وہ کتنی ہی الگ تھلگ جگہ پر آباد تھا) اس دہلیز کو عبور کیا جس کے پار تقسیم نو کا نظام اور طبقاتی صف بندی عروج پر تھی۔ ادلے بدلے کی مروت پر کاربند سب شکاری اور ان کے ساتھی جو زیادہ بڑے اور طاقتور معاشروں کے ہاتھوں صحیح معنوں میں برباد ہو گئے تھے، دور دراز علاقوں میں دھکیل دیئے گئے اور جنہوں نے پیداوار اور آبادی میں اضافہ کیا اور حکومتی طبقوں کی صورت میں منظم تھے وہ چھا گئے۔ ایک کی جگہ دوسرے کے قبضے اور غلبے کی بنیادی وجہ اور سبب، وسیع تر گنجان اور منظم معاشروں کی سادہ لوح شکاریوں اور ان کے حواریوں کو مسلح جدوجہد میں شکست دینے کی اہلیت تھی جو اس اصول میں پنہاں تھی کہ ''محنت کرو یا تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

MashalBooks.org

سراب کے تعاقب میں

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مرحلے پر آپ کو ''فینٹم کارگو'' (سامان سے لدا خیالی جہاز) سے متعلق کچھ بتاؤں کیونکہ اس کا براہ راست تعلق ''تقسیم نو'' کے تحت اشیا کے تبادلوں اور ''بڑے لوگوں'' کے نظام سے ہے۔ ممکن ہے آپ کو فوری طور پر ان کا باہمی تعلق نظر نہ آئے لیکن ابھی ''فینٹم کارگو'' سے متعلق بھی تو کچھ عیاں نہیں۔

منظر کچھ یوں ہے کہ نیوگنی کے پہاڑوں کی بلندی پر واقع جنگل میں ہوائی جہاز اترنے کا میدان ہے۔ اس کے قریب ہی جہازوں کو کھڑا کرنے کے لئے گھاس پھوس کی چھت والے چھپر (ہینگر) اور بانس کا بنا ہوا روشنی کا مینار ہے۔ میدان میں لاٹھیوں اور پتوں وغیرہ سے بنایا گیا ایک ہوائی جہاز کھڑا ہے۔ اس ہوائی اڈے پر مقامی لوگوں کا ایک گروہ ناک میں زیور لٹکائے اور بازوؤں پر سیپیوں کی پٹیاں باندھے چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ رات کو وہ آگ کا الاؤ روشن رکھتے ہیں جو روشنی کے مینار کا کام دیتا ہے۔ وہ ایک اہم جہاز کی آمد کے منتظر ہیں۔ اس پرواز کے ذریعے آنے والے سامان بردار جہاز ڈبوں میں بند خوراک، کپڑے، ہلکے سفری ریڈیو، کلائی کی گھڑیوں اور موٹر سائیکلوں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ ان جہازوں کو آباو اجداد (اسلاف) چلا رہے ہوں گے۔ جو دوبارہ زندہ ہو کر واپس آ چکے ہیں، لیکن دیر کیا ہے؟ ایک آدمی ریڈیو کے کیبن میں جاتا ہے اور ٹین کے ڈبے میں بنائے ہوئے مائیکروفون پر ہدایات دیتا ہے یہ پیغام ڈوریوں اور بیلوں کے ریشوں سے بنائے ہوئے ''انٹینا'' کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔ ''میرا رابطہ ہو گیا ہے؟ میری بات سمجھ آ رہی ہے؟'' ''ہاں آپ کا پیغام سمجھ لیا ہے۔ بات ختم۔'' کبھی کبھی وہ جیٹ طیاروں کی آسمان پر جاتے ہوئے گڑگڑاہٹ پر کان دھرتے ہیں۔ کبھی دور فاصلوں پر موٹروں کے چلنے کی آہٹ

MashalBooks.org

سنتے ہیں۔ ''اجداد'' ان کے سروں پر آپہنچے ہیں۔ وہ ان کی راہ تک رہے ہیں۔ لیکن نیچے شہروں میں رہنے والے سفید فام لوگ بھی انہیں اپنے پیغام بھجوا رہے ہیں۔ اجداد گھبرا کر پریشان ہو جاتے ہیں اور غلط ہوائی اڈے پر اتر جاتے ہیں۔

فوت ہو جانے والے ''اسلاف'' اور مال و اسباب لے کر آنے والے سمندری اور ہوائی جہازوں کی آمد کے لئے انتظار کا سلسلہ کافی طویل عرصہ پہلے سے شروع ہوا۔ ساحلی علاقوں میں رہنے والے اس اعتقاد اور مذہبی مسلک کے پیروکار، ابتدائی دور میں ایک بہت بڑی کشتی کے منتظر رہتے تھے۔ بعد میں وہ جہازوں کی راہ دیکھنے لگے۔ 1919ء میں اس مذہبی مسلک کے لیڈروں نے دُخانی جہازوں کی متوقع آمد کے سلسلے میں، ان جہازوں سے نکلنے والے دھوئیں کا سراغ لگانے کے لیے پورے افق کو چھان مارا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر فوج بردار طیاروں اور کے لیے بمباری کرنے والے دستوں کے ہمراہ ''اسلاف'' کی آمد سے متعلق امیدیں وابستہ کی گئیں۔ اب ان کی آمد ایسے ''اڑنے والے گھروں'' (اڑن کھٹولوں) کے ذریعے ہوتی ہے جو طیاروں سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔

آنے والے سامان کی اپنی نوعیت میں بھی جدّت آئی ہے اور تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں یہ سامان زیادہ تر ماچسوں، فولادی اوزاروں، پھول دار سوتی کپڑوں کے پردوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ بعد میں ان کی جگہ چاول، جوتوں، ڈبوں میں بند گوشت اور مچھلی، رائفلوں، چاقوؤں، گولہ بارود اور تمباکو سے بھرے بڑے بڑے تھیلے آگئے۔ حال ہی میں آنے والے جہازی بیڑوں میں موٹر گاڑیاں، ریڈیو اور موٹر سائیکل وغیرہ لدے ہوئے آئے ہیں۔ ''کارگو'' کے اعتقاد کے حامل بعض نبی ایسے بڑے بڑے جہازوں کے آنے کی پیش گوئی کرتے ہیں جن سے ساری فیکٹریاں اور فولاد کے کارخانے خالی ہو کر رہ جائیں گے۔

اس ساز و سامان کی مکمل فہرست گمراہ کن ہوگی۔ مقامی باشندے اپنی زندگیوں کے معیار میں کلی طور پر بلندی اور برتری کے منتظر ہیں۔ خیالی جہازوں اور طیاروں کی آمد سے ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوگا۔ مردہ اور زندہ لوگ پھر مل جائیں سفید فام آدمی کو یا تو نکال باہر کیا جائے گا یا وہ ماتحت اور زیردست ہو جائے گا۔ بے کار اور گھٹیا محنت و مشقت کا خاتمہ

ہو جائے گا اور کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں ''کارگو'' کی آمد سے زمین پر گویا ''بہشت'' آجائے گا۔ یہ تخیل اس سے مختلف ہے جس سے مغرب کے تبصرہ نگار اپنے تذکروں میں موجودہ ہزار سالہ دور سے متعلق صرف صنعتی پیداوار کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایک طرف جیٹ طیارے ہیں اور دوسری طرف اجداد، موٹر سائیکل کی جگہ معجزے، ریڈیو کی جگہ جن بھوت ...... ہماری اپنی روایات ہمیں مکتی اور نجات، حیات بعد از موت، ابدی حیات جاوداں وغیرہ کے لیے تیار کرتی ہیں لیکن کیسے؟ طیاروں، موٹر گاڑیوں اور ریڈیو کی مدد سے؟ ہمارے لئے کوئی ''کارگو'' سامان بردار جہاز نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کس ذہن اور خیالی تصور کا نتیجہ ہے۔ لیکن کیا واقعی ہم جانتے ہیں؟

تبلیغی جماعتیں اور حکومتی منتظمین مقامی باشندوں کو سمجھاتے ہیں کہ محنت اور مشینیں صنعتی فروغ سے مال و دولت کے دریا بہا دینے کا موجب ہوتی ہیں لیکن مال بردار جہازوں کے پرچارک، اس سے مختلف نظریات پر قائم ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ صنعتی دور کی ساری دولت دراصل کہیں دور انسانی ذرائع سے نہیں بلکہ انسانی فکر و تدبر اور سوچ سے ماورا ہے کہ ہوائی یا بحری جہازوں کے ذریعے، ان کے لیے بھیجی گئی دولت کی کھیپوں کو کس طرح وصول کیا جاتا ہے، یعنی وہ کارگو کے راز سے واقف ہیں۔ کارگو کے مقامی مبلغ بھی اس راز کا کھوج لگانے کی جستجو میں مگن ابھرتے ڈوبتے کوشاں رہتے ہیں تاکہ اس سے واقف ہو کر ''کارگو'' کا مال متاع اپنے پیروکاروں کے حوالے کر سکیں۔

خیالی اور تصوراتی جہازوں سے متعلق نظریات مسلسل اور لگاتار تبدیلیوں سے متاثرہ حالات کے مطابق ان کی روشنی میں بدلتے رہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ''اجداد'' کی رنگت سفید تھی۔ بعد میں بتایا گیا کہ وہ جاپانیوں کی طرح لگتے تھے۔ لیکن جب سیاہ فام امریکنوں کے فوجی دستوں کو نکال باہر کیا تو ''اجداد'' کے سیاہ فام ہونے کا تصور دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد خیالی جہازوں کا نظریہ امریکنوں پر مرکوز رہا ''نیوہیبرائڈز'' میں لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ''جی آئی'' جس کا نام ''جان فرم'' تھا، امریکہ کا بادشاہ ہوگا۔ اس کے حامی بینوں نے ایک ہوائی اڈہ (طیران گاہ) تعمیر کیا جس پر آزادی دلانے والے امریکی بمبار طیارے اتریں گے۔ ان کے ساتھ دودھ اور آئس کریم پر مشتمل

کارگو (سامان) ہوگا۔ بحر اوقیانوس کے جزیرے میں واقع جنگ کے میدان میں چھوڑ ے گئے کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''جان فرم'' وہاں تھا۔ ایک گروہ کو یقین ہے کہ ''جان فرم'' جب اس نے ''کارگو'' کے ساتھ آنے کا وعدہ کیا تو اس نے ایک وردی والی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے بازوؤں پر سارجنٹ کے لیے مخصوص پٹیاں اور میڈیکل دستے سے متعلق ریڈکراس کا نشان تھا۔ ''شفا'' کے جزیرے میں جگہ جگہ میڈیکل کے چھوٹے چھوٹے دستوں کے لئے ''ریڈکراس'' کے نشانات جن کے اردگرد خوبصورت باڑیں بنائی گئی ہیں، ایستادہ ہیں۔ گاؤں کے ایک سربراہ نے 1970ء میں ایک انٹرویو کے دوران میں اس طرف توجہ دلائی کہ ''لوگ تقریباً دو ہزار سال سے حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں تو ہم بھی جان فرم کا کچھ مزید عرصہ انتظار کر سکتے ہیں۔''

1968ء میں مجمع الجزائر کے جزیرہ ''نیوہینوور'' میں ایک نبی نے اعلان کیا کہ کارگو کا راز صرف یونائیٹڈ سٹیٹس کے صدر کو معلوم ہے۔ مقامی ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کے ذریعے، اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والوں نے 7,500 ڈالر کی رقم لنڈن جانسن کو خریدنے اور اسے یہ راز بتانے کی شرط پر نیوہینوور کا بادشاہ بنانے کے لیے جمع کر لی۔

1962ء میں کوہستان توڑو کی چوٹی پر امریکی ائرفورس نے ویوکر کے قریب، سروے کے نشان کے لئے کنکریٹ کا ایک بڑا تودہ بنایا۔ نبی ''یالی دان'' کو پکا یقین ہوگیا کہ امریکن ہی ''آباواجداد'' تھے اور یہ کہ مال بردار جہاز اس کنکریٹ کے نشان تلے دفن تھا۔

1971ء میں ایک پاپ میوزک طائفے اور ان کے ٹرانزسٹر ریڈیو کے ساتھ ایک رات عبادت کرنے کے بعد اس نے اور اس کے معتقدین نے اس کنکریٹ کے نشان کو کھود ڈالا۔ لیکن کوئی ''کارگو'' نہیں ملا۔ یالی نے اس کی وضاحت یوں کی کہ ''حکام اسے یہاں سے لے گئے ہیں۔'' اس کے پیروکاروں کا اعتماد مجروح نہیں ہوا جنہوں نے 21500 ڈالر چندے میں دئے تھے۔

''کارگو'' (سامان سے بھرے ہوئے جہازوں) سے متعلق اعتقاد کو پسماندگی کے شکار ذہنوں کی دیوانگی سمجھ کر اس بنا پر مسترد کر دینا آسان ہے کہ ان کے پیش گوئیاں کرنے والے قائدین یا مانے ہوئے لفنگے اور بدمعاش ہیں جو اپنے بھائی بندوں کے حرص، لالچ، جہالت اور آسانی سے دھوکہ کھا جانے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اگر مخلص ہیں تو دماغی

خلل کے مریض ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی ترنگ میں آ کر لوگوں میں کارگو سے متعلق پاگل پن پر مبنی، اپنے خیالات پھیلاتے اور عوام کو ایک روگ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ قیاس معقول ہوتا اگر اس میں کوئی راز کی بات پوشیدہ نہ ہوتی کہ صنعتی دولت کیسے پیدا اور تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن اس حقیقت کی وضاحت آسان نہیں کہ کئی ممالک غریب اور کئی دوسرے امیر کیوں ہیں، نہ ہی یہ بتانا آسان ہے کہ جدید قوموں کے اندر بھی دولت کی تقسیم کے سلسلے میں اتنا نمایاں تفاوت اور فرق کیوں ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ''کارگو'' ایک معمہ ہے۔ مقامی باشندے جسے حل کرنے کی کوششوں میں حق بجانب ہیں۔

''کارگو'' کے راز کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں کسی مخصوص کیس پر توجہ دینا ہوگی۔ اس کے لئے میں نے آسٹریلین نیوگنی کے مغربی ساحلی علاقے ''مادانگ'' والوں کے مسلک کو چنا ہے جن کا ذکر پیٹر لارنس نے اپنی کتاب ''روڈ بلانگ کارگو'' میں کیا ہے۔

سب سے پہلے ''مادانگ'' کے ساحل پر آنے والے یورپی باشندوں میں سے ایک انیسویں صدی کا سیاح میکلوہومیکلے تھا۔ جونہی اس کی کشتی کنارے لگی، اس کے لوگوں نے لوہے کی کلہاڑیاں، کپڑوں کے تھان اور دوسری قیمتی اشیا تحفوں کے طور پر بانٹنی شروع کر دیں۔ مقامی باشندوں نے فیصلہ دے دیا کہ یہ سفید فام لوگ ''اجداد'' تھے۔ یورپین کو مقامی باشندوں سے اوجھل رکھا۔ وہ خفیہ طریقے سے لاش کو سمندر میں پھینک دیتے اور یہ ظاہر کرتے کہ گم شدہ شخص واپس بہشت میں چلا گیا ہے۔

1884ء میں جرمنی نے مادانگ میں پہلی نو آبادیاتی حکومت قائم کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ''لوتھر'' کے تبلیغی قافلے آ گئے۔ لیکن وہ تو معتقدین کی اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہے۔ ایک تبلیغی مشن تیرہ سال کے دوران ایک مقامی باشندے کو بھی عیسائی نہ بنا سکا اور واپس چلا گیا۔ مذہب تبدیل کرنے والوں (مرتدین) کو لوہے کے اوزار اور خوراک رشوت کے طور پر دینی پڑتی تھی۔ اب اس سے آپ دیکھ سکتے ہیں میں نے کیوں ''بڑے آدمی'' کے تصور کو صورت حال کے مطابق برمحل کہا تھا۔ پچھلے باب میں مذکور، مقامی باشندوں کے ''بڑے آدمیوں'' کی طرح، سمندر سے آنے والے ''بڑے آدمی'' اس حد تک قابل اعتماد اور جائز طور پر حق سمجھے جا رہے تھے کہ وہ متعدد بار تحفے بانٹتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی کہ تحفے بانٹنے والے ان کے اجداد تھے یا کوئی ''دیوتا'' سوائے اس ایک

تمیز کرے کہ دیوتاؤں جیسے بڑے لوگوں کو تمام بڑے لوگوں کی نسبت زیادہ دینا چاہیے۔ مقامی لوگوں کی دلچسپی صرف بھجن اور گیت گانے اور مستقبل کی نجات تک محدود نہ تھی ۔ وہ ''کارگو'' کے خواہشمند اور اس کی آمد کے متوقع بھی رہتے تھے۔ یہ ''کارگو'' وہ شے تھی جو تبلیغی مشن اور ان کے دوست احباب سمندر پار ملکوں سے بذریعہ جہاز منگواتے تھے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا بڑے لوگوں کو اپنی دولت ضرور بانٹنی چاہیے۔ مقامی باشندوں کو یقین ہے کہ بخیل اور کنجوس بڑے آدمی سے زیادہ برا اور کوئی نہیں ہوتا۔ تبلیغی جماعتوں نے اپنا ہاتھ روک رکھا تھا۔ یعنی وہ گوشت اور چربی اپنے پاس رکھتی تھی اور ہڈیاں اور باسی کیک بانٹ دیتی تھیں۔ تبلیغی مرکزوں، سڑکوں اور باغات پر مقامی لوگوں نے ایک عظیم الشان دعوت ملنے کی امید کے سہارے کافی محنت سے کام کیا۔ لیکن دعوت کا کہیں نشان نہیں تھا۔ 1904ء میں مقامی لوگوں نے سارے بخیل ''بڑے لوگوں'' کو قتل کر دینے کی سازش کی لیکن حکومت کو سازش کا پتہ چل گیا اور سازش کے سرغنہ لیڈروں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد مارشل لاء نافذ ہو گیا۔

اس شکست کے بعد مقامی آبادی کے دانا اور ذہین لوگوں نے ''کارگو'' کی ابتدا سے متعلق، نئے نظریات اور خیالات کو پروان چڑھانا شروع کیا جس کے مطابق یورپی قوموں کے نہیں بلکہ مقامی لوگوں کے اجداد نے ''کارگو'' تخلیق کیا تھا۔ لیکن یورپی لوگ مقامی آبادی کو اس میں سے اپنا حصہ لینے کی مزاحمت کر رہے تھے۔ 1912ء میں دوسری بار مسلح بغاوت کی سازش کی گئی، پھر پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ جرمن بڑے لوگ بھاگ گئے اور آسٹریلوی بڑے لوگوں نے قبضہ جما لیا۔

اب مقامی باشندوں نے میٹنگیں منعقد کرنا شروع کیں جن میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ مزید مسلح بغاوت ناقابل عمل تھی کیونکہ مشنریوں کو ''کارگو'' کے راز کا علم تھا، اس لئے واحد راستہ یہ تھا کہ ان سے یہ علم حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مقامی باشندوں نے جوق در جوق چرچوں اور مشنری سکولوں میں جانا شروع کیا اور بڑے معاون و مددگار پُر جوش عیسائی بن گئے۔ انہوں نے درج ذیل کہانی کو بڑے غور سے سنا اور توجہ دی: ابتدا میں خدا نے (جسے مقامی دیوتا لائی قصوں میں (علم الاصنام میں) انیس کہا جاتا تھا) بہشت اور زمین کو پیدا کیا۔ انیس نے آدم اور حوّا کو کارگو (مال و اسباب سے بھرا ہوا) بہشت دیا۔ جس میں ڈبوں

میں بند ہر قسم کے گوشت، فولاد کے آلات، چاولوں کے بورے اور زن و مرد کے جوڑے شامل تھے، ان کے استعمال کے لئے دیئے۔ جب آدمؑ و حوّاؑ کو جنس کا پتہ چلا تو اینس نے ان سے کارگو واپس لے لیا اور سیلاب بھیج دیا، اینس نے نوحؑ کو لکڑی کا ایک بڑا دخانی جہاز بنانا سکھایا اور اسے اس کا کپتان مقرر کیا۔ شیم اور جیفتھ نے اپنے والد نوحؑ کا حکم مانا جبکہ ہام نے بیوقوفی میں اس کی حکم عدولی کی۔ نوحؑ کارگو کو ہام سے چھین کر لے گئے اور اسے نیوگنی بھیج دیا۔ جب کئی سالوں تک ہام کے بچے اندھیرے اور لاعلمی میں بسر کر چکے تو اینس نے ان پر ترس کھایا اور ''ہام'' کی غلطی کے ازالے کی خاطر ان کے پاس مبلغین کو یہ ہدایات دے کر بھجوایا کہ ''تم اس کی اولادوں کو پھر میری راہ پر لے آؤ۔ جب وہ میرے حکم کے مطابق عمل کریں گے تو میں ان کے پاس کارگو پھر اسی طرح بھجواؤں گا جیسے میں تم سفید فام لوگوں کے پاس بھجواتا ہوں۔''

حکومت اور تبلیغی جماعتوں کو نو معتقد لوگوں کی گرجا گھروں حاضری کی تعداد اور ان کی مؤدبانہ روش کو دیکھ کر بہت حوصلہ ہوا۔ بہت کم سفید فام لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ مقامی لوگوں کے نزدیک عیسائیت سے متعلق تصریح اور ترجمانی اس تشریح اور معانی سے کس حد تک مختلف تھی۔ ''پدگان، زبان میں جو جرمن، انگریزی اور قدیم زبانوں کا ملغوبہ تھی، مذہبی خطبوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مبلغوں کو علم تھا کہ مقامی لوگوں کے نزدیک ''اور خدا نے نوحؑ پر فضل کیا'' کے جملے کا مطلب ''اور خدا نے نوحؑ کو کارگو دیا'' تھا۔ مبلغین یہ بھی جانتے تھے کہ آسمانی صحیفے میں مرقوم ''میتھیو'' کے وعظ کے دوران میں انہیں سنائے گئے اس فقرے ''تم پہلے خدا کی حکمرانی، اس کی صداقت، راستی اور انصاف مانگو اور یہ سب چیزیں تمہیں مل جائیں گی'' کا مطلب جو انہوں نے اخذ کیا وہ یوں تھا کہ ''اچھے نیک عیسائیوں کو صلے کے طور پر کارگو ملے گا۔'' لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ عیسائیوں کی اطاعت اور فرماں برداری کے بدلے میں ملنے والے انعامات اور صلوں کی بشارت اگر کلیتاً روحانی اور غیر دنیاوی فوائد تک محدود ہوئی تو مقامی باشندے یا تو اس پر یقین نہیں کریں گے یا پھر اپنی دلچسپی کھو کر کسی دوسرے کلیسا کا رخ کریں گے۔ ذہین مقامی باشندوں کے نزدیک پیغام بڑا واضح اور غیر مبہم تھا کہ یسوع مسیح اور ''اجداد'' ''کارگو'' نیک لوگوں کو دیں گے۔ مذہب سے لاتعلق نہ صرف اس سے محروم رہیں گے بلکہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔ چنانچہ دوسرے عشرے کے

MashalBooks.org

دوران میں مقامی باشندوں کے رہنماؤں نے عسائیت سے متعلقہ فرائض مثلاً مذہبی گیت گانے، علیحدگی اختیار کرنے اور اپنے سفید فام حاکموں کا احترام کرنے میں بڑے صبر وتحمل سے کام لیا۔ لیکن تیسرے عشرے کے دوران میں صبر کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا۔ اس وجہ سے کہ اگر محنت سے ''کارگو'' نے آنا ہوتا تو وہ ان کے لئے پہلے ہی آچکا ہوتا۔ انہوں نے بحری اور ہوائی جہازوں سے سامان اتارا تھا لیکن کسی بھی مقامی باشندے کے لئے سمندر پار سے ایک پیکٹ بھی نہیں آیا تھا۔

عیسائی واعظوں اور تبلیغی نائبین نے خاص طور پر ناراضی ظاہر کی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے دولت کے لحاظ سے اپنے اور یورپی ''بڑے لوگوں'' کے درمیان پائے جانے والے نمایاں فرق کو دیکھا اور ان کوششوں کی واضح ناکامی کو بھی دیکھا جو اس تفریق کو کم کرنے کے سلسلے میں کی گئیں۔ اسی ناکامی کے باعث زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے اور اچھے عیسائی بننے کی سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ ایک اتوار کو لوتھر کا پیروکار وزیر رولینڈ ہیز لمان گرجے میں داخل ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سارے مقامی نائبین ایک رسے کے پیچھے کھڑے تھے جسے انہوں نے گرجا گھر کی نشستوں کے بغلی راستوں کے گرد باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے وزیر کو ایک یادداشت پڑھ کر سنائی جو یوں تھی: ''ہمیں کارگو کا راز کیوں نہیں بتایا جاتا؟ مسیحیت سے ہم کالے لوگوں کی عملی طور پر کوئی مدد نہیں ہوتی۔ سفید فام لوگ ہم سے کارگو کا راز چھپائے ہوئے ہیں۔'' اس کے علاوہ یہ مزید الزامات بھی تھے: ''بائبل کا صحیح ترجمہ ارادتاً غیر ارادی طور پر نہیں کیا گیا۔ اس کو ''سینسر'' کیا جا رہا تھا۔ اس کا پہلا صفحہ غائب کر دیا گیا۔ خدا کا صحیح نام نہیں بتایا جا رہا تھا۔''

مقامی باشندوں نے تبلیغی جماعتوں کا بائیکاٹ کر دیا اور کارگو کے معمے کا ایک نیا حل ڈھونڈ نکالا کہ یسوع مسیح نے پہلے کارگو یورپی لوگوں کو دیا تھا، اب وہ اسے مقامی لوگوں کو دینا چاہتے تھے لیکن یہودیوں اور تبلیغی تنظیموں نے یسوع مسیح کو پکڑ رکھا ہے اور آسٹریلیا میں سڈنی کے قریب قید میں رکھا ہوا ہے۔ لیکن یسوع مسیح جلد ہی آزاد ہو جائیں گے اور کارگو آنا شروع ہو جائیں گے۔ غریب ترین لوگوں کو سب سے زیادہ ملے گا۔ چنانچہ لوگوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اپنے کی خنزیر کاٹ کھائے، باغات جلا دیئے اور قبرستانوں میں ان کے ہجوم اکٹھے ہونے لگے۔

MashalBooks.org

یہ واقعات دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے ساتھ ہی رونما ہوئے۔ ابتدا میں مقامی باشندوں کو اس نئی جنگ کی وجہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آسٹریلوی لوگوں نے جرمن لوگوں کو نکال باہر کیا تھا اور اب جرمن لوگوں کی باری تھی کہ وہ آسٹریلویوں کو باہر دھکیلتے جا رہے تھے۔ صرف اس مرتبہ جرمن ''اجداد'' ہوں گے جو جرمن سپاہیوں کا بھیس بدل کر آئیں گے۔ حکومت نے اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والے لیڈروں کو جرمنوں کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے الزام میں جیل بھیج دیا۔ لیکن خبروں کے بلیک آوٹ کے باوجود مقامی لوگوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ آسٹریلوی انتظامیہ کو اپنے نکالے جانے کا خطرہ در پیش تھا۔ لیکن جرمنی سے نہیں یہ خطرہ جاپان سے تھا۔

''کارگو'' کے ''نبیوں'' نے اس چونکا دینے والی نئی پیش رفت کا مطلب سمجھنے کی تگ و دو کی۔ اس اعتقاد کے ایک رہنما نے جس کا نام ''تنکراب'' تھا، اعلان کیا کہ تبلیغی جماعتیں ان سے ہمیشہ ہاتھ کرتی رہی ہیں۔ یسوع مسیح ایک غیر اہم دیوتا تھا۔ اصل خدا......کارگو والا خدا ایک مقامی دیوتا تھا جس کو ''کلی باب'' کہا جاتا تھا۔ تبلیغی جماعتوں نے مقامی لوگوں کو ''اینس'' کی پرستش پر لگا دیا۔ حالانکہ ''انیس'' ایک عام انسان تھا جو کلی باب کا باپ بھی تھا اور کلی باب یسوع کا باپ تھا۔ کلی باب سفید فاموں کو ان کی خیانت اور غداری پر سزا دینے والا تھا۔ وہ اور ''اجداد'' بندوقوں گولہ بارود اور دوسرے فوجی ساز و سامان سے لدے ہوئے جہاز کے ساتھ روانہ ہو چکے تھے۔ وہ جب پہنچیں گے تو جاپانی سپاہیوں کے بھیس میں ہوں گے۔ آسٹریلیوں کو بھگا دیا جائے گا اور ہر شخص کو کارگو ملے گا۔ اس کے لیے تیار رہنے کی خاطر ہر شخص کو معمول کا کام کاج ترک کر دینا چاہیے۔ سؤر اور مرغیاں کھانی چاہئیں اور کارگو کے لئے گوداموں کی تعمیر شروع ہونی چاہیے۔

جب آخر کار جاپانیوں نے دسمبر 1942ء میں ''مادانگ'' پر حملہ کیا تو مقامی باشندوں نے ''آزادی دلانے'' والوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔ گو کہ جاپانی کوئی کارگو لے کر نہیں آئے تھے پھر بھی ''نبیوں'' نے ان کی آمد کو، کارگو سے متعلق پیش گوئیوں کے کم از کم جزوی طور پر صحیح ثابت ہونے سے تعبیر کیا۔ جاپانیوں نے ان کی تردید نہیں کی۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ کارگو کی آمد میں عارضی طور پر تاخیر واقع ہوئی تھی، کیونکہ لڑائی ابھی جاری تھی۔ انہوں نے بتایا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ''مادانگ'' مشرقی

ایشیا کے عظیم تر خوش حال صوبہ جاپان میں شامل ہوگا۔ ہر شخص آنے والی اچھی اور آسودہ زندگی میں حصہ دار ہوگا۔ اس دوران میں مقامی لوگوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ آسٹریلین اور ان کے اتحادی امریکیوں کو شکست دینے میں مدد دیں۔ مقامی لوگ بحری اور ہوائی جہازوں سے سامان اتارنے میں مدد دینے کے لیے بھگائے گئے۔ وہ بیروں کی طرح کام کرتے اور تازہ سبزیوں کے تحائف بھی لاتے۔ نیچے مار گرائے جانے والے ہوائی جہازوں کے پائلٹوں کو بڑی ناخوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑتا جب وہ اپنے خلاف دشمنی کے ہر مظاہروں کو دیکھتے۔ جوں ہی وہ نیچے آ کر زمین کو چھوتے، انہیں قبائلی اپنے رنگ دار نقاشی والے چہروں کے ساتھ گھیرے میں لے کر ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیتے اور رسیوں کے ذریعے کھمبوں کے اوپر باندھ کر، انہیں قریب ترین جاپانی افسر کے پاس لے جاتے۔ جاپانی ان کارگوں کے نبیوں کو صلے میں جاپانی افسروں والی تلواریں اور مقامی پولیس میں افسر بنا دیتے۔

لیکن جنگ کے دوران میں خوش حالی اور فلاح و بہبود کا سازگار ماحول جلد ہی ختم ہوگیا۔ آسٹریلوی اور امریکی فوجوں نے پیش قدمی کر کے سبقت حاصل کر لی اور جاپانیوں کے لئے رسد کے یا مزدوری کی اجرت دینا بند کردی۔ جب ''تاگاراب'' نے اپنی جاپانی تلوار لٹکائے اس پر احتجاج کیا تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اجداد نے مقامی لوگوں کے باغات کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ ناریل کے درختوں کے جھنڈ کیلوں اور کماد کے پودے سب اکھاڑ پھینکے۔ انہوں نے آخری مرغی اور سؤر تک چوری کر لئے۔ جب وہ ختم ہوگئے تو وہ کتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ جب کتوں کا بھی صفایا ہوگیا تو انہوں نے خود مقامی باشندوں کو شکار کر کے انہیں بھی کھایا۔

اپریل 1944ء میں جاپانی قبضہ چھڑا کر اسٹریلویوں نے ''مادان'' واپس لے لیا تو انہوں نے دیکھا کہ مقامی لوگ رنجیدہ تھے اور باہمی معاونت سے گریزاں تھے۔ کئی ایسے علاقوں میں جہاں جاپانیوں نے زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تھی، کارگو کے علم بردار نبیوں نے پہلے ہی جاپانیوں کی دوبارہ آمد (اور وہ بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تعداد میں) کی پیش گوئیاں شروع کر دی تھیں۔ باقی ماندہ آبادی کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے آسٹریلین نے جنگ ختم ہونے پر مستقبل کے ترقیاتی کاموں کا ذکر شروع کر دیا۔ مقامی باشندوں کے

لیڈروں کو بتایا کہ آنے والے زمانہ امن میں سیاہ فام اور سفید فام لوگ باہم میل ملاپ اور ہم آہنگی کے ساتھ اکٹھے رہیں گے، ہر ایک کے لیے عمدہ رہائش، بجلی، موٹر گاڑیاں، کشتیاں، اچھے کپڑے اور خوراک وافر مقدار میں دستیاب ہونے کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ اس وقت دنیا داری کے لحاظ سے نہایت چالاک اور ذہین مقامی لیڈروں کو یقین ہو چکا تھا کہ تبلیغی جماعتیں انتہائی جھوٹی تھیں۔ پروفیسر یالی جس کی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں اب میں بیان جاری رکھوں گا، بالخصوص اس نکتہ پر بضد تھا۔ جنگ کے دوران میں یالی آسٹریلویوں کا وفادار رہا تھا۔ اس وفاداری کے صلے میں اسے آسٹریلوی فوج میں سارجنٹ میجر کا رینک (عہدہ) دیا گیا۔ اسے آسٹریلیا لے جایا گیا او روہاں اسے ایسی چیزیں دکھائی گئیں جن سے متاثر ہو کر ''کارگو کے راز'' سے متعلق اس کی سوچ میں ویسی تبدیلی آجائے جیسی آسٹریلین چاہتے تھے یعنی چینی کی فیکٹریاں، شراب کے کارخانے، ہوائی جہازوں کی مرمت کے ورکشاپ، بندرگاہوں پر بنائے گئے بڑے بڑے گودام وغیرہ۔ یالی کو جہاں خود اپنی آنکھوں سے پیداواری عمل کے کئی پہلوؤں کو دیکھنے کا موقع ملا وہاں اس نے یہ بھی دیکھا کہ صرف وہی لوگ کاروں اور بڑے گھروں کے مالک تھے جو ان ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ اس نے مردوں اور عورتوں کو منظم گروہوں میں کام کرتے دیکھا۔ لیکن وہ ان بنیادی اصولوں کو نہ سمجھ پایا جن کی وجہ سے کارکن منظم تھے۔ بہرحال اس نے جو کچھ بھی دیکھا اس سے اسے یہ سمجھنے میں کوئی مدد نہ ملی کہ دولت کے اس بے تحاشا نکاس (بہاؤ) میں سے ایک بوند تک بھی اس کے ہم وطن لوگوں تک کیوں نہیں پہنچ پاتی تھی۔

جن چیزوں سے یالی سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ سڑکیں، روشنیاں اور بلند و بالا عمارتیں نہیں تھیں بلکہ کوئنز لینڈ کا عجائب گھر اور ''برسبن'' میں واقع چڑیا گھر تھا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عجائب گھر نیوگنی کے لوگوں کی ہاتھوں سے بنائی ہوئی اشیا سے مالا مال تھا۔ نمائش کے لئے رکھی گئی اشیا میں سے ایک تو خود اس کی اپنی قوم کا ہاتھ سے بنایا ہوا منقش خود (چہرہ پوش نقاب) تھا جسے پہلے وقتوں میں سنِ بلوغت تک پہنچ جانے کی تقریبات میں پہنایا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل اسی طرز کا تھا جسے تبلیغی جماعتوں نے ''شیطان کے کارنامے'' سے موسوم کیا تھا۔ اب اس نقاب کی، جو شیشے کی اوٹ میں رکھا گیا باقاعدہ پوجا کی جا رہی تھی۔ یہ پوجا کرنے والے پجاری سفید فراکوں اور عمدہ لباسوں میں ملبوس، زائرین پادریوں کا ایک

MashalBooks.org

مجمع تھا جو آپس میں رازدارانہ اور خفیہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ عجائب گھر میں شیشے کے ایسے کیس بھی تھے جن میں عجیب وغریب جانوروں کی ہڈیاں بڑی احتیاط سے محفوظ کی گئی تھیں۔ ''برسبن'' میں یالی کو چڑیا گھر لے جایا گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سفید فام لوگ اور زیادہ عجیب وغریب نسل کے جانوروں کو خوراک کھلا رہے تھے اور ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ سڈنی پہنچ کر یالی نے لوگوں کے گھریلو بلیوں اور کتوں کی بڑی تعداد کو دیکھا جنہیں لوگوں نے بطور پالتو جانور شوق سے رکھا ہوا تھا۔

جنگ ختم ہونے بلکہ اس کے بعد تک یالی کو اتنا شدید احساس نہیں ہوا تھا جتنا آسٹریلوی نیوگنی کے دارالسلطنت پورٹ مورسی میں حکومت کی طرف سے بلائی گئی ایک کانفرنس کے بعد ہوا کہ تبلیغی مشن مقامی لوگوں سے کتنا جھوٹ بولتے رہے تھے۔ کانفرنس کے دوران یالی کو ایک کتاب دیکھنے کو ملی جس میں نقل اتارنے والے بندروں کی ایسی تصاویر شامل تھیں جن کے ذریعے انہیں انسان سے بتدریج مشابہت اختیار کرتے دکھایا گیا تھا۔ آخر کار یالی نے سچ کو پا لیا۔ زیادہ مشنریاں کہتی تھیں کہ انسان آدم اور حوّا کی اولاد ہیں۔ لیکن سفید فام لوگ درحقیقت خود یہ اعتقاد (یقین) رکھتے تھے کہ ان کے آباواجداد کا تعلق، بلیوں، کتوں، بندروں اور دوسرے جانوروں کی نسلوں سے تھا۔ مشنریوں کے جھانسے میں آنے سے پہلے مقامی لوگوں کا بھی بالکل یہی اعتقاد تھا۔ ان مشنریوں کے بہکاوے میں آ کر ہی انہوں نے کلغیاں سجانا ترک کر دیا تھا۔

بعد میں اپنے فرقے کے اور ''نبی'' کے ساتھ اپنے تجربات کو زیر بحث لانے کے نتیجے میں یالی نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ کوئنز لینڈ کا عجائب گھر دراصل روم ہی تھا۔ وہ جگہ جہاں تبلیغی جماعتیں کارگو کا راز حاصل کرنے کے لیے اور اس کنٹرول پانے کے لئے، نیوگنی کے دیوتاؤں اور اساطیر کو لے گئی تھیں۔ اگر ان پرانے دیوتاؤں اور دیویوں کو بہلا پھسلا کر واپس نیوگنی لایا جا سکے تو خوشحالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو سکتا تھا لیکن اس کے لئے انہیں پہلے عیسائیت کو ترک کر کے لادینی رسوم کو دوبارہ رائج کرنا ہوگا۔

یالی تبلیغی جماعتوں کے دوغلے پن سے بے حد برہم تھا۔ وہ آسٹریلوی حکام کی ان کوششوں میں مدد دینے کو تیار بلکہ خواہش مند تھا جو وہ کارگو کے اعتقاد سے متعلق ایسے سب موجود نشانات اور ثبوت کو مٹا دینے کے لئے کر رہے تھے جن میں خدا اور یسوع مسیح کی کوئی

اہمیت ہو۔ یالی کی جنگی خدمات، اس کی برسبین اور سڈنی سے واقفیت اور ضعیف الاعتقادی پر مبنی توہمات کی پرزور الفاظ میں مذمت کی بنا پر ''مادانگ'' کے ضلعی افسر نے فرض کر لیا کہ یالی کارگو پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ یالی سے کہا گیا کہ وہ گورنمنٹ کی طرف سے طلب کئے گئے عوامی جلسوں سے خطاب کرے۔ اس نے پرجوش انداز میں کارگو سے متعلق مسیحی تصورات اور اعتقادات کا تمسخر اڑایا اور ہر ایک کو یقین دلایا کہ جب تک لوگ محنت اور قانون کی پاس داری نہیں کریں گے، اس وقت تک کارگو کبھی نہیں آئے گا۔

> ''یالی آسٹریلوی حکام کے ساتھ اشتراک عمل کے لیے بھی تیار تھا کیونکہ ابھی وہ ان وعدوں سے ناامید نہیں ہوا تھا جو اس کے ساتھ جنگ کے دوران میں، جب وہ فوج میں تھا، کئے گئے تھے۔ یالی 1943ء میں برسبینی کے فوج میں بھرتی کرنے والے ایک افسر کے ان الفاظ سے بڑا متاثر ہوا اور ان کے قدر سے دیکھتا تھا جو اس نے دوران جنگ میں کہے تھے کہ ''ماضی میں تم مقامی لوگوں کو پسماندہ رکھا گیا، لیکن اب اگر آپ جنگ جیتنے اور جاپانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہماری مدد کریں تو ہم یورپی لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ ہماری یہ امداد آپ کے لئے قلعی دار لوہے کی چھتوں، چوبی دیواروں والے مکانات، بجلی کی روشنیوں، موٹر گاڑیوں، اچھے کپڑوں اور اچھی خوراک کی صورت میں ہوگی۔ جنگ کے بعد آپ کی زندگی بالکل مختلف ہوگی۔''

ہزاروں لوگوں نے جلسے میں آکر یالی کو کارگو کے پرانے راستے کی مذمت کرتے سنا۔ خطاب کے لیے ایک پلیٹ فارم مع لاؤڈ سپیکروں کے مہیا ہو جانے اور ارد گرد سرکاری افسروں اور سفید فام تاجروں کے باعث یالی اپنی سرگرمیوں میں زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کارگو سے متعلق سابقہ اعتقادات کی جتنی سختی سے مذمت کرتا، مقامی لوگ اتنے یقین سے سمجھتے کہ وہ یالی کارگو کے اصل اور صحیح راز کو جانتا تھا اور وہ یہی کچھ کہہ رہا تھا۔ مقامی لوگوں نے اس کے الفاظ سے جو مطلب اخذ کیا، اس کا علم جب حکومتی اہل کاروں کو ہوا، جو یالی کو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے تو انہوں نے یالی سے مزید تقریروں کا مطالبہ کیا

MashalBooks.org

تا کہ وہ مقامی لوگوں پر واضح کر دے کہ وہ واپس آنے والا ان کا موروثی ''باپ دادا'' نہیں تھا اور نہ اسے کارگو کی الجھن اور راز کا کوئی علم تھا۔ کھلے عام پبلک میں ان تردیدوں کی وجہ سے مقامی لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا کہ یالی مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور وہ کارگو لے آئے گا۔ جب یالی کو ''پورٹ مورسبے'' مدعو کیا گیا تو مادانگ میں موجود اس کے پیروکاروں کو یقین ہو گیا کہ اس کی واپسی بحری جہازوں کے ''کارگو بردار'' بہت بڑے بیڑے کا سربراہ بن کر عمل میں آئے گا۔ شاید یالی کو خود بھی یقین ہو کہ کئی اہم رعایتیں دی جانے والی تھیں۔ وہ سیدھا انچارج ناظم کے پاس گیا اور اس سے دریافت کیا کہ مقامی لوگوں کو وہ صلہ کب دیا جائے گا جس کا وعدہ برسبین میں فوجی افسر نے کیا تھا۔ وہ عمارتوں کا تعمیراتی سامان اور مشینری جس کا ذکر ہر شخص کی زبان پر تھا انہیں کب ملے گا۔ پروفیسر لارنس نے آفس کی طرف سے یالی کو دئے جانے والے جواب میں ذکر یوں کی ہے: افسر نے اپنے جواب میں کہا کہ انتظامیہ بلاشبہ مقامی فوجی دستوں کی ان خدمات کے لیے مشکور ہے جو انہوں نے جاپانیوں کے خلاف سرانجام دیں اور ان خدمات کے عوض لوگوں کو معقول صلہ دیا جانے والا ہے۔ آسٹریلوی حکومت اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی ترقی، جنگ سے ہونے والے نقصانات کی تلافی اور بہتر طبی سہولتوں اور حفظانِ صحت کے لیے کثیر رقوم خرچ کر رہی ہے۔ گو کہ ترقی کا یہ عمل ذرا سست ہوگا لیکن بالآخر لوگ انتظامیہ کی کوششوں کے نتائج کو سراہیں گے۔ لیکن یالی کے ذہن میں صلے کا جو تصور تھا یعنی ڈھیروں کی مقدار میں ''کارگو'' کی آزادانہ فراہمی اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آفیسر کو افسوس تھا لیکن یہ سب جنگ کے دوران میں کیا جانے والا غیر ذمہ دارانہ پروپیگنڈا تھا جو یورپی افسروں نے موقع کی نزاکت کے پیش نظر اس وقت کیا تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ مقامی لوگ بجلی کی توقع کب تک کر سکتے ہیں۔ ناظمین نے بتایا کہ جیسے ہی وہ اس کے لئے ادائیگی کرنے کے قابل ہوں گے انہیں بجلی فراہم کر دی جائے گی اور اس سے پہلے نہیں۔ یالی بہت بدمزہ ہوا کہ گورنمنٹ نے بھی تبلیغی جماعتوں کی طرف جھوٹ بولا تھا۔

پورٹ مورسبے سے واپسی پر یالی نے کارگو کے ایک اور پیغمبر گورک سے خفیہ اتحاد کیا۔ یالی کے زیر تحفظ گورک نے لوگوں میں یہ بات پھیلا دی کہ مسیحی دیوتا نہیں نیوگنی کے

دیوتا ہی کارگو کا اصل اور صحیح ذریعہ تھے۔ مقامی لوگوں کو عیسائیت ترک کر کے اپنے لادینی عقائد کی طرف واپس لوٹ جانا چاہیے تاکہ وہ دولت اور خوشیوں سے ہم کنار ہو سکیں۔ روایتی رسوم و رواج، دستکاری کے ذریعے سامان کی تیاری کے ساتھ ساتھ سؤروں کی پرورش اور شکار وغیرہ کو دوبارہ متعارف کرانا چاہیے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی میزیں رکھ کر ان کو سوتی کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے اور ان پر پھولوں سے بھری بوتلیں سجادی جائیں۔ ان مقدس جگہوں پر (ایسا آسٹریلوی خاندانوں کے گھریلو منظروں کی جھلکیوں سے متاثر ہونے کے نتیجے میں تھا) خوراک اور تمباکو کے نذرانے پیش کرنے سے ''دیوتا'' اور ''اجداد'' ''کارگو'' بھجوانے پر مائل ہوں گے۔ ''اجداد'' رائفلیں، گولہ بارود، فوجی سازوسامان، گھوڑے اور گائیں اپنے ساتھ لائیں گے۔ آئندہ یالی کو بطور بادشاہ خطاب کیا جائے گا اور اتوار کی بجائے مقامی لوگوں کے لیے عبادت اور آرام کا دن جمعرات ہوا کرے گا جو یالی کا یوم پیدائش تھا۔ گورک نے بتایا کہ یالی معجزے کر سکتا تھا، وہ لوگوں پر تھوک کر یا بددعا کے ذریعے انہیں مار سکتا تھا۔

یالی کو کئی بار حکومت کی طرف سے ہدایات دی گئیں کہ وہ گشت کے دوران میں اپنے مقلدین پر کڑی نگاہ رکھے۔ اس نے ان مواقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے، اپنے حریف ''نبیوں'' کو دبانے اور دیہات میں اپنے زیراثر مقلدین کا جال بچھانے اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے جرمانے لگانے اور سزائیں دینا شروع کیں۔ کارکنوں کو بھرتی کیا اور اپنی پولیس فورس کا قیام عمل میں لایا۔ یالی نے اپنی تنظیم کے لیے سرمائے کی فراہمی کا انتظام ایک خفیہ نظام کے ذریعے کیا جس کی بنیاد ''مال و دولت'' کی تقسیم نو تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ صحیح معنوں میں حقیقی ''بڑا آدمی'' ہوگا۔

تبلیغی جماعتیں متواتر حکومتی ناظمین سے تقاضا کرتی رہیں کہ یالی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے لیکن انہیں یہ ثابت کرنا مشکل نظر آیا کہ مقامی لوگوں کے روز بروز بڑھتے ہوئے گستاخانہ اور غیر مؤدبانہ رویے کے پیچھے یالی کا ہاتھ تھا۔ یہ ثابت کرنا اور زیادہ مشکل تھا کہ ''کارگو'' کا اعتقاد موجود تھا کیونکہ یالی کے معتقد فرقے کے لوگوں کو حلفیہ یہ اعلان کرنے کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ''کارگو'' پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ مقامی لوگوں کو سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے کارگو سے متعلق اپنی سرگرمیوں کا انکشاف کیا تو یورپی لوگ نیوگنی کے

MashalBooks.org

دیوتا کو ایک بار پھر چرا کر اپنے ہاں لے جائیں گے۔ اگر مقامی لوگوں سے میزوں اور پھولوں سے متعلق پوچھا جاتا تو ان کو یہی جواب دینا ہوتا تھا کہ وہ تو محض گھروں کی آرائش کے لیے یورپی لوگوں کی تقلید تھی۔ جب کبھی یالی پر بے چینی پھیلانے کا الزام لگایا جاتا وہ احتجاج کرتا اور کہتا تھا کہ اس کا دیہات کے انتہا پسندوں سے کوئی تعلق نہیں تھا جو اس کے پبلک میں سرعام اعلان کئے گئے عقیدے کو غلط رنگ دیتے تھے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آسٹریلوی حکومت کو ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا جسے وہ کھلی بغاوت سمجھتی تھی۔ 1950ء میں یالی کو حراست میں لے لیا گیا اور اس پر زنا بالجبر کی ترغیب دینے اور دوسروں کو آزادی سے محروم کرنے کے الزامات لگا کر ان کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ اس پر جرم ثابت ہوگئے اور اسے چھ سال سزائے قید دی گئی تاہم یالی کے کاروبار زندگی کی دوڑ یہاں ختم نہیں ہوئی، بلکہ جب وہ جیل میں تھا تو یالی فرقے سے منسلک اس کے پیروکار ارکان نے افق کے پار سے اس کی جنگی اور تجارتی جہازوں پر مشتمل، ایک بیڑے کے سربراہ کی حیثیت سے فاتحانہ واپسی کی راہ تکتے رہے۔ ساٹھ کے عشرے میں بالآخر نیوگنی کے مقامی باشندوں کو کئی سیاسی اور اقتصادی رعائتیں دی گئیں۔ یالی کے پیروکاروں نے سکولوں کی تعمیر میں اضافے، قانون ساز کونسلوں میں مقامی امیدواروں کی شمولیت، اجرتوں میں اضافوں اور الکحل کے مشروبات کو استعمال کرنے کی ممانعت کے خاتمے کا سہرا یالی کے سر پر باندھا۔

جیل سے رہائی کے بعد یالی اس نتیجے پر پہنچا کہ ''کارگو'' کا راز نیوگنی کے ایوان اسمبلی کے پاس تھا۔ اس نے ''ماڈان'' کونسل کا ممبر منتخب ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک ضعیف اور معمر شخص کی حیثیت سے اس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ پھولوں سے سجی ہوئی لڑکیاں سال میں ایک مرتبہ اسے ملنے آتیں اور اس کا مادہ تولید بوتلوں میں بھر کر لے جاتیں۔ لوگوں نے اسے تحائف دینے جاری رکھے اور اس نے ان عیسائیوں سے بپتسمہ کی فیس وصول کرنا شروع کر دی جو اپنے عیسائی ہونے کے گناہوں کو دھوکر ''لادینیت'' پر واپس آنا چاہتے تھے۔ یالی کی آخری پیشگوئی یہ تھی کہ نیوگنی اگست 1969ء کی پہلی تاریخ کو آزادی حاصل کر لے گا۔ اس نے اس موقع کے لیے تیاری شروع کر دی اور جاپان، چین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اپنے سفیر مقرر کر دیئے۔

کوئی انسانی کاوش یا دوڑ دھوپ اپنے جواز کے لحاظ سے ناقابل فہم لگتی ہے اگر اس کے محرک ایسے مبہم تصورات ہوں جن کا تعلق ماضی کے وسیع مجموعی تاریخی پس منظر سے جوڑنا مشکل ہو۔ حالات کے دباؤ اور جبر سے مجبور ہونے کی صورت میں ایک مناسب عرصے تک اپنایا جانے والا وتیرہ...... یعنی کارگو کا اعتقاد بذات خود اس کا مظہر ہے کہ یہ قوت کے دو غیر متوازن حلقوں کے مابین، کڑی جدوجہد اور کشمکش میں کم سے کم مزاحمتی طریقہ کار ہے۔ کارگو اس جدوجہد کے انعام کی ایک شکل تھی جو جزیرے پر مشتمل براعظم کے قدرتی اور انسانی وسائل کے لیے کی گئی۔ ایک طرف بعید از عقل مجذوبانہ علم کی وحشیانہ ترنگ کی مستی اور دوسری طرف مہذبانہ طرز کی لوٹ مار اور غارت گری۔ دونوں برابر کے جوڑ تھے اور ان سب کی تہہ میں ٹھوس صلے اور سزائیں، محض خیالی پلاؤ ہونے کی بجائے، مضبوط بنیادوں کے ساتھ موجود تھیں۔

دیگر سب ایسے طبقوں کی طرح، جن کے مقبوضہ علاقوں اور آزادی کو حملہ آوروں سے خطرہ ہو، خواہ وہ وحشی ہوں یا مہذب ''مادان'' کے لوگوں نے کوشش کی کہ یورپی لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ لیکن انہوں نے شروع شروع میں ایسا نہیں کیا کیونکہ حملہ آوروں نے غیر مزروعہ زمینوں اور سستی مزدوری کی نہ مٹنے والی اپنی بھوک کا مظاہرہ، اپنی آمد کو کئی سال گزر جانے کے بعد کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا مرحلہ آنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔ تاہم ان کو مار بھگانے کی کوششیں ناکام ہوئیں کیونکہ نو آبادیاتی قبضوں کے خلاف کئی دوسری جنگوں کی طرح متحارب قوتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ مادانگ کے مقامی لوگوں کو دو بڑی رکاوٹوں اور مشکلوں کا سامنا تھا۔ ایک یہ کہ ان کے پاس جدید ہتھیاروں کی کمی تھی اور دوسرے وہ سینکڑوں قبیلوں اور ذیلی قبیلوں اور دیہات میں بٹے ہوئے تھے اور یوں منتشر حالت میں ہونے کے باعث دشمن کے خلاف متحد ہو جانے کے اہل نہیں تھے۔

یورپیوں کو باہر دھکیل نکالنے کی خواہش کبھی غائب نہ ہوئی۔ اس خواہش کو دبا دیا جاتا تھا لیکن یہ بجھتی نہیں تھی۔ مقامی لوگ پسپا ہو جاتے لیکن دیوانہ وار نئے جوش و جذبے اور عزم کے ساتھ پہلے سے مختلف انداز میں دوبارہ سامنے آتے۔ حملہ آوروں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا جو سرکش بڑے آدمیوں سے کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بی بڑے لوگوں کی

طرح اتنے ہی طاقتور تھے کہ انہیں تباہ و برباد کرنا تو ممکن نہ تھا لیکن پھر بھی وہ آئے دن کی سازشوں سے محفوظ نہ تھے۔ ان نرالے بڑے لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ اپنی دولت میں سے انہیں بھی حصہ دینے کے علاوہ زمین اور محنت مزدوری کے حصول کو حرزِ جان بنانے میں اعتدال سے کام لیں، مقامی لوگوں نے ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کی تاکہ ان کے پراسرار طور طریقوں کو سمجھ سکیں۔ اس طرح لوگوں کے عیسائیت اختیار کرنے، مقامی رسوم و رواج کو ترک کرنے، ٹیکسوں کی وصولی اور ان سے جبری مشقت لینے کا دور شروع ہوا۔ مقامی لوگوں نے ''تمیز'' سیکھی اور یوں اپنے استحصال کے عمل میں شریک کار بن گئے۔

اس وقفے کے نتائج دونوں میں سے کسی بھی فریق کے حسب خواہش تھے اور نہ کسی کو پہلے سے ان کا اندازہ تھا۔ سابقہ دور میں ایک دوسرے کے رقیب اور جدا قبیلے اور گاؤں اکٹھے مل کر غیر ملکی آقاؤں کی خدمت کرنے لگے۔ وہ اس اعتقاد کے تحت متحد ہوئے کہ عیسائی ''بڑے لوگ'' اتنے چابک دست اور ہوشیار ہیں کہ وہ سب کے لیے آسودہ حالی کا ماحول قائم کر سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسی مملکت قائم کریں گے جو بہشت کی مانند ہوگی اور جس میں سب آسودہ ہوں گے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ کارگو پھر سے بانٹا جائے۔ تبلیغی جماعتوں کے نزدیک عیسائیت کا مفہوم وہ نہیں تھا جو یہ لوگ سمجھ رہے تھے لیکن مقامی لوگوں نے اپنے ذاتی مفادات کے تحت مشنریوں کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ عیسائیت سے مراد وہی کچھ لیا جائے جو کچھ تبلیغی جماعتوں کے مؤقف سے ہم آہنگ ہو۔ ان کا اصرار تھا کہ یورپی لوگوں کو صحیح معنوں میں ''بڑے آدمیوں'' کا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اور وہ اس پر بھی مصر تھے کہ جو لوگ دولت مند تھے ان پر اس دولت کو بانٹ دینا واجب تھا۔

مغربی اقوام مقامی لوگوں کی اس سادہ لوحی سے بڑے دلچسپ انداز میں متاثر ہیں۔ جس کی بنا پر وہ یورپی لوگوں کی معاشی اور مذہبی طرز زندگی کو سمجھ نہیں پائے۔ اس میں حائل رکاوٹ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ مقامی لوگ تہذیب و تمدن کے اصولوں پر گرفت کے ضمن میں بہت زیادہ پس ماندہ بیوقوف یا ضعیف الاعتقاد ہیں۔ لیکن یالی کے قصے میں یہ وجہ حقیقی صورت حال کی صحیح ترجمان نہیں۔ یہ نہیں کہ یالی کو ان اصولوں کا ادراک نہ تھا بلکہ اسکے برعکس اس کے لیے یہ اصول ناقابل قبول تھے۔ جو لوگوں نے اس کی تربیت کی تھی وہ اس پر حیرت زدہ تھے کہ ایسا شخص جس نے جدید طرز کی فیکٹریاں چلتے اور کام کرتے دیکھی تھیں پھر

بھی وہ کیسے کارگو کی خیالی اختراع پر یقین کر سکتا تھا۔ لیکن یالی نے اس عملی پہلو کو جتنے زیادہ انہماک اور غور سے دیکھا کہ یورپی لوگ دولت کس طرح پیدا کرتے ہیں، وہ ان کی اس منطق سے اتنا زیادہ غیر مطمئن ہوتا جو وہ اس کے اور اس کے ہم وطن لوگوں کے اس خوش حالی میں شریک اور حصہ دار نہ ہونے کے سلسلے میں پیش کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے یورپی لوگوں کے امیر کبیر ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی بلکہ اس کے برعکس س کے متعلق آخری بار یہ سننے میں آیا کہ غور وفکر کے بعد اس کے تخلیق کئے گئے نظریے کے مطابق یورپی لوگوں کی امارت کی وجہ چکلے اور رقبہ خانے بنانا تھی۔ لیکن یالی کی یہ سوچ معقولیت پر مبنی تھی جس کے تحت وہ یورپین لوگوں کی امارت کی وجہ ان کی محنت ومشقت کو ہمیشہ مسترد کر دیتا تھا اور اسے سوچی سمجھی دھوکہ دہی سمجھتا تھا۔ ہر شخص کو یہ حقیقت نظر آتی تھی اور یورپی ''بڑے لوگ'' اپنے اصل ابتدائی باشندوں کے برعکس بمشکل ہی کوئی محنت ومشقت کرتے تھے۔

یالی نے جس طرح نظام کائنات کو سمجھا، اس قسم کی سوچ کو بڑی اکھڑ اور وحشی ذہنی اپج پر مبنی اجارہ داری کی آئینہ دار قرار دینا مشکل ہے۔ دوسری غیر ملکی نو آبادیوں کی طرح جنوبی ساحلی علاقوں میں بھی عیسائی مشنریاں کسی دوسرے کی شرکت کے بغیر، مقامی لوگوں کو تعلیم دینے کا اختیار رکھتی تھیں۔ یہ مشنریاں سائنسی تجزیوں کے لیے عقلی اور ذہنی تربیت کا ذریعہ نہیں تھیں مطلب یہ کہ وہ یورپ کے سرمایہ داری سے متعلق کسی نظرئے کی تعلیم نہیں دیتی تھیں اور نہ تو آبادیاتی نظام کی اقتصادی پالیسیوں کا کوئی جائزہ پیش کرتی تھیں۔ اس کی بجائے وہ تخلیق آدم، پیغمبروں اور پیش گوئیاں، فرشتوں اور یسوع مسیح، مافوق الفطرت نجات، یوم حساب، روز محشر اور ابدی بادشاہت کے بارے میں پڑھاتے تھے جس عہد میں مردہ اور زندہ لوگوں کا دوبارہ ملاپ ہوگا اور شہد کی نہریں رواں ہوں گی۔

لامحالہ ان تعلیمات کی بدولت جن میں سے اکثر موضوع کی یکسانیت کے اعتبار سے قدیم عہد کے اعتقادات سے ملتی جلتی تھیں اور جنہیں پہلے نو آبادیاتی استحصال کے خلاف اور عوامی مزاحمت سے بچنے کے لیے عیسائیت کی تبلیغ سے موسوم کیا گیا دراصل بغاوت کی آغوش ثابت ہوئیں۔ کسی قسم کی کھلی احتجاجی تحریکوں، ہڑتالوں، یونینوں اور سیاسی جماعتوں کو دبا کر یورپین نے خود ''کارگو'' کی کامیابی اور فتح کے لیے راہ ہموار کی۔ مشنریوں کے اس جھوٹ کو نظر انداز کرنا نسبتاً سہل تھا جب وہ کہتے تھے کہ کارگو صرف ان لوگوں کے حصے میں

آئے گا جو محنت ومشقت کریں گے۔ مشکل کام اس حقیقت کا ادراک تھا کہ آسٹریلوی اور امریکیوں کی دولت کے انبار اور مقامی لوگوں کی محنت ومشقت کے مابین ایک قطعی ربط موجود تھا۔ مقامی مزدوروں کی سستی اجرتوں اور مقامی زمینوں پر ملکیتی حقوق کے بغیر غیر ملکی قابض قوتیں کبھی اتنی امیر نہیں ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ ایک لحاظ سے مقامی لوگ، صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ اقوام کی تیار کردہ اشیا میں حصہ دار بننے کے حق دار تھے خواہ وہ ان کی ادائیگی نہیں بھی کر سکتے تھے۔ اس حق طلبی کا طریقہ کار ''کارگو'' تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کا اصل راز ہے۔

☆☆☆

MashalBooks.org

ذکر مسیحاؤں کا

مجھے یقین ہے کہ آپ نے ''کارگو'' سے متعلق مذہبی رسوم اور مسلکوں اور عیسائیت کے ابتدائی اعتقادات کے مابین مشابہت کو محسوس کر لیا ہوگا۔ یسوع مسیح نے بے بدکار گناہ گاروں کے زوال، غریب کے لیے انصاف، مصیبتوں کے خاتمے، وفات پاجانے والوں سے جدائی کے بعد دوبارہ ملاقات اور مکمل طور پر نئی خدائی بادشاہت کی پیش گوئی کی تھی۔ یالی نے بھی یہی کچھ کہا۔ اب کیا بے وجود ''کارگو'' کا معمہ ہمیں اپنی طرز زندگی میں مذہبی رنگ شامل ہونے کی ابتدا جن حالات میں ہوئی اس کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے؟

اس پر کئی اہم اختلافات ہیں۔ ''کارگو'' کے معتقدین اپنے اس مسلک پر سختی سے قائم تھے۔ ایک مخصوص سیاسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے اپنے مسلک پر اور اس کی جگہ ایک ایسی بادشاہت کی تخلیق جو دنیاوی مفادات کی یقینی ضمانت ہو۔ مقامی لوگ مر جانے والوں کی زندہ ہو کر دوبارہ وردیوں میں ملبوس اور مسلح روپ میں واپسی کے متوقع تھے جنہوں نے نیوگنی میں تعینات پولیس اور فوج کی نفری کے خلاف جنگ کرنی تھی۔ جبکہ یسوع مسیح کو کسی مخصوص سیاسی نظام کا تختہ الٹنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سیاست بازی سے ارفع تھے۔ ان کی بادشاہت ''اس دنیا کے لیے نہیں تھی۔'' جب پہلے عیسائی نے ''بدمعاش گناہ گاروں'' کے خلاف جنگ کی بات کی تو ان کی ''تلواریں'' بندوقوں کے فائر اور ''فتوحات'' محض دنیاوی استعارے تھے جن کا تعلق انسانی فہم وشعور سے ماورا اور افضل روحانی واقعات سے تھا۔ کم از کم یسوع مسیح سے متعلق اس بنیادی عقیدے کی حقانیت پر ہر شخص کو یقین ہے۔

یہ ناممکن دکھائی دیتا ہے کہ ایسی غری دنیاوی طرز زندگی جو امن و آشتی اور محبت کی پیامبر ہو اور ذاتی اغراض سے پاک ہو، بنیادی طور پر کسی بھی طرح، قطعی مادی مقاصد اور

MashalBooks.org

فوائد کی متقاضی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی دوسری سب پہیلیوں کی طرح، اس معمے کا حل بھی قوموں اور نسلوں کے عملی طرزِ عمل میں مضمر ہے۔

دراصل دو معموں پر غور کرنا چاہئے۔ عیسائیت کا آغاز یہودیوں سے ہوا جو فلسطین میں رہتے تھے۔ یہودیوں کے اعتقاد کا ایک اہم پہلو اور ایمان کا حصہ مظلوم اور بے نوا لوگوں کے ایک نجات دہندہ لیڈر کی آمد تھی جسے ''مسیحا'' کہا جاتا تھا...... انسان کے روپ میں ایک دیوتا۔ یسوع مسیح کے اولین پیروکاروں کو جو تقریباً سب کے سب یہودی تھے یقین تھا کہ یسوع مسیح ہی وہ نجات دہندہ قائد تھے۔ عیسائیوں کے ابتدائی دور کے اسلوب زندگی سے متعلق پہیلی بوجھنے سے پہلے میں ''مسیحا'' کی آمد سے متعلق یہودیوں کے یقین اور اعتقاد کی اساس پر روشنی ڈالوں گا۔

آج کے جدید دور کی اکثر اقوام کی طرح پرانے زمانے کی قوموں اور لوگوں کا اعتقاد تھا کہ خدائی مدد کے بغیر جنگیں نہیں جیتی جاسکتیں۔ کسی سلطنت پر قبضہ کرنے یا صرف ایک آزاد ریاست کے طور پر زندہ رہنے کے لیے آپ کو ایسے جنگ جو مطلوب تھے جن کی پشت پناہی ''اجداد''، فرشتے یا دیوتا کر رہے ہوں۔

داؤد، جنہوں نے پہلی اور وسیع ترین یہودی سلطنت کی بنیاد رکھی، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ''یہودا'' (تورات میں خدا کا یہی نام ہے) کے ساتھ ''خدائی'' میں شامل اور حصہ دار تھے۔ لوگ داؤد کو ''مسیحا'' کہتے تھے۔ یہ وہ اصطلاح تھی جس کا اطلاق وہ پادریوں، محافظوں، داؤد کے پیش رو ساحول اور داؤد کے بیٹے سلیمان وغیرہ پر بھی کرتے تھے۔ اس لئے غالباً ''مسیحا'' کے اصل معنی کوئی بھی متبرک شخصیت، کے تھے اور مسیحا کا لفظ کسی بھی متبرک شخصیت اور مقدس قوت والی ہستی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ داؤد (ڈیوڈ) کو مجاز ہستی بھی کہا جاتا تھا۔ یعنی ایسی ہستی جو یہودا کی مرضی اور منشا کے مطابق اس کی اقلیم ارضی پر حکمرانی کا مستحق تھا۔

حضرت داؤد پیدا ہوئے تو ان کا نام ''الحنان بن جیس'' تھا۔ انہیں داؤد کا نام، جس کا مطلب ''سالارِ اعظم'' تھا، میدان جنگ میں ان کی شان دار فتوحات کے اعتراف میں دیا گیا۔ ایک عام انسان کی حیثیت میں ابتدا کرنے کے باوجود اقتدار میں آنے سے ان کے اندر وہ بنیادی جذبہ پیدا ہوا جس کے زیر اثر انہوں نے اپنا مقصدِ حیات ایک مثالی

یہودی، عسکری نجات دہندہ قائد بننے کو بنا لیا۔ ''وہ بیتھیلہم'' میں پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کا عرصہ بطور چرواہے کے بسر کیا۔ بعد میں وہ ایک صحرائی گوریلا تحریک میں باغی لیڈر بن گئے۔ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر ایک غار میں بنایا اور بظاہر ناقابل بیان مشکلات میں فتوحات حاصل کیں جن کا لب لباب گولیاتھ کے خلاف جنگ تھی۔

یہودی پادری یسوع مسیح کی آمد تک اصرار کرتے رہے کہ ''یہودا'' کا داؤد کے ساتھ معاہدہ تھا۔ ''یہودا'' کا وعدہ تھا کہ داؤد کی شاہی نسل کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لیکن داؤد کی وفات سے تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ 586 قبل مسیح میں اس سلطنت کا وجود عارضی طور پر اس وقت ختم ہوگیا جب یروشلم پر ''نیو چندراز'' نے قبضہ کر لیا اور یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو ملک بدر کر کے ''بیبی لونیا'' کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے بعد یہودی ریاست غیر یقینی اور غیر مستحکم صورت میں دوبارہ وجود میں آئی جو کسی ایک یا دوسری سامراجی طاقت کی محتاج تھی۔

''یہودا'' نے موسیٰ کو بتایا: ''تم کئی قوموں پر حکمرانی کرو گے لیکن وہ تم پر حکمرانی نہیں کر سکیں گے۔'' مگر یہودا کی طرف سے جس سرزمین کا وعدہ کیا گیا تھا اور جہاں سے دینا کو زیر نگیں کرنے کی مہم شروع کی جانی تھی وہ جگہ اس مقصد کے امکانات کی حامل نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ فوجی قافلوں کی شاہراہ تھی۔ ایک ایسی گزرگاہ جس کے ذریعے سامراجی قوتوں کی ایشیا، افریقہ اور یورپ کی فوجوں کی (ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی) زد میں رہی جو مصر آتی یا وہاں سے جاتی تھیں۔ کسی علاقائی عظیم قوت کے فلسطین میں قدم جمانے کے امکان سے پہلے، لاکھوں کی تعداد پر مشتمل فوجوں نے ایک یا دوسری طرف جاتے ہوئے اسے روند ڈالا تھا۔ مصری شاہی یونانی اور رومی فوجوں نے اس مقدس سرزمین کے راستے پے در پے حملے کئے اور دوسرے کے حق میں دست برداری سے پہلے ان جگہوں کو دوبارہ نذر آتش کر دیتے رہے۔

ان واقعات سے ''یہودا'' کی مقدس کتابوں اور اس کے پجاریوں پر اعتقاد کو کافی دھچکا لگا۔ آخر ''یہودا'' نے اتنی ساری قوموں کو عظیم کیوں بننے دیا جب کہ اس کے پسندیدہ اور منتخب لوگ کئی قوموں کے مفتوح ہوئے اور غلام بنائے گئے؟ ''یہودا'' نے داؤد سے کیا ہوا وعدہ کیوں پورا نہیں کیا؟ یہودیوں کے نیک لوگ اس پراسرار معمے میں گرفتار ہو کر اسے

سمجھنے کی کوششوں میں ناکام رہے۔

اس کا جواب: ''یہودا'' نے داؤد سے کیا ہوا وعدہ کیوں پورا نہیں کیا؟ اس لئے کہ یہودیوں نے ''یہودا'' سے کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کئے تھے۔ لوگ مقدس قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے تھے، اور انہوں نے فحش اور ناپاک رسوم و رواج کو اپنالیا تھا۔ وہ گناہ کرتے تھے۔ مجرم تھے اپنے تنزل کے خود ذمہ دار تھے۔ لیکن ''یہودا'' معاف کر دینے والا خدا تھا اور وہ اب بھی اپنا وعدہ پورا کرے گا اگر یہودی سزا بھگتنے کے باوجود اپنے اس عقیدے پر قائم رہیں کہ ''ایک ہی سچا خدا تھا۔'' اپنی غلطیوں کے احساس، ان پر پچھتاوے اور معافی کے طلب گار ہونے سے وہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکتے تھے۔ ''یہودا'' اپنے معاہدے کو دوبارہ بحال کر سکتا تھا۔ ایک پراسرار بات یہ کہ جب وہ ان شرائط پر عمل پیرا ہو کر اپنے گناہوں کی پوری طرح تلافی کر دیں گے تو ایک ایسا وقت آئے گا جس کا علم صرف ''یہودا'' کو تھا ...... جب اس کے لوگ انتقام لے سکیں گے۔ ''یہودا'' داؤد کی طرح ایک اور ''عسکری شہزادہ'' نجات دہندہ اور حکمرانی کی مجاز ہستی کو دشمن کی تباہی کے لیے بھیجے گا۔ سب بہت بڑی جنگیں لڑی جائیں گی۔ پوری دنیا فوجوں کے تصادم سے اور شہروں کے سقوط سے مضمحل ہو کر ہانپنے لگے گی۔ یہ ایک دنیا کا خاتمہ ہوگا اور ایک دوسری دنیا کا آغاز، کیونکہ ''یہودا'' کو کمزور نہ بنایا ہوتا اور مصیبتیں جھیلنا ان کا مقدر نہ بنایا ہوتا۔ اگر اس کا ارادہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ ہوتا اور اتنا زیادہ صلہ دینے کا نہ ہوتا جتنا اس سے پہلے کبھی انسان کے علم میں نہیں تھا۔ اور اسی لئے عہد نامہ عتیق (توریت) نجات دہندہ پیغمبروں سے بھری پڑی ہے۔ ''اسائیہ'' ''ترمیڈ'' ''ایزیکیل'' ''میکاہ'' ''ذکر'' اور کئی دوسرے......جن سب نے نجات کے لیے عسکریت پسند اسلوب زندگی پر زور دیا، اس کی حمائت کی ہے۔

''عیسائیہ'' ایک عجیب مشیر اور صلاح کار کا ذکر کرتے ہیں جو زبردست قوت کا مالک ''خدا'' ہے۔ لافانی اور ابدی باپ، امن کا شہزادہ ہے۔ جو داؤد کے تخت و تاج پر ہمیشہ حکمرانی کرے گا۔ یہ نجات دہندہ سیریا (قدیم عراق) اور قدیم ایشیائی علاقے کو گلیوں کی مٹی کی طرح لتاڑ اور روند کر رکھ دے گا۔ ''بیبی لون'' کو ایک ایسے تباہ حال شہر میں بدل دے گا جس میں الوّؤں اور ان جیسی غمگین مخلوقات کا بسیرا ہوگا۔ ''معاب'' کے لوگوں کو سر اور داڑھی کے بالوں سے محروم کر دے گا۔ دمشق کو کھنڈرات کا ڈھیر بنا دے گا اور وہ مصر کو ایسی

خانہ جنگی میں مبتلا کرے گا جس میں ہر شخص اپنے ہمسائے سے، ہر شہر دوسرے شہر سے اور بادشاہت دوسری بادشاہت سے برسر پیکار ہوگی۔

جرمیاہ ''یہودا'' کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ :''ان دنوں اور اس عہد تک میں صداقت اور پارسائی کے سلسلے کی شاخ کو داؤد تک پھلنے پھولنے دوں گا اور وہ زمین پر حق و انصاف، صداقت اور نیکی کو پھیلائے گی اور پھر تلوار مصریوں کو کھا جائے گی اور اس کی پیاس ان کا خون پی کر بجھے گی۔ فلسطین کے باشندے چیخیں چلائیں گے اور وہاں کے رہنے والے سب بھونکنے لگیں گے۔ ''معاب'' سے رونے کی لگا تار آہ و بکا آئے گی۔ ''ایمران'' ایک ویرانی کا ڈھیر اور سنسان جگہ بن جائے گی اور اس کی بیٹیوں کو آگ میں جلا دیا جائے گا۔ دمشق میں لوگ اور نوجوان اس کے گلی کوچوں میں گرے پڑے ہوں گے۔ ''ایلام'' ایک تباہ و برباد ویرانہ ہوگا۔ ''ہیزر'' سانپوں اور اژدہاؤں کا ٹھکانہ بن جائے گا۔ ''ایلم'' کو بھی تلوار کھائے گی اور جہاں تک ''مبیلان'' کا تعلق ہے، اس کی آخری سرحد، آسمان سے اس کے خلاف آنے والی مصیبت کے باعث اس کے گودام کھول دئے جائیں گے۔ اسے ایک ڈھیر کے مانند اوپر اٹھایا جائے گا اور بہت بری طرح اسے تباہ کر دیا جائے گا۔ اس کی کوئی چیز باقی نہیں بچنے دی جائے گی۔''

''ڈینیل'' کی کتاب میں بھی جو تقریباً 165 قبل مسیح لکھی گئی جب فلسطین پر شام کے یونانی حکمران تھے، ایک ایسے عسکری مسیحائی نجات دہندہ مجاز ہستی کا ذکر ملتا ہے...... ایک شہزادہ جو ایک عظیم یہودی سلطنت کا بانی ہوگا۔ (ذکر) یوں ہے ''میں نے رات خواب دیکھا اور اب بھی میرے دھیان میں ہے ''سن آف مین'' (ابن آدم) بہشتی بادلوں کے ساتھ آیا...... اور اسے حکومت، شہرت اور ایک سلطنت ملی کہ سب قومیں، نسلیں اور زبانیں اس کی خدمت گزار ہوں گی ...... ایک پائیدار ارو دائمی حکومت ...... ایسی بادشاہت جو کبھی تباہ نہیں کی جائے گی۔

انتقام پر مبنی ان پیش گوئیوں سے متعلق اکثر لوگ یہ احساس نہیں کر پاتے کہ یہ پیش گوئیاں، آزادی کی حقیقی جنگوں سے جڑی ہوئی تھیں، جو زندہ سلامت حقیقی عسکری نجات دہندوں کی قیادت میں لڑی گئیں۔ ان جنگوں کو اس وجہ سے بھی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کا مقصد نہ صرف یہودی ریاست کی آزادانہ حیثیت کو بحال کرنا تھا بلکہ غیر ملکی حکومتوں کی طرف

سے تھوپی گئی، نا قابل برداشت اقتصادی اور سماجی عدم مساوات کے خاتمے کی امید بھی دلاتی تھیں۔

کارگو کی طرح، انتقامی جذبوں کے حامل نجات دہندہ کا اعتقاد اس جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں ظاہر ہوا اور متواتر دلوں میں جگہ بناتا گیا جو استحصال پر مبنی، غیر ملکی اقتدار کے باعث سیاسی اور معاشی نظام کو الٹنے کے لئے کی گئیں۔ یہ اکلوتی مثال تھی کہ ملکی باشندے یعنی یہودی، فوجی لحاظ سے اپنے مدمقابل فاتحین کے لئے برابر کا جوڑ تھے اور ان کی قیادت پڑھے لکھے عسکری پیامبر کر رہے تھے، جنہیں اس بہت قدیم زمانے کا بھی علم تھا جب ''اجداد'' نے بھی اپنی ایک ''سلطنت'' قائم کی ہوئی تھی۔

رومن عہدِ حکومت کے دوران، میں اگر فلسطین میں کسی طرز زندگی کو برتری کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ انتقامی جذبے سے سرشار نجات دہندہ فوجی قیادت تھی۔ ''گولیاتھ'' کے خلاف داؤد کی کامیابی اور فتح یابی، اور ''یہودا'' کے عسکری نجات دہندوں کے ذریعے خلاصی اور آزادی کے وعدے سے حوصلہ پا کر یہودی گوریلوں نے رومن فوج اور انتظامیہ کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی۔ پر امن ذریعہ نجات...... یعنی یسوع مسیح اور اس کے پیروکاروں کا اسلوب اور مطمحِ نظر، اس گوریلا جنگ کے دوران میں پروان چڑھا اور وہ بھی فلسطین کے ان ضلعوں میں جو باغیوں کی سرگرمیوں کے مرکز تھے اور یہ بات بظاہر، آزادی کے لئے لڑنے والوں کی چالوں اور حکمت عملیوں کے سراسر خلاف تھی۔

عیسائیوں کی انجیل میں یسوع مسیح کی یہودیون کی تحریک آزادی سے متعلق کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی بلکہ ذکر تک بھی نہیں۔ صرف انجیل پڑھنے سے آپ کو کبھی علم نہ ہوگا کہ یسوع مسیح نے زندگی کا زیادہ تر حصہ اس جگہ پر گزارا جو تاریخ میں شدید ترین گوریلا تحریکوں کا مرکز تھی۔ انجیل کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات بھی معلوم نہیں ہوگی کہ یہ تحریک یسوع مسیح کے مصلوب کئے جانے کے بہت عرصہ بعد تک جاری رہی۔ آپ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ 68ء میں یہودیوں نے ایک مکمل انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کیا جس میں چھ بڑے رومن فوجی لشکروں کو حصہ لینا پڑا اور ان لشکروں کی قیادت مستقبل میں بننے والے دو رومن بادشاہوں نے کی، تب کہیں جا کر اس کوشش پر قابو پایا جا سکا۔ اور سب سے کمتر شبہ آپ کو اس پر ہوگا کہ یسوع مسیح کی موت رومیوں کی ان کوششوں کا شکار ہونے کی وجہ سے

واقع ہوئی جو وہ یہودیوں کے ان عسکری انقلاب پسندوں کو تباہ کرنے کے لیے کر رہے تھے جو یہودیوں کی نجات کا ذریعہ عسکری نجات دہندوں کو سمجھتے تھے۔

رومیوں کے زیر تسلط نو آبادی ہونے کے دوران میں فلسطین میں سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے نوآبادیاتی نظام حکومت کی علامات اور سب خرابیاں بڑی واضح تھیں۔ وہ یہودی جو انتظامیہ یا مذہبی بڑے عہدوں پر فائز تھے، محض کٹھ پتلیوں کی مانند حکمرانوں کے طرف دار تھے۔ بڑے بڑے پادری (کاہن) دولت مند زمین دار اور تاجر بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے۔ لیکن آبادی کی بڑی اکثریت مالکوں کے زرخرید بے زمین مزارعوں، بہت کم معاوضوں یا بغیر معاوضوں پر کام کرنے والے اہل حرفہ (کاریگروں) نوکروں اور غلاموں پر بیگار کی مزدوری کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا۔ اپنی زمینوں سے غیر حاضر زمین دار، یروشلم میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ جبکہ زرعی پیداوار پر رومیوں کی طرف سے عائد کیا جانے والا ٹیکس ان کے مزارعوں کو دینا ہوتا تھا۔ ان سب مصیبتوں پر مستزاد عذاب پیداوار کے بقیہ حصے پر 22فیصد ٹیکس گرجا گھر کا تھا جو حکومتی 25فیصد ٹیکس کے علاوہ تھا۔ ''گیلیلن'' کسانوں کی یروشلم کی اشرافیہ کی حکومت کے حامی طبقہ امراء کے خلاف نفرت بالخصوص نمایاں اور ''جیسے کو تیسا'' کی مظہر تھی۔ ''تالمودی'' تبصروں میں سچے یہودیوں کو اپنی بیٹیاں دھرتی کے مقامی لوگوں سے نہ بیاہنے کی نصیحت کی گئی ہے کیونکہ گیلیلن کسانوں سے متعلق کہا جاتا تھا: ''کیونکہ وہ ناصاف، میلے کچیلے جانور ہیں۔'' رابی ایلیزر نے طنزیہ انداز میں سفارش کی کہ...... سال کے مقدس ترین دن جب کسی اور جانور کو نہ کاٹا جائے، اس قسم کے لوگوں کو کاٹ کر کھانا چاہیے اور رابی جو ہاناں نے کہا کہ ایک عام آدمی کو مچھلی کی مانند ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیے۔ رابی الیزر کا کہنا یہ تھا کہ ایک عام معمولی آدمی کی پڑھے لکھے عالم کے ساتھ دشمنی کہیں زیادہ شدید تر ہوتی ہے بہ نسبت اس دشمنی کے جو ایک ''لامذہب'' کو اسرائیلیوں سے ہوتی ہے۔

عسکری قوت کے بل بوتے پر نجات اور گلو خلاصی کا تصور، بیرونی قوتوں کے کٹھ پتلی بننے والوں کی جگہ یہودی قوم پرستوں کو دیکھنے کی خواہش میں بدل گیا گیلیلن داؤد کی سلطنت کی بحالی دیکھنے کے خواہشمند تھے کیونکہ پیش گوئی کرنے والے رسول کا کہنا تھا کہ نجات دہندہ مسیحا، معاشی اور سماجی استحصال کو ختم کر دے گا اور کمینے پادریوں، زمین داروں

اور بادشاہوں کو سزائیں دے گا۔ اس موضوع کا ''بک آف ریناچ'' میں یوں اعلان کیا گیا ہے:

الم ناک ہے تمہارا مقدر۔ تم امیروں کا، کہ تم نے اپنی امارت پر بھروسا کیا اور تمہیں تمہاری دولت سے چیر کر علیحدہ کردیا جائے گا ...... غمناک ہے تمہارا انجام جو اپنے ہمسائے کی اچھائی کا بدلہ برائی سے دیتے ہو کیونکہ ہمیں بھی اپنے برے اعمال کی سزا ملے گی...... حیف ہے تم پر جو جھوٹی گواہیاں دیتے ہو...... لیکن تمہیں جو مصیبتیں جھیل رہے ہو نہیں گھبرانا چاہیے کیونکہ تمہارے حصے میں سلامتی اور تکلیفوں کا مداوا ہے۔

''یہودا'' کی طرف سے خدائی سلطنت کے قیام پر منطقی بحث و مباحثہ میں انسانی تجربات بحیثیت مجموعی، کلی صورت میں زیر غور لائے گئے۔ ''کارگو'' کے معاملے کی طرح اس میں بھی غیر مذہبی اور مقدس مذہبی، دونوں اجزائے ترکیبی کو الگ الگ تقسیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ''اس جہان'' اور ''اگلے جہان'' ، ''موجودہ زندگی'' اور ''حیات بعد الموت'' کے موضوعات ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ زمین و آسمان ایک پریشان کن صورت میں گڈ مڈ تھے۔ قدرت کو خدا میں مدغم کر دیا گیا تھا۔ نئے جہان میں زندگی بالکل مختلف شکل کی ہوگی۔ ہر چیز کو الٹا کر دیا جائے گا۔ یہودی حکومت کریں گے اور رومن اس کی رعیت ہوں گے۔ غریب امیر بن جائیں گے اور بدمعاشوں کو سزا ملے گی۔ بیمار صحت یاب ہو جائیں گے اور مردہ لوگوں کو پھر زندگی مل جائے گی۔

یہودیوں نے رومیوں کے خلاف جنگ کا آغاز اس وقت سے ذرا پہلے کیا جب رومن سینٹ نے ''ہیروڈ اعظم'' کی تقرری بطور کٹھ پتلی بادشاہ کی توثیق کر دی۔ شروع شروع میں رومیوں اور یہودیوں کے حکمران طبقے کے نزدیک گوریلوں کی پہچان چور اچکوں کے طور پر تھی۔ لیکن یہ چور اچکے اتنے مجرم چوریاں کرنے کے نہیں تھے جتنے زمینوں سے غیر حاضر مالکان اور ٹیکس جمع کرنے والے رومنوں کے خلاف اپنے عزائم کے اور ان کے خلاف بنائے جانے والے منصوبوں کے۔ گوریلا لڑائی لڑنے والے کے لیے ''تشدد پسند متعصب'' کی متبادل اصطلاح بھی استعمال ہوتی تھی، جس سے یہودیوں کی عمل داری اور ''یہودا'' کا قول پورا ہونے سے متعلق ان کے جوش و خروش اور اشتیاق کی عکاسی ہوتی تھی۔

ان میں سے کوئی اصطلاح بھی اپنے طور پر اس مقصد کو واضح نہیں کرتی کہ یہ

فعال لوگ کیا کر رہے تھے۔ ہاں اگر انہیں جو شیلے، سرگرم، متعصب، چور اچکے گوریلے کہا جائے تو اس صورت میں ان کی سرگرمیوں کو ان کے روزانہ معمولات زندگی کے سیاق وسباق سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ان چور اچکے، جوشیلے، سرگرم اور متعصب گوریلوں کو یقین تھا کہ ایک مسیحا کی امداد سے وہ بالآخر رومن سلطنت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہوں گے۔ ان کا یہ اعتقاد اور یہ عشق صرف ایک ذہنی اپچ (کیفیت) نہیں تھی بلکہ یہ ایک انقلابی دستور العمل تھا جس میں خوف و ہراس، اشتعال انگیزی، ڈاکے اور راہ زنی، قتل وغارت، دہشت گردی اور بہادری کے ایسے کارنامے شامل تھے جن کا انجام موت ہوتا ہے۔ کئی لوگوں نے شہری گوریلا جنگ کے داؤ پیچ میں مہارت حاصل کی جو ''خنجر جوان'' کہلاتے تھے۔ ان کے باقی ساتھی دیہات میں رہتے تھے اور ان کے ٹھکانے غاریں یا پہاڑوں کی ڈھلوانوں میں چھپنے کی جگہیں تھیں اور ان کی خوراک اور حفاظت کی ذمہ داری اجڈ گنوار دیہاتیوں سپرد تھی۔

پہلی صدی عیسوی کے دوران فلسطین کی سیاسی اور فوجی صورت حال کے واقعات پر تبصرے کے لیے ہمیں بڑی حد تک قدیم زمانے سے متعلق مشہور اور معروف تاریخ دان فلیوس جوزیفس کی تحریروں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ میں جن واقعات اور معاملات کو اب زیر بحث لانے چلا ہوں، ان سے واقفیت چونکہ اتنی عام نہیں اس لیے مجھے اس ذریعہ کے قابل اعتماد ہونے سے متعلق ذرا کچھ کہنے دیجئے۔ جوزیفس عیسائیوں کی اولین الہامی کتاب انجیل کے مصنفین کا ہم عصر تھا۔ اس کی دو کتابیں ایک ''یہودی جنگ'' اور دوسری ''یہودیون کے قدیم طور طریقے'' کو محققین اور سکالر، پہلی صدی کے فلسطین کی تاریخ کے بارے میں خود انجیل سے کم اہمیت نہیں دیتے۔ ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ جوزیفس کون تھا اور اس نے اپنی کتاب لکھنا کیسے شروع کیں، جبکہ انجیل کے مصنفین سے متعلق ہمیں ایسا کوئی علم نہیں۔ جوزیفس ،متھیاس کے گھر پیدا ہوا۔ (۳۷ء) اس کے والد کا تعلق ایک خوش حال یہودی خاندان سے تھا۔ ۶۸ء میں جب وہ ابھی ۳۱ سال کا تھا جوزیفس گیلیلی کا گورنر بن گیا اور یہودیوں کی سپاہ آزادی کی روم کے خلاف جنگ میں ایک جرنیل مقرر ہوا۔ ''جونا پاتا'' کے محاصرے میں جب اس کے ساتھیوں کا صفایا ہو گیا تو جوزیفس نے ہتھیار ڈال دیئے اور رومن جرنیل ویسپاسین اور اس کے بیٹے ٹیٹس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس پر جوزیفس نے اعلان کیا کہ ویسپاسین ہی وہ ''مسیحا'' تھا جس کا یہودیوں کو انتظار تھااور یہ کہ ویسپاسین اور

ٹیٹس دونوں مستقل طور پر روم کے حکمران بادشاہ ہوں گے۔

ویسپاسین فی الواقعی ۶۹ء میں بادشاہ بن گیا اور اس کی الہامی پیش گوئی کے حیلے میں اسے نئے بادشاہ کی ہمراہی میں جانے والے مصاحبین کے ساتھ روم لے جایا گیا۔ اسے روم کی شہریت دی گئی۔ شاہی محل میں ایک رہائشی حصہ دیا گیا اور تاحیات پنشن اس آمدنی میں سے منظور کی گئی جو رومنوں نے فلسطین میں جنگ کے دوران میں بطور تاوان فارم ضبط کیے تھے، ان سے ہوتی تھی۔

جوزیفس نے باقی زندگی کتابیں لکھنے میں بسر کی۔ ان کتابوں میں اس نے صفائی پیش کی کہ یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کیوں بغاوت کی تھی اور وہ خود کیوں روم چلا آیا تھا۔ روم میں بیٹھ کر رومن قارئین کے لیے لکھنا، جن میں سے بادشاہ سمیت کئی لوگ ان مذکورہ واقعات چشم دید گواہ تھے...... ایسی صورت حال میں جوزیفس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بنیادی حالات اور تاریخی واقعات میں کسی مبالغے یا غلط بیانی سے کام لیا ہوگا۔ واقعات کو توڑنے مروڑنے کی جن مثالوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق جوزیفس کی اس خواہش سے ہے کہ اسے بغاوت کا مورد الزام نہ ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے تحریری تذکرے اور بیان کی صداقت پر شک کیے بغیر ان کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

جوزیفس نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گوریلا تحریک اور یہودیوں کے عسکری نجات دہندوں سے متعلق شعور و آگہی میں اتار چڑھاؤ کی لہریں ایک ہی وقت میں (بیک وقت) موجود رہیں۔ گرد آلود اور سورج سے تپتی زمینوں پر مقدس ہستیاں گھومتی پھرتی تھیں جو عجیب وغریب مبہم اور الہامی لہجوں میں مثالوں اور نظیروں سے مرصع تمثیلی انداز میں باتیں کرتی تھیں اور پوری دنیا پر حکمرانی کے لیے آنے والی جنگ کی پیش گوئیاں کرتی تھیں۔ کامیاب گوریلا لیڈروں نے ایسی افواہیں پھیلا دیں جو مستقل طور پر مائل بہ تجدید مسیحائی تصورات اور خیالات کی روشنی اور سایوں میں خوب پھیلنے لگیں۔ کرشماتی لیڈروں کا ایک سیل رواں بہہ نکلا جس نے آگے بڑھ کر اپنی مسیحائی کا دعویٰ کیا اور تاریخ میں اپنا مقام بنایا۔ حکومت کے خلاف ان میں سے کم از کم مزاحمت اور شورش پر مبنی دو واقعات نتیجہ خیز ثابت ہوئے جنہوں نے رومن حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔

ہیروڈاعظم نے پہلے اپنے رومن سرپرستوں کی توجہ حاصل کی، وہ اس طرح کہ

اس نے ''ہیز یکتا'' نامی چوروں کے سردار کے خلاف سخت مہم شروع کی جو شمالی گلیلی کے پورے علاقے کو کنٹرول کرتا تھا۔ جوزیفس کے مطابق ہیروڈ نے گھات لگا کر اس چور سردار کو گرفتار کر لیا اور موقع پر ہی اسے پھانسی دے دی۔ کیونکہ یروشلم میں اس کے خیر خواہ اور ہمدرد رہتے تھے جو اتنے زیادہ مضبوط اور بااثر تھے کہ انھوں نے ہیروڈ کو مقدمہ قتل کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ پولیس سیزر کے ایک چچا زاد بھائی نے مداخلت کی ہیروڈ کو رہائی دلائی اور اس کا سفارشی بن گیا جس کے نتیجے میں ہیروڈ جلد ہی ۹۲ء قبل مسیح میں یہودیوں کا کٹھ پتلی بادشاہ مقرر ہوا۔

ہیروڈ کو فلسطین پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے کئی اور رہزن چوروں سے بھی لڑنا پڑا۔ جوزیفس لکھتا ہے کہ چوروں کے گروہ ملک کے بیشتر حصوں پر چھا گئے اور انہوں نے لوگوں کے لیے اتنی مصیبتیں اور مشکلات پیدا کیں جتنی ایک جنگ میں پیش آ سکتی تھیں۔ چنانچہ ہیروڈ نے اس ی علاقے کا محاصرہ کر لیا جہاں چور غاروں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب وہ غاروں کے اندر محصور ہو گئے تو معلوم ہوا کہ وہ چور اپنے بال بچوں کو بھی اپنے ساتھ غاروں میں رکھے ہوئے تھے اور انہوں نے ہتھیار ڈالنے اور اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک بوڑھا چور ایک غارت کے دہانے پر، جہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی تھی نمودار ہوا اور ہیروڈ کی نظروں کے عین سامنے اپنے ساتوں بچوں اور بیوی کو مار ڈالا اور خود اپنی موت کے لیے کودنے سے پہلے ''یہاں تک گیا کہ اظہار نفرت کے لیے ہیروڈ کو حقارت سے اور تحقیر آمیز انداز میں گھورا۔'' اب ہیروڈ خود کو غاروں اور غاروں میں رہنے والوں کا حاکم سمجھ کر ''سماریہ'' روانہ ہو گیا۔ لیکن اس کی روانگی سے ''مصیبتوں میں مبتلا کرنے کے عادی لوگوں'' کو گلیلی میں بلا روک ٹوک اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ جنہوں نے بلا تاخیر ''پٹولمی'' نام کے ایک رومن جرنیل کو مار ڈالا اور بڑے منظم طریقے سے ملک میں لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کیا اور اپنے پوشیدہ ٹھکانے دلدلوں اور دوسری ناقابل رسائی جگہوں پر بنائے۔

سن ۴ء میں ہیروڈ کی موت پر شورش دور دراز سرحدی علاقوں تک پھیل گئی۔ ہیز یکیا کے بیٹے گلیلو نے جوڑ اس کے ایک شاہی اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔ عین اسی موقع پر جورڈن (اردون) کے اس پار ''پرائیا'' میں سائمن نام کے ایک غلام نے ''جیریکو'' کا محل اور

ملک کی کئی خوبصورت رہائش گاہیں جلا ڈالیں اور ایک تیسرے باغی ''اتھرونگس'' نے جو ایک گڈریا تھا، ''اپنے بادشاہ ہونے'' کا اعلان کر دیا۔ یہ انداز بیان شاید جوزیفس کا مخصوص اسلوب تھا جس کے ذریعے اپنے پیروکاروں کی نظروں میں اپنے ''مسیحا'' ہونے کا اظہار مقصود تھا۔ رومیوں کے ہاتھوں اتھرونگس اور اس کے چار بھائیوں کے یکے بعد دیگرے قتل ہونے سے پہلے ''چوروں اچکوں'' کا یہ گروہ، ملک بھر کے سب لوگوں کو اپنی رہزنی، قزاقی اور چوریوں سے عاجز اور پریشان کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ''وریس'' نے جو شام میں رومن گورنر تھا، امن و امان کی صورت حال بحال کی۔ اس نے ۲۰۰۰ سرغنہ لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور سب کو پھانسی دے دی۔ یہ واقعہ یسوع مسیح کی پیدائش والے سال ہوا۔

گلیلی کا جوڈاس جلد ہی بڑی گوریلا قوتوں کے لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا۔ جوزیفس کہتا ہے کہ وہ ''بادشاہت کا متمنی'' تھا۔ اور وہ اسے اکثر ''بہت چالاک'' یہودی سردار'' لکھتا ہے۔ ۶ء میں رومیوں نے مردم شماری کرانا چاہی۔ جوڈاس نے اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کیا کہ وہ مردم شماری کی مخالفت کریں اور نہ ہونے دیں۔ کیونکہ مردم شماری کا انجام ''مکمل غلامی سے کم تر'' نہیں ہوگا۔ جوزیفس اس کے یہ الفاظ دہراتا ہے کہ ''یہودیوں کا یہودا کے سوا اور کوئی بادشاہ نہیں اس لیے رومیوں کو کوئی ٹیکس ادا نہ کیے جائیں اور یہودا، ان کی ضرور مدد کرے گا اگر ان کو اپنے مقصد پر اعتماد ہے۔'' جوزیفس بتایا ہے کہ رومیوں کی اطاعت پر مائل لوگوں سے دشمنوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ان کے مویشی اور جانور پکڑ لیے جاتے اور گھر جلا دیئے جاتے تھے۔

اس بارے میں کوئی اطلاعات دستیاب نہیں کہ ''گلیلی'' کا جوڈاس کیسے اور کب اپنے انجام کو پہنچا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس کے بیٹوں نے لڑائی جاری رکھی۔ دو کو پھانسی دی گئی جبکہ ایک اور نے ۷۳۔۶۸ء کے دوران میں برپا ہونے والے انقلاب میں اپنے ''مسیحا'' (نجات دہندہ) ہونے کا اعلان کردیا۔ اس جنگ میں مزاحمت کی آخری کوشش بھی جو مسادا کے قلعے کو بچانے کے لیے کی گئیں (اور یہ کوششیں خودکشی کے مترادف طریقوں سے کم نہیں تھیں۔) ان کی قیادت بھی ''گلیلی کے جوڈاس ہی کی اولاد کے ایک فرد نے کی۔

یسوع مسیح نے نجات کی راہ سے متعلق اپنی تعلیمات کی تبلیغ و تلقین ۲۸ء کے لگ

بھگ مؤثر انداز سے شروع کی۔ اس وقت ایک دوسرے کا نشانہ باندھ کر مارنے کی جنگ نہ صرف ''گلیلی'' بلکہ ''جوڈیا'' اور ''یروشلم'' میں بھی جاری تھی۔ یسوع مسیح کا مذہب اور عبادت کا مسلک، نہ تو اتنا بکثرت مروّج تھا اور نہ اس باغیانہ ماحول اور فضا میں زیادہ خطرناک تھا جس ماحول اور صورت حال کا رومن گورنر ''پونٹس پائیلیٹ'' کو سامنا تھا اور اس نے یسوع مسیح کی موت کا حکم صادر کیا تھا۔ مثال کے طور پر جوزیفس نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب پائیلیٹ کی کندہ کی گئی منقش ''مورتیوں'' کو یہودیوں نے یروشلم میں ممنوع قرار دیا اور پائیلیٹ نے اس ممانعت کے خلاف حکم جاری کیا تو غیض وغضب سے بپھرے ہوئے شہریوں کا ایک ہجوم سامنے آیا جس میں ملک کی دوسری جگہوں سے آئے ہوئے لوگوں کی بھاری تعداد شامل تھی۔ اس کے بعد ایک اور غضبناک ہجوم نے پائیلیٹ کو گھیرے میں لے لیا جو گرجے کے لیے جمع چندے کو پانی کے مصنوعی تالاب کی تعمیر کے ناجائز اور بے جا خرچ کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ مقدس کتابوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یسوع مسیح نے عبادت گاہ پر ایک حملے کی قیادت خود کی تھی اور یسوع مسیح کے خلاف مقدمے سے ذرا پہلے کوئی شورش ہوئی تھی کیونکہ راہزنوں کے مقبول رہنما ''بارعباس'' اور اس کے کئی دوسرے ساتھی اس وقت جیل میں تھے۔

یسوع مسیح کی وفات کے بعد رومنوں نے ''جوڈیا'' کے مضافات کو رہزنوں سے پاک کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ جوزیفس بتاتا ہے کہ ۴۴ء میں ان کا ایک اور بڑا سرغنہ ''تھیوڈاس'' ریگزار میں نمودار ہوا۔ اس کے پیروکار اپنے گھروں اور جائدادوں کو چھوڑ کر دریائے جورڈن کے کناروں پر جمع ہو گئے۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ تھیوڈاس دریا کو اپنے علاقے میں شامل کرنا چاہتا تھا جبکہ کئی دوسروں کا خیال ہے کہ یہ ''مسیحا'' دوسری جانب مغرب کو یروشلم کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے ارادوں سے قطع نظر رومن گورنر ''یوپیس فیڈس'' نے فوجی دستے بھجوائے۔ انہوں ''تھیوڈاس'' اور اس کے پیروکاروں کو قتل کر دیا۔

سن ۵۰ء میں یہودیوں کی مصریوں سے آزادی کی یاد منانے والی تقریب میں دعوت کے دوران میں ایک رومن سپاہی نے اپنا پیٹی والا کوٹ اتار کر گرجے کے زائرن اور پجاریوں کے ہجوم پر پھینک دیا اور اپنی بیہودہ حرکتوں سے سراسیمگی پھیلا دی۔ جوزیفس لکھتا ہے کہ نوجوانوں کی بے قابو ٹولیوں اور قدرتی طور پر بپھرے ہوئے لوگوں کے تندوتیز ریلے،

اس فتنہ انگیز ہنگامے میں شامل ہو گئے۔ رومیوں نے فوج کی بڑی مسلح نفری طلب کر لی۔ اس سے ایک ہیبت ناک خوف و ہراس اور ہول سا طاری ہو گیا جس میں جوزیفس کے مطابق ۳۰۰۰۰ لوگ مارے گئے۔ (بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ۳۰۰۰ کہنا چاہتا تھا) یسوع مسیح کا گرجے پر حملہ ایک ہی وقت میں اس موقع پر ہوا جب ۳۳ء میں یہودیوں کی مصریوں سے آزادی کی یاد منانے کے لیے زائرین کی آمد ہو رہی تھی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس وقت زائرین کے ہجوم کا ردعمل، ۵۰ء میں لوگوں کی ہلاکتوں پر طاری ہونے کی طرح کا تھا۔ اس وجہ سے اور اس پس منظر کو سامنے رکھ کر مقامی یہودی اور رومن حاکموں نے فیصلہ کیا کہ یسوع مسیح کو گرفتار کرنے کے لیے رات ہو جانے کا انتظار کیا جائے۔

۵۲ء میں ''علیزر بن ڈینانس'' کی زیر قیادت کھلی عوامی بغاوت کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ علیزر ایک انقلابی قزاق تھا جو تقریباً بیس برسوں تک پہاڑوں میں روپوش رہا۔ گورنر ''کیومانس'' نے اس کے مریدوں کو پکڑ لیا اور پکڑے جانے والوں سے بھی زیادہ تعداد کو ہلاک کر دیا۔ لیکن بدامنی اور شورش پھیلتی چلی گئی اور ''پورے ملک میں لوٹ مار کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اور دلیر جذبے بغاوت کے لیے پیدا ہو گئے۔'' شامی سفیر نے مداخلت کی۔ اٹھارہ دہقانوں کو قتل کیا گیا اور ان تمام قیدیوں کو بھی پھانسی دے دی گئی جنہیں کیومانس نے پکڑ رکھا تھا۔ آخر کار بغاوت کو نئے گورنر ''فیلیکس'' نے آکر کچل دیا اس نے علیزر پر بھی قابو پا لیا اور اسے روم بھجوا دیا۔ غالباً اس لیے کہ اسے سرعام پھانسی دی جائے۔ جوزیفس کہتا کہ ''جن راہزن ڈاکوؤں کو اس نے پھانسی دی تھی اور ان کے مددگار جن مقامی لوگوں کو حراست میں لے کر سزائیں دی تھیں گنتی کے لحاظ سے وہ کثیر تعداد میں تھے۔''

یروشلم میں خنجر بردار لوگ جو اپنے ہتھیار اپنے کپڑوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ اب وہ بہت عام ہو گئے تھے۔ ان کے ستم کا نشانہ بننے والوں میں بڑا پادری ''جوناتھن'' بھی شامل تھا۔ ان سب ہنگاموں کے دوران میں ''سپہ گر نجات دہندوں کے روپ میں مسیحائی کے مدعی پھر بار بار ظاہر ہونے لگے۔ ان مسیحائی لیڈروں کے ایک گروہ سے متعلق جوزیفس یوں ذکر کرتا ہے: یہ لچے، لفنگے، اوباش، کمینے عملی طور پر مجرم لیکن نیت کے زیادہ برے تھے۔ وہ بھی اتنے ہی شدید نقصان کا سبب بنے جتنے قاتل دغاباز، فریبی اور ٹھگ تھے۔ کشف اور الہام کے ان دعویداروں نے کئی انقلابی تبدیلیوں کے ضامن منصوبے اور سکیمیں بنائیں۔

ان کا طریقہ واردات یوں تھا کہ وہ لوگوں کے ہجوم کو یہ جھانسہ دے کر اکساتے کہ ان کے وجدان کے مطابق خدا انہیں جلد حاصل ہونے والی کامیابی کی علامات دکھائے گا۔ یوں یہ ڈھونگ رچا کر، لوگوں کو بہلا پھسلا کر اور گھروں سے باہر نکال کر احتجاجی جلوسوں کی قیادت کرتے۔

فیلیکس نے اس یورش اور لوٹ مار کو بغاوت کے پہلے مرحلے سے تعبیر کیا اور رومن فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ ان ہجوموں کو مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں۔

اس کے بعد مصر کا ایک یہودی ''جھوٹا پیغمبر'' بن کر آیا۔ اس نے کئی ہزار سادہ لوح لوگوں سے دغابازی کے ذریعے دھوکہ کیا۔ انہیں ریگستانوں کے ویرانوں میں لے گیا اور پھر واپس آکر یروشلم پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی اور اگر رومن کسی ثبوت کے خواہش مند تھے تو انہیں وہ ثبوت فراہم کر دیا کہ اسی قسم کے سب لوگ سیاسی لحاظ سے خطرے کا باعث تھے۔ جوزیفس ۵۵ء میں فلسطین کی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

> مذہبی دغا بازوں اور اچکے ڈاکوؤں کے سرداروں نے باہم شراکت سے بڑی قوت حاصل کر لی۔ لوگوں کی کثیر تعداد کو شورش پر آمادہ کیا۔ گروہوں کی شکل میں بٹ کر وہ ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ انہوں نے متمول گھرانوں کی لوٹ مار، ان کی قتل و غارت، دیہاتوں کی آتش زنی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک ان کی غضبناک دیوانگی اور پاگل پن کا اثر ''جوڈیا'' کے کونے کونے تک نہ پہنچ گیا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ لڑائی کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

۶۶ء تک قزاقوں، ڈاکوؤں کا ہر جگہ غلبہ تھا۔ انہوں نے گرجا گھروں اور عبادت گاہوں میں پادریانہ حیثیت پر بھی دسترس حاصل کر لی اور بڑے پادری ''انانس کے بیٹے علیزر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ایک قسم کا اعلان آزادی جاری کیا۔ یہ ایک ایسا حکم تھا جس کے ذریعے روم کے بادشاہ نیرو کی صحت و سلامتی کی خاطر دی جانے والی جانوروں کی روزانہ قربانی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ رومیوں کے حامی اور مخالف دھڑوں کے درمیان لڑائی، یروشلم کے گلی کوچوں میں شروع ہوگئی۔ ایک طرف علیزر کی زیر قیادت خنجر بردار لوگ آزاد کرائے

گئے غلام اور یروشلم کے اجڈ عوام کا جم غفیر تھا جبکہ دوسری طرف بڑے بڑے پادری، ہیروڈ کا حامی طبقہ امراء اور روم کی شاہی محافظ فوج تھی۔

اس دوران میں عقبی علاقوں میں مناھم نے جوگلیلی کے ''فوڈاس'' کا آخری بیٹا تھا اور ابھی زندہ تھا مسادا کے قلعے پر چڑھائی کر دی۔ اپنے راہزن ساتھیوں کو رومن ہتھیاروں سے مسلح کیا جو اسلحہ خانے سے ملے تھے اور یروشلم پر حملہ آور ہوا۔ انتشار اور بدامنی کی مار دھاڑ میں مناھم نے جوزیفس کے مطابق بغاوت اور شورش کی کمان خود سنبھال لی۔ اس نے رومن فوجی دستوں کو مار بھگایا۔ گرجا کے علاقے کا کنٹرول حاصل کیا۔ اس کے بڑے پادری اتانیس کو قتل کیا۔ اس کے بعد مناھم نے شاہی خلعت زیب تن کی اور اپنے بہت سے مسلح قزاق ساتھیوں کی معیت میں گرجے کی عبادت والی مقدس جگہ میں داخل ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن علیزر اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے غالباً دشمن کی تاک میں گھات لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ چنانچہ مناھم وہاں سے بھاگ نکلا لیکن پکڑا گیا اور کافی طویل عرصہ ایذا رسانی کے بعد مار دیا گیا۔

یہودیوں نے اس اعتماد کے تحت لڑائی جاری رکھی کہ ''حقیقی مسیحا'' نے ابھی آنا تھا۔ رومیوں کی بہت سی پسپائیوں کے بعد نیرو نے اپنے آزمودہ کار کہنہ مشق جرنیل ویسپاسین سے، جس نے برطانیہ کے خلاف مہموں میں حصہ لیا تھا مشورہ کیا۔ ۶۵۰۰۰ افراد پر مشتمل فوج، جدید ترین ہتھیاروں اور فوجی ساز و سامان اور محاصرے کے آلات سمیت رومنوں نے آہستہ آہستہ چھوٹے قصبوں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا۔

۶۸ء میں نیرو کی موت کے بعد شہنشاہی کے امیدوار کے طور پر ویسپاسین سامنے آیا۔ اسے سب لوگوں نے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اس سامان حرب کی فراہمی کا بھی جس کی اسے ضرورت پڑے۔ یوں ویسپاسین کے بیٹے ٹیٹس نے جنگ ختم کر دی۔ ۷۰ء میں دیوانہ وار مزاحمت اور مقابلے کے باوجود ٹیٹس یروشلم میں داخل ہو گیا اور جو کچھ سامنے نظر آیا اسے لوٹ لیا یا آگ لگا دی، عبادت گاہ کو بھی نذر آتش کیا۔

یروشلم کے محاصرے میں نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے کہ اس میں کئی لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں، جوزیفس بڑی تلخی سے ''مسیحاؤں'' کی پیش گوئیوں کی مذمت کرتا ہے۔ خوفناک قسم کی بدشگونیاں دیکھنے میں آئیں۔ مثلاً گرجا گھر کی قربان گاہوں پر تیز روشنیاں،

ایک گائے جس نے ایک میمنے کو جنم دیا۔ غروب آفتاب کے وقت رتھوں، بگھیوں اور مسلح فوجی دستوں کا آسمان کے اوپر سے تیزی کے ساتھ گزرنا وغیرہ۔ لیکن نو سر باز، لوٹ مار کرنے والے اچکوں اور ان کے قابل نفرت پیشواؤں نے اپنی تباہی کی ان نشانیوں کو نہیں سمجھا۔ یہ دھوکہ باز اور جھوٹے پیامبر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے اور انہیں یقین دلاتے رہے کہ فطرت سے ماورا، (آفاقی) نجات ان ہی کی ہوگی۔

یروشلم کے سقوط کے بعد بھی رہزنی اور لوٹ مار کرنے والوں کو یقین نہ آیا کہ ''یہودا'' نے ان سے روگردانی کر لی تھی۔ وہ پر اعتماد تھے کہ ایک اور سرفروشانہ کوشش، انسانی جانوں کی ایک اور قربانی کے بعد ''یہودا'' بالآخر ایک ''سچی مجاز ہستی'' کو بھیجنے کا فیصلہ کرے گا۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ آخری قربانی کا وقوعہ ۷۳ء میں قلعہ مسادا پر پیش آیا۔ لوٹ مار کرنے والے ایک راہزن علیزر نے جو ''ہیرنیکیا'' اور گلیلی کے جوڈاس کی آل اولاد میں سے تھا اپنے بچے کھچے مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل جمعیت کو جو تعداد مین ۹۶۰ تھے، نیکی کی تلقین کرتے ہوئے یہ ترغیب دی کہ وہ رومنوں کے سامنے سرنگوں ہونے اور ان کی اطاعت قبول کرنے کی بجائے خود ایک دوسرے کو مار ڈالیں۔

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ۴۰ اور ۷۳ء کے درمیانی عرصے میں جوزیفس نے کم از کم پانچ یہودی عسکری مسیحاؤں کا ذکر کیا ہے جن میں یسوع مسیح کو عیسائی بنانے والے مبلغ جان شامل ہیں۔ یہ پانچ ''نجات دہندے'' (مسیحا) اتھرانکس، تھیوڈاس بے نام بدمعاش جسے فیلیکس نے پھانسی دی، جھوٹا مصری یہودی پیغمبروں'' کا بھی متواتر حوالہ دیتا ہے جن کا نام بتانے یا ان کا تذکرہ کرنے کا تردد نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں مجھے اس کا بھی قوی امکان محسوس ہوتا ہے کہ ''جوشیلے اور سرگرم رہزن گوریلوں'' کی پوری نسل کو جس کا سلسلہ نسب ''ہزیکیا'' سے شروع ہو کر گلیلی کے جوڈاس مناھم اور علیزر کی اولادوں تک پہنچتا ہے۔ اپنے کئی مقلدین کے اعتقاد کے مطابق ''مسیحا'' یا ''مسیحا کا پیامبر'' مانا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ''یسوع مسیح'' کے دور میں فلسطین کے اندر اتنے'' ''مسیحا'' موجود تھے جتنے آج کل جنوبی سمندروں میں ''کارگو'' کی پیش گوئی کرنے والے ہیں۔

مسادا کے سقوط سے ''عسکری مسیحائی'' ذرائع نجات کی یہودی طرز معاشرت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ غیر ملکی نو آبادیاتی سے پیدا ہونے والے روز افزوں توجہ طلب مسائل اور

غربت نے انقلابی کو مسادا کے وقوعہ سے ۶۰ سال بعد ایک بار پھر بھڑکا دیا، جو مسیحائی کے مسلک اور اعتقاد پر مبنی ایک نئے سوانگ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ ۱۳۲ء میں بارکو چوا ...... ''ستارے کا بیٹا'' نے ۲۰۰۰۰ لوگوں کی ایک تنظیم بنائی۔ اس منظّم جمعیت کے سہارے ایک آزاد یہودی ریاست قائم کی جو ۳ تین برسوں تک قائم رہی۔ بارکو چوا کی کرشماتی فتوحات سے متاثر ہو کر یروشلم کے ایک یہودی بڑے سردار نے ایک ''مسیحا'' کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لوگوں نے بارکو چوا کو ایک شیر پر سواری کرتے ہوئے دیکھنے کی خبریں دی۔ وہ رومیوں کے لیے ایک زبردست اور دلیر فوجی حریف ثابت ہوا۔ وہ جنگ کے دوران میں اگلی صفوں کا ایک پورا بڑا فوجی لشکر جنگ میں کام آیا۔ رومنوں نے ۱۰۰۰ دیہات کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ ۵۰۰۰۰ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہزاروں لوگوں کو غلام بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا۔ یہودیوں کے غمگین عالم فاضل لوگوں کی آنے والی نسلوں نے پشیمانی اور غم سے مغلوب انداز میں بارکو چوا کو ''جھوٹ کا بیٹا'' کہنا شروع کر دیا جس نے انہیں حکم دے کر اپنے وطن کی دھرتی چھن جانے کی ذلت سے دوچار کیا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہودیوں کی عسکریت پسند طرز معاشرت حالات کی مناسبت سے ناکام رہی۔ اس کی بدولت داؤد کی بادشاہت بحال کرنے میں کامیابی نہ ہوئی بلکہ اس کے برعکس یہ اسرائیلی ریاست کی سرحدی سالمیت سے مکمل طور پر محرومی کا باعث بنی۔ اگلے ۱۸۰۰ سالوں کے دوران میں یہودی، خواہ وہ جہاں کہیں بھی رہے، ان کی حیثیت محض ایک زیرنگین اقلیت کی تھی۔ اب کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عسکری انداز پر مختصر طرز معاشرت محض متلون مزاجی، ناقابل عمل ہونے بلکہ پاگل پن کی مظہر تھی؟ کیا ہم بھی جوزیفس اور دوسرے لوگوں کی طرح جنھوں نے بعد میں بارکو چوا کی مذمت کی، یہی نتیجہ اخذ کریں کہ اسرائیلوں سے اپنا وطن چھن جانے کی وجہ اس ''مسیحائی'' کی ذہنی اپج سے دھوکہ کھانا تھا جس سے مسحور ہو کر انہوں نے روم کی ناقابل شکست قوت سے ٹکر لی اور حملہ آور ہو کر ذلیل و خوار ہوتے رہے؟ میرے خیال میں نہیں، جواب نفی میں ہے۔

اسرائیلوں کی روم کے خلاف انقلابی جدوجہد کی محرک رومنوں کے نو آبادیاتی نظام سے پیدا ہونے والی عدم مساوات تھی۔ یہودیوں کی عسکریت پسندی سے منسلک ان کا مسیحائی تصور نجات نہیں تھا۔ ہم رومیوں کو صرف اس وجہ سے زیادہ عملیت پسند اور حقیقت

شناس نہیں سمجھ سکتے کہ وہ فاتح ٹھہرے۔ دونوں فریق عملی اور عام دنیاوی وجوہات کی بنا پر جنگ میں کودے۔ فرض کریں جارج واشنگٹن، امریکہ کی انقلابی جنگ آزادی ہار گیا ہوتا تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ براعظم کی فوج اپنے غیر منطقی طرز معاشرت کا شعور رکھنے کے باعث جس سحر میں مبتلا تھی، اس ہی کا شکار ہو کر شکست سے دوچار ہوئی تھی؟

قدرت کی طرح تہذیب وتمدن کے میدان میں بھی ایسے نظام جو مخصوص قوتوں کے ذہن سے تشکیل پذیر ہوئے ہوں، اکثر دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ ناقص یا غیر منطقی ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کا مقابلہ ایسے نظاموں سے ہوتا ہے جو حسب حال ہونے کے لحاظ سے بہتر اور زیادہ توانا ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے واضح کر دیا ہے کہ ''انتقامی مسیحائی'' پر مبنی اعتقاد ''کارگو'' کی طرح درپیش ہنگامی حالات سے مطابقت رکھتا تھا۔ ایک باقاعدہ فوج رکھنے اور اسے تربیت دینے کے ذرائع کی عدم موجودگی میں یہ طریقہ عوامی مزاحمت کو متحرک کرنے کا انتہائی کامیاب ذریعہ تھا۔ میں پر جوش راہزنوں کو دھوکہ دہی کے لیے موردالزم نہیں ٹھہراؤں گا کہ وہ ذلت اور خواری کا سبب بنے جب تک یہ ثابت نہ ہو سکے کہ ابتدا ہی میں ان کی ناکامی کے امکانات اتنے واضح تھے کہ کوئی بھی کوشش انہیں اس انجام سے نہیں بچا سکتی تھی جو تاریخ سے ہمیں معلوم ہوا۔ لیکن یہ ثابت کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا جس سے ''جوشیلے قزاق'' اپنی شکست کے ناگزیر ہونے کی پیش گوئی کر سکتے۔ تاریخ ہمیں قطعیت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ گلیلی کا جوڑ اس روم کی سلطنت کے ناقابل شکست ہونے کے مبینہ مفروضے سے متعلق صحیح تھا اور روم کے حکمران ''سیزر'' غلط تھے (کیونکہ) رومن حکومت بالآخر نہ صرف تباہ ہوئی بلکہ اس کو تباہ کرنے والے بھی یہودیوں کی طرح غیر ملکی طاقتوں کے محکوم تھے، جو اپنی تعداد، سازوسامان اور عسکری مہارت میں رومنوں سے بہت کم تر حیثیت رکھتے تھے۔

انقلاب نام ہی ایسی کوششوں کا ہے جو استحصال کا شکار آبادی کا مظلوم حصہ اپنے اوپر سختی اور ظلم کرنے والوں کو مغلوب کرنے کی راہ میں حائل مشکلات پر اپنے بے خوف اور دلیرانہ اقدامات کے ذریعے قابو پائیں۔ طبقے، نسلیں اور قومیں بالعموم ایسے مشکل حالات کا چیلنج قبول کرتی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ انہیں غیر منطقی نظریہ سازوں نے بیوقوف بنایا یا بہکایا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس کے متبادل فیصلے انتہائی ناموافق اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ ان

کے مقابلے میں بڑے سے بڑے خطرات کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی باعث یہودی رومنوں کے خلاف اتھ کھڑے ہوئے اور اسی وجہ سے یہودیوں کے عسکریت پر مبنی ذرائع کی بدولت، نجات کا شعور یسوع مسیح کے دور میں زیادہ پروان چڑھا۔

جہاں تک رومن تسلط کے خلاف عملی تحریک کی تہہ میں، ''انتقام پر مبنی مسیحائی'' مسلک کا جذبہ کارفرما ہونے کا تعلق ہے، اس ضمن میں ''پرامن مسیحائی مسلک'' نے ایک ایسی بعید العقل صورت اختیار کی ہوئی تھی جس کا بظاہر کوئی جواز تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ عیسائیت سے ہم آہنگ پرامن مسیحائی مسلک، روم کے خلاف ۱۸۰ سالہ طویل جنگی کشمکش اور تحریک کے دوران میں انتہائی غیر متوقع لمحات کا شعور ابھی بڑھ اور تحریک کے دوران میں انتہائی غیر متوقع لمحات میں نمودار ہوا۔ یسوع مسیح کا مسلک اس وقت مقبول ہوا جب عسکری ذریعہ نجات کا شعور ابھی بڑھ پھیل رہا تھا اور ''یہودا'' کی برکت اور فضل وعنایت کا وجدان اور بے خودی و وارفتگی عروج پر جا رہی تھی۔ اس کا ظہور موقع کی مناسبت سے ناموزوں اور نامناسب وقت میں ہوا۔ ۳۰ء میں جوشیلے راہزنوں کی انقلابی تحریک کو کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہیں تھا۔ کلیسا محفوظ و مامون تھا اور سالانہ زائرین کی آمد سے رونقوں کا مظہر ''گلیلی کے جوڑا'' کے بیٹے ابھی زندہ تھے۔ قلعہ مسادا کی دہشت کا ابھی کوئی تصور نہ تھا۔ ایسے میں یہودیوں کو کسی ''پرامن مسیحا'' کی خواہش کیوں ہوتی؟ جبکہ ابھی عسکریت پسند مسیحائی نے ''مناجم'' اور بارکوچوا کو ''مجاز ہستی'' بنانے کا خواب و خیال بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت فلسطین سے رومن حاکموں کے حق میں دستبرداری کیوں اور کس لیے جب رومیوں کی قوت کو ''یہودا'' کی مقدس محافظت میں کوئی رخنہ ڈالنے کا یارانہ تھا۔ نیا عہد و پیماں اور قول قرار کیوں جبکہ پہلا عہد نامہ رومن سلطنت کو دوبارہ ہلا کر رکھ دینے پر قادر تھا؟

☆☆☆

MashalBooks.org

امن کے شہزادے کا راز

مغربی تہذیب و تمدن کے تصورات بنیادی طور پر دوسری قوموں سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کی پراسرار تفصیلات میں گہرائی تک جانے کے لیے معروضی سوالات کا علم ہونا ضروری ہے۔

زیر غور معاملے میں ہمارے پاس حسب خواہش حقیقی انتخاب کے مواقع ناپید ہیں۔ اس کی سب سے سہل اور آسان ترین راہ مل جاتی ہے اگر یسوع مسیح کے عہد رسالت کو واقعہ کے لحاظ سے ناموزوں وقت پر ہونا مان لیا جائے۔ یعنی اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ یسوع مسیح نے اپنے یہودی ساتھیوں کو سقوط یروشلم تک رومنو سے محبت کی تلقین شروع نہیں کی تھی۔ لیکن تاریخی واقعات کے تسلسل ...... مثلاً گلیلی کے جوڈاس کی ٹیکس کے خلاف شورش یا ''پونٹیس پائیلیٹ'' کی گورنری ...... میں چالیس سال کا مغالطہ بعید از قیاس ہے۔

گوکہ ہم اس بارے میں غلطی پر نہیں ہو سکتے کہ یسوع مسیح نے کب خطاب کیا لیکن اس مفروضے کے حق میں کئی دلائل موجود ہیں کہ انہوں نے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا اس سے متعلق ہم غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ پچھلے باب کے آخر میں کئے گئے اس سوال کا ایک سیدھا سا حل یہ ہے کہ یسوع مسیح اتنے پرامن (امن کے حامی) نہیں تھے جتنا عام طور پر انہیں مانا جاتا ہے اور ان کی اصل تعلیمات میں یہودیوں کے روایتی عسکریت پسند مسیحائی (ذریعہ نجات) سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا۔ جو شیلے قزاقوں کی حمایت اور رومن مخالف تعصب ان کی اصل تعلیمات میں سرایت کر گیا۔ یہودیوں کی عسکریت پسند مسیحائی روایات سے فیصلہ کن قطع تعلقی غالباً یروشلم چھن جانے کے بعد، اس وقت عمل میں آئی جب یسوع مسیح کی اصلی تعلیمات میں سے سیاسی اور عسکری لازمی اجزا عیسائی ہو جانے والے ان

یہودیوں نے نکال دیئے جو روم اور سلطنت روم کے دوسرے شہروں میں رہ رہے تھے اور رومنوں کے حق میں خیر خواہانہ تاثر دینا چاہتے تھے۔مختصراً میں اپنی اس دلیل کا اطلاق، پرامن مسیحائی، (تحریک نجات) کے استعارے کا انسان کے عملی معاملات سے تعلق ظاہر کرنے پر کروں گا۔

یسوع مسیح کی اصل تعلیمات اور عسکری مسیحائی روایات کے تسلسل کا ثبوت یسوع مسیح کو عیسائی بنانے والے پادری جان کے مابین موجود قریبی رابطے سے فراہم ہوتا ہے۔ جانوروں کی کھال میں ملبوس اور مکڑی اور جنگلی شہد کے سوا کچھ نہ کھانے والے پادری جان کا رہن سہن، ان مقدس لوگون کی طرز زندگی کی علامات اور نشانیوں سے مشابہہ تھا جن کا ذکر جوزیفس نے وادیٔ جورڈن کے عقبی علاقوں میں گھومنے پھرنے والے اور وہاں کے دہقانوں اور غلاموں کو رومنوں اور اپنے یہودی مالکوں کے خلاف اکسانے کے ضمن میں کیا ہے۔

بائبل کی چاروں جلدوں میں اس پر اتفاق پایا گیا ہے کہ جان یسوع مسیح سے ذرا پہلے ان کا پیش رونقیب تھا۔ اس کا مشن، اساعیہ، کے فرائض سرانجام دینا تھا۔ بیابان اور اجاڑ جگہوں پر جانا، جو ملک کے عقبی حصوں میں غاروں پر مشتمل رہزن ڈاکوؤں کی آماجگاہیں تھیں اور ''یہودا'' کے معاہدے کی یادوں سے گونج رہی تھیں اور وہاں پر بہ آواز بلند یہ اعلان کرنا کہ اے مالک اس کو سیدھے راستے پر چلا (اپنے گناہوں پر افسوس کرو اپنے جرم کو تسلیم کرو تا کہ تمہیں کم از کم اس سلطنت کی شکل میں صلہ نصیب ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے) وہ یہودی جنہیں جن نے عیسائی بنایا تھا۔ انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور باقاعدہ طور پر اپنے گناہوں سے تائب ہوئے۔ انہیں دریا یا چشمے میں پاکیزگی کا غسل دیا گیا تا کہ علامتی طو پر ان کے گناہ دھل جائیں۔ انجیل کے مطابق یسوع مسیح، عیسائی بنانے کے لیے پستمہ دینے والے پادری جان کے سب سے زیادہ پسندیدہ، گناہوں سے کنارہ کش ہونے کے متاسف اور تائب تھے۔ جب انہیں دریائے جورڈن میں طہارت اور پاکیزگی کا غسل دیا گیا اس وقت وہ ادھیڑ عمری کی دہلیز پر قدم رکھنے والے تھے۔ یہی وہ عرصہ تھا جس کے دوران میں انہوں نے تبلیغی سرگرمیاں بھر پور انداز میں سرانجام دیں جو صلیب کے ذریعے ان کی موت کا سبب بنیں۔

پادری جان کی زندگی، ایسی عجیب وغریب خصوصیات کی حامل طرز زندگی کا نمونہ تھی جس کا تذکرہ پچھلے باب میں کیا گیا ہے۔ جب اس کے عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھنے لگا تو اسے امن و امان قائم رکھنے کے رومن قانون کے مطابق قریب ترین محافظ حاکم نے حراست میں لے لیا۔ یہ محافظ حاکم کٹھ پتلی بادشاہ ''ہیروڈ اینٹی پاس'' تھا جو فلسطین کے ایک حصے جورڈن کے مشرق میں حکمران تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پادری جان سب سے زیادہ سرگرم اور متحرک رہا تھا۔

بائبل میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ پادری جان کو اس کی ان سرگرمیوں کی پاداش میں گرفتار کیا گیا جو امن عامہ کے لیے خطرے کا باعث تھیں۔ ساری سیاسی اور فوجی صورت حال کا تذکرہ بالکل غائب ہے۔ اس کی بجائے ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ پادری جان کی گرفتاری ہیروڈ اور ہیروڈیائس کی شادی پر تنقید کرنے کے باعث عمل میں آئی تھی۔ ہیروڈیائس ہیروڈ کے ایک بھائی کی طلاق یافتہ بیوی تھی۔ کہانی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جان کو سزائے موت بھی کسی سیاسی مقصد کے تحت نہیں دی گئی بلکہ ہیروڈائس کی آتش انتقام سرد کرنے کے لیے تھی۔ ہیروڈائس اپنی بیٹی ''سومی'' کو بادشاہ ہیروڈ کے سامنے ناچنے کے لیے لے جاتی ہے۔ بادشاہ ناچنے والی کی اداکاری سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ سومی اعلان کرتی ہے کہ اسے پادری جان کا کٹا ہوا سر طشتری میں پیش کیا جائے اور ہیروڈ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ ہیروڈ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے کیے پر افسردہ اور پشیمان رہا جیسے بعد میں پانٹیس پائیلیٹ کے بارے میں کہا گیا کہ وہ یسوع مسیح کو پھانسی دینے پر متاسف اور نادم تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پادری جان اپنی گرفتاری سے پہلے اجاڑ ویرانوں میں لوگوں کے انبوہ کو کیا کہتا رہا، اس ضمن میں سیاسی حوالوں کی عدم موجودگی اور ہیروڈ سے منسوب کی گئی پشیمانی اور اور تاسف نہایت ناموزوں محسوس ہوتی ہے۔ جان جو وعظ اور پند و نصائح کرتا رہا وہ یوں تھیں: ایک مجھ سے زیادہ قوی اور مضبوط آئے گا۔ وہ تمہیں سپرٹ اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔ اس کا پھٹکنے اور چھانٹنے والا پنکھا اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ اپنے غلہ گاہنے والے فرش کو اچھی طرح صاف کرے گا اور گندم کو غلے کے گودام میں اکٹھی کرے گا لیکن بھوسے کو وہ نہ بجھنے والی آگ سے جلا دے گا۔

کیا ہیروڈ اینٹی پاس بیابانوں میں کی جانے والی الہامی پیش گوئیوں اور جوشیلے قزاقوں کے باہمی تعلق اور ربط سے بے خبر اور لاعلم تھا۔ ایک بادشاہ جس کا عرصہ حکمرانی 47سال تھا اور جو ہیروڈ اعظم کا بیٹا تھا، ان خطرات سے لاتعلق اور بے پروانہیں ہوسکتا تھا جو جان پادری جیسے لوگوں کو دیہاتیوں کے ہجوم اکٹھا کرنے میں مضمر تھے اور پھر ایک ایسا ناصح اور واعظ جس کی مسیحائی کا تعلق جو شیلے قزاقوں کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ ہو، کیسے اتنے بڑے ہجوموں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا تھا؟

عسکری مسیحائی روایات میں پادری جان کی پوزیشن کی وضاحت کے بارے میں ابہام خشکی میں گھرے ہوئے سمندر (آبنائے گلیلی) سے ملنے والے مسودات کی بدولت دور ہوگیا۔ یہ مسودات ایک غار سے ملے جو قبل از مسیح کے قدیم عہد میں کاران نامی قبیلے کے کھنڈرات کے قرب میں واقع ہے۔ یہ جگہ اسی خطے میں ہے جہاں جان پادری نے یسوع مسیح کو بپتسمہ دیا تھا۔ کامران قبیلہ مذہبی لوگوں کی برادری پر مشتمل تھا۔ جنہوں نے خود کو جان پادری کی طرح سنسان بیابان میں راستہ صاف کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس مشترکہ برادری خیروشر کی قوتوں کے درمیان ایک ایسی فیصلہ کن اور حتمی جنگ کی طرف مڑ رہا تھا، جس میں روم کی حکومت اپنی تباہی کے انجام کو پہنچے گی۔ روم کی جگہ ایک نئی سلطنت آئے گی جس کا دارالحکومت یروشلم ہوگا او راس کی حکمرانی ایک عسکری مسیحا جس کا تعلق داؤد کے خاندان کی ایک شاخ (نسل) سے ہوگا، کرے گا۔

وہ کسی بھی ''سیزر'' کی نسبت طاقتور ہوگا جسے روئے زمین پر پہلے کبھی دیکھا گیا ہو۔ اسرائیل کی کسی مجاز ہستی ناقابل تسخیر کمانڈر انچیف کی زیر قیادت یہودی ''فرزندان نور'' کی ''گھپ اندھیرے کے بیٹوں'' رومیوں کے خلاف یہ تباہی کی جنگ ہوگی۔ 28,000 یہودی جنگجو اور 6,000 رتھ بان اس جنگ میں رومنوں کے خلاف لڑی گے۔ وہ اس تعاقب میں اس لئے سرگرم ہوں گے تاکہ دشمن کو ابدی تباہی سے دوچار کردیں اور اس کی طرف دھکیل دیں ...... جب تک اس کا صفایا نہ ہوجائے فتح کی ضمانت دی گئی تھی کیونکہ تو نے ماضی میں ہم سے وعدہ کیا تھا کہ یعقوب سے ایک ستارہ آئے گا، عصائے شاہی (حکومت) اسرائیل سے ابھرے گی۔ (یہ پیش گوئی مقدس کتاب الاعداد میں کی گئی تھی اور اس کا اطلاق بعد میں بارکوچوا پر کیا گیا) اسرائیل کو فاتح بننا تھا کیونکہ جیسے تونے ماضی میں

اپنی مجاز ہستی کے ذریعے ہمیشہ شیطان گہنگاروں کو غلے کے ڈھیر میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے کی مانند کھا گیا۔ کیونکہ تو نے اعلان کر رکھا ہے کہ دشمن۔ایک تلوار کھائے گا جو انسان کی نہیں ہوگی اورایک تلوار اسے کھا جائے گی جو انسان کی نہیں ہوگی۔''

کامرانی قبیلے نے جنگ کے لیے اس کے حکم سے متعلق پوری تیاری کی تفصیلات طے کر رکھی تھیں۔ وہ اس حد تک تیار تھے کہ انہوں نے فتح کی خوشی منانے کے لیے گانا بھی تیار کیا ہوا تھا۔

اٹھ کھڑا ہوا سے بہادر نڈر دلیر!
اپنے گرفتار جنگی قیدیوں کو اپنی اطاعت میں اپنے پیچھے لے کر چل
اے عظیم انسان!
اپنی غارت گری کے جوہر دکھا اے جوان مرد!
اپنے ہاتھ سے اپنے دشمنوں کی گردن مروڑ دے!
اور قتل کیئے جانے والوں کی بارشوں کے انبار کو پاؤں تلے روند دے!
اپنی دشمن قوم پر وار کر!
اور اپنی تلوار کو ان کے گہنگار مجرم گوشت نگلنے دے!
اپنی دھرتی کو شان وشوکت سے مالا مال کر دے
اور اپنے چھوڑ جانے والے ترکے میں برکت ڈال!
تیری چراگاہوں میں مویشیوں کی افراط ہو!
تیرے محلات میں سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کے ڈھیر!
اے زبان (قدیم یروشلم اور اسرائیلی) خوشیوں میں جھومو!
اے یروشلم خوشیوں اور مسرت کے رانوں کے بیچ نظر آؤ!
اے جوڈا کے سب شہرو! خود کو ظاہر کرو
اپنے دروازے ہمیشہ کے لیے کھول دو!
قوموں کی دولت کے داخلے کے لیے!
اور ان کے بادشاہوں کو اپنی خدمت اور اطاعت پر مامور کر!
اور تو اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کو اپنے سامنے سرنگوں کر!

MashalBooks.org

اور انہیں اپنے جوتوں کی خاک چاٹنے دے!

ہم جانتے ہیں کہ کامرانی برادری نے متبرک مجاز ہستی کے ہراول حفاظتی دستے کے طور پر تبلیغی جماعتوں کو بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے مصطبغ (بپتسمہ دینے والے) پادری جان کی طرح یہ مبلغ بھی صرف لکڑیاں اور جنگلی شہد کھاتے تھے اور جانوروں کی کھالوں سے تن ڈھانپتے تھے۔ پادری جن کی طرح ان مبلغوں کا کام اسرائیلی بچوں کو احساس ندامت دلانا ہوتا تھا یہ تو ثابت نہیں ہوسکا کہ وہ بھی لوگوں کو بپتسمہ دیتے تھے لیکن آثار قدیمہ کے ماہرین نے خود کامران میں غسل طہارت و پاکیزگی سے متعلق مذہبی رسوم سے واقف اور متعارف کرایا تھا عین ممکن ہے کہ وہ ان وسیع تر رسوم کے سلسلے کی مختصر شکل ہو جو پاکیزگی اور طہارت کے غسل سے متعلق کامرانی قبیلے اور برادری میں رائج ہوں اور پھر کسی نہ کسی شکل میں کافی عرصہ تک روحانی پاکیزگی کے لیے یہودیوں کے اعتقاد اور ایقان کا حصہ رہیں۔

میرے خیال میں ایک خاص توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ ''جوزیفس'' جیسے لوگوں یا مسیحی مقدس کتابوں کے مصنفین نے ان لوگوں کی تحریروں سے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں دیا ان مسودات کے بغیر ہم قطعاً کچھ نہیں جان سکتے تھے کہ ان مقدس فوجی لوگوں کا مدعا اور مطمع نظر کیا تھا کیونکہ کامران رومنوں کے ہاتھوں 68ء میں تباہ ہوا۔ اس برادری نے اپنی مقدس لائبریری کے مسودات کو مٹکوں مرتبانوں اور بوتلوں میں سربمہر کر دیا اور ''تاریکی کے بیٹوں'' کے ان پر حملہ آور ہونے اور پورے قبیلے (برادری) کو نیست و نابود کرنے سے پہلے انہوں نے ان مٹکوں کو قریبی غاروں میں چھپا دیا۔ چونکہ دو ہزار سالوں کے دوران میں ان پر کوئی دست اندازی نہیں ہوسکی اس لئے ان کی موجودگی کو بھلا دیا گیا۔ اب مسودوں کے وہی پلندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ذرا پہلے، ان کی زندگی کے دوران میں اور ان کے فوراً بعد کے عہد کا یہودیت سے متعلق دستاویزی شکل میں اطلاعات کا بہترین ذریعہ ہیں۔

''کامرانی''جمعیت کی یہ دستاویزات پادری جان کی تعلیمات کو جس شکل میں وہ ''گاسپلز'' (انجیل) میں مذکور ہیں، یہودیوں کی مقبول عام عسکری روایات سے ہٹی ہوئی (مختلف) اور علیحدہ قرار دینا انتہائی دشوار ہے۔ روم کے ساتھ طویل اور خونریز گوریلا جنگ کے ماحول میں پادری کا ''بھوسے کو نہ بجھنے والی آگ میں جلا کر خاکستر کرنے'' کا استعارہ

کسی طرح بھی ''کامرانیوں'' کی ''غلے ڈھیر میں بھڑکتی ہوئی آگ'' کی پیش گوئی سے مختلف نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ جان پادری کے ذہن میں کیا تھا لیکن جن زمینی حقائق کی روشنی میں اس کے رویے اور طرزِ عمل کو جانچنا چاہیے وہ کسی ایسے مذہب کی علمبرداری کا مظہر نہیں ہو سکتا جو ابھی ظہور میں نہ آیا ہو۔ میں صرف اس سے منسوب کلام حق اور سرگرمیوں پر اور اجڈ جاہل دہقانوں کے مشتعل ہجوموں، گوریلوں، ٹیکس چوروں اچکوں کی اس شدید نفرت پر غور کرتا ہوں۔ جس کے اظہار کے لیے وہ ہیروڈ کے مظالم، کٹھ پتلی پادریوں، خودسر رومن گورنروں اور بے دین ملحد سپاہیوں کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔

بپتسمہ دینے والے پادری کی گرفتاری کے فوراً بعد غالباً جب وہ ہیروڈ اینٹی پاس کی جیل میں قید کے دوران میں مقدمے کی سماعت کا منتظر تھا تو ...... یسوع مسیح نے بالکل ان ہی طبقوں کے لوگوں اور عین اسی طرح کے پرخطر حالات میں تبلیغ شروع کی۔ ان طبقوں کی طرزِ معاشرت میں یکسانیت اور باہمی مشابہت اتنی زیادہ تھی کہ یسوع مسیح کے مریدوں میں سے کم از کم دو ...... اینڈریو اور سینٹ پیٹر ...... جو آپس میں بھائی تھے وہ پہلے اسی بپتسمہ دینے والے پادری (جان) کے پیروکار تھے۔ بعد میں ہیروڈ اینٹی پاس یسوع مسیح اور جان میں اس حد تک کوئی فرق روا نہیں رکھتا تھا کہ اس سے ...... یہ بیان منسوب ہوا! ''یہ جان ہے جسے میں نے تہِ تیغ کیا۔ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گیا۔'' پہلے پہل یسوع مسیح نے اپنے وعظ اور تبلیغ کا سلسلہ ملک کے پچھلے حصوں میں شروع کیا۔ انہوں نے معجزے دکھا کر بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ہمیشہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے سے بال بال محفوظ رہتے۔ جان اور دوسرے مسیحائی پیامبروں کی طرح جن کا ذکر جوزیفس نے کیا تھا۔ یسوع مسیح سے براہِ راست آمنا سامنا کرنے اور تصادم کا فیصلہ کیا گیا'' جس کا نتیجہ یا تو ان کی گرفتاری ہوگا اور یا پھر خوفناک تباہی اور بربادی۔

یسوع مسیح کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے انہیں آگے بڑھنے اور خطرناک کارنامے سرانجام دینے کا حوصلہ دیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ اپنے مریدوں کے ساتھ یروشلم میں، جو مستقبل کی مقدس یہودی سلطنت کا دارالحکومت بننے والا تھا تبلیغ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ''زکھاریہ'' کی کتاب میں درج نشانیوں کے حوالے سے یسوع مسیح قصداً ایک گدھے (یا شائد ایک ٹٹو) پر سواری کرتے ہوئے دروازوں سے گزرے۔ سنڈے سکول

ٹیچرز کا دعویٰ ہے کہ یسوع مسیح نے اس لیے ایسا کیا کیونکہ اس سے مقصود بے دین کافروں کو امن کا پیغام دینے کا اظہار تھا۔ ان کا یہ دعویٰ زکھاریہ کے، باقی ہر معاملے میں معنی خیز مطالب اور اشاروں کو نظر انداز کرتا ہے جو عسکریت پسند مسیحائی کے حق میں زکھاریہ کے ہاں ملتے ہیں کیونکہ مسیحا زکھاریہ کی آمد کے بعد انکساری کے پیکر اور گدھے پر سواری کرنے والے عیسائیت کے پرچارک قدیم فلسطین کے فرزندان ''نگل جانے والے اور مطیع بنانے والے ...... اورعر ...... زبردست قوت کے مالک بن گئے جو اپنے دشمنوں کو جنگ میں لتاڑ کر گلی کوچوں کی خاک کے برابر کر دیتے ہیں...... کیونکہ مالک آقا ان کے ساتھ ہے ...... اور گھوڑوں پر سوار بے حد پریشان ہو جائیں گے۔''

احساس کمتری کے حامل گدگے پر سوار شخصیت کسی امن پسند مسیحا کی نہیں تھی۔ یہ شخصیت ایک چھوٹی سی قوم کے مسیحا اور بظاہر بے ضرر جنگ کے شہزادے کی تھی جو اسی ''داوٗدؑ'' کی اولاد تھا جس نے خود بھی بظاہر اپنی کمزوری کے باوجود اوج کمال تک پہنچ دکھایا تھا اور دشمن کے گھوڑا سواروں اور رتھ برداروں کو تابع فرمان اور مطیع بنایا تھا۔ کافروں کے لئے امن وامان ہوتا تھا۔ لیکن یہ امن وامان اس مقدس یہودی سلطنت کے زیرسایہ ہوتا تھا جس کے قیام کا مدتوں سے انتظار تھا۔ کم از کم لوگوں کے کثیر انبوہ نے جو راستے میں قطار اندر قطار کھڑے تھے جو کچھ دیکھا اس سے اس نتیجے پر پہنچے، کیونکہ جب یسوع مسیح ان کے قریب سے گزرتے تو ہو نعرہ لگاتے ''مرحبا، اے خدا مرحبا! خیر ہو اس کی جو آقا کے حکم سے آیا ہے خیر ہو ہمارے باپ داوٗد کی بادشاہت کی جو آرہی ہے۔''

یسوع مسیح اور ان کے مریدوں نے شہر میں داخل ہونے کے بعد جو کچھ کیا اس میں بھی کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں تھی جو پرامن ہونے کی دلیل ہو۔ یروشلم پر عید آزادی کی تقریب سے ذرا پہلے حملہ آور ہونے کے فیصلے سے انہوں نے اپنی حفاظت کو یقینی بنایا۔ وہ اس طرح کہ ہزاروں کی تعداد میں زائرین ملک کے مختلف حصوں اور بحیرہ روم کے ملکوں سے جوق در جوق شہر میں ایک ہی وقت میں داخل ہورہے تھے۔ ان میں جوشیلے قزاق، اجڈ دہقان مزدور، بھکاری اور دوسرے شعلہ صفت لوگوں کے گروہ شامل تھے۔ دن کے وقت یسوع مسیح کہیں نہیں جاتے تھے جب تک ان کے اردگرد جان نثاروں کا ہجوم نہ ہوتا۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو وہ اپنے دوستوں کے گھروں کو چلے جاتے اور اپنی جائے قیام کو اپنے خاص

الخاص مریدوں کے سوا باقی سب سے مخفی رکھتے تھے۔

یسوع مسیح اور ان کے پیروکاروں نے کوئی ایسا کام سرانجام نہیں دیا جو انہیں عسکری مسیحائی تحریک کے ارکان کے مقابلے میں ممتاز یا نمایاں کرتا یہاں تک کہ انہوں نے کم از کم ایک پرتشدد محاذ آرائی میں اشتعال دلایا۔ انہوں نے ایک بڑے گرجے پر یلغار کی۔ اس کے صحن میں گھس کر لائسنس یافتہ تاجروں پر جو کرنسی کے تبادلوں کا کاروبار کرتے تھے حملہ آور ہوئے تاکہ باہر سے آئے ہوئے زائرین قربانی کے لیے جانور خرید سکیں۔ اس واقعہ میں یسوع مسیح نے ایک کوڑا استعمال کیا۔

انجیل میں بتایا گیا ہے کہ ''کائیا فاس'' نے جو بڑا پادری تھا یسوع مسیح کو گرفتار کرنے کی سازش کیسے تاری کی۔ چونکہ کائیا فاس نے کرنسی ڈیلروں کے خلاف پرتشدد حملوں کو آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے اس کے دل میں یسوع مسیح کو جیل میں ڈالنے کے لیے قانونی جواز سے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ کائیافاس کو درپیش مسئلہ صرف یہ تھا کہ ان سب لوگوں کو مشتعل کیے بغیر جو یسوع مسیح کو ''مسیحا'' مانتے تھے انہیں کیسے گرفتار کیا جائے۔ ان دنوں شاٹ گن اور اشک آور گیس کی ایجاد سے پہلے ہنگامہ کرنے والوں کی بھیڑ بھاڑ انتہائی خطرناک ہوتی تھی۔ بالخصوص اگر لوگوں کو یقین ہوتا کہ ان کا لیڈر ناقابل تسخیر ہے۔ چنانچہ کائیا فاس نے پولیس کو ہدایت کی کہ وہ یسوع مسیح کو اپنی تحویل میں لے لے، لیکن دعوت کے دن نہیں۔ تاکہ لوگ کوئی ہنگامہ نہ کرسکیں۔

یسوع مسیح کے گرد جمع ہجوم کے پاس یقیناً اتنا وقت نہیں تھا کہ عدم تشدد پر مبنی رویہ اختیار کرتا ان کے انتہائی معتمد اور قریبی پیروکار بھی واضح طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ (تھپڑ کھانے کے لیے) اپنا دوسرا رخسار پیش کرتے۔ ان میں سے دو کے ناموں کی عرفیت (لقب) ایسی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ امن کا تعلق عسکری انتہا پسندوں سے تھا۔ ایک کا نام سائمن تھا جسے جوشیلا (زیلاٹ) کہا جاتا تھا اور دوسرے کا اصل نام جوڈاس اور اس کی عرفیت اسکاریاٹ تھی۔ اسکاریات اور جوزیفس نے ''خودکش خنجر بردار'' لوگوں کی شناخت کے لیے جو لفظ ''اسکاری'' استعمال کیا ہے ان میں مماثلت ڈھکی چھپی نہیں اور کئی پرانے لاطینی نسخوں میں جوڈاس کو ''زیلاٹس'' (جوشیلا) کہا گیا ہے۔

دو اور پیروکاروں کے نام جنگ پسندوں جیسے تھے۔ جیمس اور جان دونوں

MashalBooks.org

''زبیدی'' کے بیٹے تھے۔ انہیں بوئرز جس کہا جاتا تھا جس کا ترجمہ مارک نے گرج چمک کے بیٹے کیا ہے اور جس کا مطلب غضبناک طیش کے پتلے بھی ہو سکتا ہے۔ ''زبیدی'' کے بیٹے انتی شہرت کے واقعی مستحق تھے۔ انجیل کی عبارت میں ایک مقام پر انہیں سمارئین نام کے پورے گاؤں کو جلا دینے کا خواہش مند بتایا گیا ہے کیونکہ اس گاؤں کے لوگوں نے یسوع مسیح کا خیر مقدم نہیں کیا تھا۔

انجیل میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ کئی مریدوں نے تلواریں سونت لیں اور گرفتاری میں مزاحم ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنی گرفتاری سے ذرا پہلے یسوع مسیح نے کہا جس کے پاس تلوار نہیں اسے اپنا لباس بیچ کر ایک (تلوار) خریدنی چاہیے، یہ سن کر مریدوں نے دو تلواریں دکھائیں ...... جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان میں سے کم از کم دو مرید نہ صرف عادی اسلحہ بردار تھے بلکہ اپنی تلواروں کو چھپا کر بھی رکھتے تھے...... خنجر برداروں کی طرح۔

کتاب کے چاروں حصوں میں اس حقیقت کا ذکر موجود ہے کہ یسوع مسیح کی گرفتاری کے وقت مریدوں نے اس کے خلاف مسلح مزاحمت کی۔ جشن آزادی کے کھانے کے بعد یسوع مسیح اور ان کے قریبی ساتھی کھسک کر ایک باغ میں چلے گئے جہاں انہوں نے رات بسر کرنے کی تیاری شروع کی۔ جوڈاس اسکاریاٹ کی راہنمائی میں بڑے پادری اور اس کے ساتھیوں نے انہیں اس وقت آن لیا جب یسوع مسیح عبادت میں مصروف تھے اور باقی لوگ سو رہے تھے۔ مریدوں نے اپنی تلواریں نکالیں اور ایک مختصر سی جھڑپ شروع ہو گئی جس کے دوران میں گرجے کی پولیس کا ایک آدمی ایک کان سے محروم ہو گیا اور جونہی پولیس کے آدمیوں نے یسوع مسیح کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ مریدوں نے لڑنا بند کر دیا اور رات کی تاریکی میں کہیں بھاگ گئے۔ ''میتھیو'' کے مطابق یسوع مسیح نے اپنے ایک مرید کو تلوار کو نیام میں ڈالنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایسا حکم سننے کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ وہ ایک طرف ہو کر کہیں بھاگ گیا۔

انجیل میں درج صورت حال کے مطابق جوڈاس کو جو قیمت ادا کرنی پڑتی وہ ہیروڈ اینٹی پاس کی مذمت سے مشابہہ تھی جو جان پادری کی وجہ سے ہوئی۔ اگر جوڈاس فی الحقیقت ایک زیلاٹس...... ایک جوشیلا جنونی ...... تھا تو وہ یسوع مسیح کو فوجی نقل وحرکت اور کئی دوسری چالوں کے ذریعے دغا دے سکتا تھا لیکن صرف مالی مفاد کے لیے ہرگز نہیں۔ (ایک

نظریہ یہ بھی ہے کہ یسوع مسیح زیادہ عسکریت پسند نہیں ہو رہے تھے) جوڈاس کی ترغیب کو خالصتاً اس کے لالچ پر محمول کر کے انجیل میں واقعات کو اسی طرح توڑ مروڑ دیا گیا ہے جیسے جوزیفس اور رومنوں نے خود بخود سب جانثار جوشیلے اچکوں کے معاملے میں کہا تھا حالانکہ وہ جوشیلے کوئی معاوضہ لئے بغیر قتل و غارت کرتے تھے۔ پچھلے باب میں دی گئی تفصیلات سے کم از کم اتنی حد تک بات واضح ہو جاتی ہے۔

آخر مرید پیروکار کیوں بھاگ گئے اور ''سائمن پیٹر'' نے رات ختم ہونے سے پہلے تین مرتبہ یسوع مسیح کی حکم عدولی کیوں کی؟ اس لئے کہ وہ یہودی ہونے کے ناطے کائیا فاس کے اپنے اسلاف کی عسکری طرز معاشرت کے شعور پر نازاں ہونے کے جذبات میں شریک تھے اور سمجھتے تھے کہ مسیحا نا قابل تسخیر کرامات دکھانے والا عسکری شہزادہ ہوگا۔

ان سب حقائق سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یسوع مسیح اور ان کے پیروکاروں کا معتمد ترین اندرونی حلقہ جس طرز معاشرت کے شعور سے بہرہ ور تھا وہ ''پرامن'' مسیحا کی طرز معاشرت کے شعور سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اگرچہ انجیل کے نسخوں میں اس کی تردید کے واضح شواہد ملتے ہیں کہ یسوع مسیح پر تشدد سیاسی اقدامات اٹھانے کے حق میں تھے لیکن زیر سطح خفیہ انداز میں ایسے واقعات اور اقوال کو بھی محفوظ کئے ہوئے ہیں جن سے پادری جان اور یسوع مسیح کا تعلق عسکریت پسند مسیحائی روایات سے جوڑا جا سکتا ہے اور جن کا مقصد ان کے گوریلا جنگ میں ملوث ہونے کو ثابت کرنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت انجیل کا پہلا دفتر لکھا گیا اس وقت یسوع مسیح کے خلاف واقعات اور اقوال کو چشم دید گواہوں اور مواخذے (کے خوف) سے مبرا مذہبی رہنماؤں کے ذریعے ان سے منسوب کیا گیا جو ان کے پیروکاروں میں زبان زد عام تھے۔ انجیل کے لکھنے والوں نے یسوع مسیح کے اسلوب اعتقاد کا انجیل میں پرامن مسیحا کے روپ میں ڈھال کر پیش کیا لیکن وہ اس میں عسکری مسیحائی کے ایک تسلسل کی جھلکیوں کو پوری طرح خارج کرنے میں ناکام رہے۔ اس ضمن میں انجیل کے نسخوں میں موجود ابہام کو ثابت کرنے کا بہترین طریقہ یسوع مسیح کے نہتائی پرامن اقوال کو درج ذیل ایک فہرست میں اور اس کے منفی اور خلاف توقع متضاد اقوال کو دوسری میں بیان کیا گیا ہے۔

امن قائم کرنے والوں پر رحمت ہوتی ہے۔ وہ خدا کے محبوب ہوتے ہیں۔ (میتھیو 5:90)

جو کوئی تمہارے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے، دوسرا رخسار اس کی طرف موڑ دو۔ (میتھیو 5:39)

وہ سب لوگ جو تلوار اٹھاتے ہیں وہ تلوار ہی سے تباہ ہوں گے۔ (میتھیو 26:5)

اپنے دشمنوں سے محبت کرو جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان سے بھلائی کرو۔ (لیوک 6:27)

یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر امن لانے کے لیے آیا ہوں میں امن دینے نہیں بلکہ تلوار دینے آیا ہوں۔ (میتھیو 10:34)

کیا تم سوچتے ہو کہ میں زمین پر امن دینے آیا ہوں؟ میں تمہیں بتاؤں کہ نہیں بلکہ بٹوارہ اور علیحدگی۔ (لیوک 12:52)

وہ جس کے پاس تلوار نہیں اسے چاہیے کہ اپنی وشا کیں بیچ کر ایک تلوار خریدے۔ (لیوک 22:36)

اور جب اس نے انہیں چھوٹی رسیوں اور ڈوریوں میں باندھ لیا...... تو انہیں گرجے سے باہر دھکیل دیا اور روپے پیسے کا تبادلہ کرنے والوں کی ساری رقم اٹھا کر میزوں کو الٹ دیا۔ (جان 2:15)

اس مرحلے پر میں آپ کو مفروضے پر مبنی اس سوال اور اس کے جواب کے بارے میں بھی بتاتا چلوں۔ سوال یہ تھا کہ یہودیوں پر رومنوں کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس کی ادائیگی لازم ہے؟ اس پر یسوع مسیح کی طرف سے جو جواب منسوب کیا گیا وہ یوں تھا ''جو سیزر کا حق بنتا ہے وہ اسے دے دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔'' گلیلی کے باشندے جنہوں نے جوڈاس کی طرف سے کی گئی ٹیکس کے خلاف ہڑتال میں حصہ لیا تھا، اس جواب سے صرف ایک مطلب اخذ کر سکتے تھے، یعنی یہ کہ ''مت ادا کرو۔'' وہ اس لیے کہ جوڈاس کے کہنے کے مطابق فلسطین میں موجود ہر شے خدا کی ملکیت تھی لیکن بائبل کے مصنفین اور ان کے قارئین شائد گلیلی کے جوڈاس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اس لیے انہوں نے یسوع مسیح کے جواب کی شکل میں اشتعال انگیز ردعمل کو غلط فہمی میں آ کر اس مفروضے کے تحت ان سے منسوب کیا کہ یہ رومن حکومت کے حق میں مفاہمانہ سوچ کا آئینہ دار تھا۔

یسوع مسیح کی گرفتاری کے بعد رومیوں اور ان کے یہودی حامیوں نے ان سے

MashalBooks.org

ایسا سلوک روا رکھا گویا وہ کسی موجودہ یا مجوزہ عسکری تحریک کے قائد تھے۔ یہودیوں کی ہائی کورٹ نے ان پر گستاخانہ اور ملحدانہ غلط پیش گوئیاں کرنے کا مقدمہ چلایا اور وہ فوراً مجرم قرار دیئے گئے۔ ان کے خلاف لادینیت کے دوسرے الزام کے تحت پائیلیٹ سے رجوع کیا گیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، جیسا کہ میں نے ''کارگو' والے باب میں واضح کیا تھا کہ غیر ملکی مقبوضہ علاقوں کے سیاق وسباق میں مقبول عام مسیحا پر ہمیشہ سیاسی بنیادوں پر مبنی نوعیت کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے ہرگز مذہبی نہیں ہوتے۔ رومنوں کو یسوع مسیح کے اس جرم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ مقامی آبادی کے مذہبی عقائد اور ضابطوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے تھے لیکن وہ ان کی طرف سے غیر ملکی حکومت کو تہہ و بالا کرنے کی دھمکیوں سے بہت پریشان تھے۔

کائنافاس کی اس بارے میں پیش گوئیوں کی بہت جلد پوری طرح تصدیق ہوگئی جن کے ذریعے اس نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ یسوع مسیح کے بے بس پا کر لوگوں کے مجمع کا ردعمل کیا ہوگا۔ پائیلیٹ مسترد شدہ شخص کو سرعام پبلک میں لے آیا اور احتجاج کی ایک آواز بھی سننے میں نہ آئی، بلکہ پائیلیٹ نے ہجوم کے سامنے یہ پیش کش تک کر ڈالی کہ اگر ہجوم چاہے تو وہ یسوع مسیح کو حراست سے آزاد کر دینے پر تیار تھا۔ انجیل کا دعویٰ ہ کہ پائیلیٹ کی جانب سے اس پیش کش کی وجہ پائیلیٹ کا یسوع مسیح کو معصوم اور بے گناہ سمجھنا تھا۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ پائیلیٹ بڑا زبردست دغا باز، سخت گیر اور اذیت پسند فوجی تھا جو یروشلم کے احتجاجی ہجوم پر سختی سے پیش آیا کرتا تھا۔ ''جوزیفس'' کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ پائیلیٹ سنے کئی ہزار لوگوں پر مشتمل ہجوم کو پیار سے بہلا پھسلا کر یروشلم کے سٹیڈیم میں جمع کیا پھر ان کے گرد فوجیوں کا گھیرا ڈال دیا اور ان سب کے سرتن سے جدا کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ایک اور موقع پر احتجاجی ہجوم میں اس کے آدمی اپنا اسلحہ سویلین لباس میں چھپا کر گھس گئے اور اشارہ پاتے ہی ہر اس شخص پر لاٹھیاں برسا دیں جو سامنے آیا۔ پائیلیٹ کا باغیوں کے مضطرب ہجوم کے سامنے، جو کل تک اس کے مداح تھے، جنھوں نے گزشتہ روز اس کی حفاظت کی تھی، یسوع مسیح کو پیش کرنے سے اصل مقصود یہ تھا کہ وہ عسکری مسیحائی سے منسلک مقامی لوگوں کو ان کی بے وقوفیوں سے آگاہ اور مرعوب کرنا چاہتا تھا اور وہ یوں کہ ان کے سامنے ان کا مفروضہ مقدس نجات دہندہ، یہودی سلطنت کا مقدس ومتبرک بادشاہ، گنتی کے

چند ایک رومن سپاہیوں کے سامنے بے بس اور بے یار ومددگار کھڑا تھا۔ ردعمل میں لوگوں کا مجمع بہ آسانی یہ مطالبہ بھی کرسکتا تھا کہ یسوع مسیح کو مذہب سے فریب اور دغابازی کے جرم میں مار ڈالا جائے لیکن پائیلیٹ مذہب کے جھوٹے مدعیوں کو ٹھکانے لگانے کے حق میں نہیں تھا۔ رومنوں کی نظر میں یسوع مسیح کی حیثیت محض ایک تخریب کار کی تھی جو اسی سلوک کا مستحق تھا جو دوسرے سب اشتعال دلانے والے انقلاب پسندوں سے روا رکھا جاتا تھا، اس لئے یسوع مسیح کی صلیب پر ''یہودیوں کا بادشاہ'' کا ''لقب'' درج تھا۔

مانچسٹر یونیورسٹی کے ادارۂ دینیات کے سابق سربراہ اگیس جی ایف برینڈن ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ یسوع مسیح کو اکیلے مصلوب نہیں کیا گیا۔ انجیل میں آیا ہے کہ انہیں دو دوسرے سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ پھانسی دی گئی۔ یسوع کے ان دو ساتھیوں کا جرم کیا تھا؟ انگریزی زبان کے ترجمے میں انہیں چور بتایا گیا ہے لیکن اصل یونانی مسودوں میں ان کے لیے گستائی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ بالکل وہی اصطلاح ہے جو جوزیفس ''زیلاٹس'' (جوشیلے دیوانوں) کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ برینڈن کو یقین ہے کہ اس سے زیادہ غیر مبہم انداز میں کہ یہ ''اچکے'' دراصل کون تھے۔ ''مارک'' کا بیان ہے کہ یسوع مسیح کے مقدمے کے دوران میں بغاوت، بلوے اور شورش کے مرتکب کئی مجرم یروشلم کی جیل میں موجود تھے۔ل اگر تو یسوع مسیح کے ساتھی ان شورش پسند بلوائیوں میں سے چنے گئے تھے تب تو ''گولگوتھا'' کا مہیب اور ہیبت ناک منظر اتحاد اور یکجہتی کا مظہر ہوسکتا ہے، ورنہ نہیں ......یعنی درمیان میں مسیحائیت کا مفروضہ یہودی بادشاہ، اپنے دو جوشیلے دیوانوں (زیلاٹس) کو اپنی دونوں طرف پہلو میں لئے ہوئے۔ یہ منظر اپنی اس تمام تر جابرانہ بدیشی حکمرانوں کی مخصوص ذہنیت کے عین مطابق اور موزوں ہے جس کا ہمیں علم ہے اور اپنی اس ذہنیت کے باوجود وہ اس کی بدولت مقامی باغیوں کو امن و امان کا درس دینے پر مصر ہوتے ہیں۔

یسوع مسیح کے صلیب پر مصائب اور تکالیف اور موقع پر ان کے مریدوں کی عدم موجودگی سے متعلق غم ناک منظر پر انجیل کے چاروں نسخے ہم خیال اور متفق ہیں۔ ان کے پیروکاروں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک مسیحا خود کو مصلوب ہونے دے گا حالات اس مرحلے پر پہنچ جانے کے باوجود انہیں پھر بھی راسخ الاعتقادی میں خفیف ترین شک وشبہ نہیں تھا کہ یسوع مسیح کا مسلک ایک پرامن نجات دہندہ کی بجائے منتقم مزاجی پر استوار تھا۔

MashalBooks.org

درحقیقت جیسا کہ برینڈن کی رائے ہے کہ مارک کے مرتب کردہ انجیل کے نسخے کی ڈرامائی اثر آفرینی کی وجہ مرید پیروکاروں کی اس جواز کا ادراک کرنے میں ناکامی تھی کہ ان کا مسیحا اپنے دشمنوں کو تباہ کیوں نہیں کرے گا اور خود کو موت سے کیوں نہیں بچائے گا۔

یسوع مسیح کے مقبرے سے ان کا جسم غائب ہونے کے بعد ہی ان کی مسیحائی قوت میں بظاہر کمی کو سمجھا جا سکا۔ کئی مریدوں کو بصیرت نصیب ہوئی جس کے سبب وہ سمجھ گئے کہ مسیحائی سے متعلق معمول کے عام معیار...... فتح کا اطلاق یسوع مسیح پر نہیں ہوتا تھا۔ اپنی اسی بصیرت کی روشنی سے تحریت پا کر انہوں نے ایک اہم (لیکن بے نظیر نہیں) اقدام اٹھایا اور یہ دلیل دینا شروع کر دی کہ یسوع مسیح کی موت ان کے ''ایک اور جھوٹے مسیحا'' ہونے کو ثابت نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس خدا تعالیٰ نے یہودیوں کو ایک اور سنہری موقعے سے نوازا ہے جس کی بدولت وہ خود کو معاہدے کا اہل ثابت کریں۔ یسوع مسیح واپس آجائیں گے اگر لوگ انہیں شک و شبہ کا نشانہ بنانے پر اظہار ندامت کریں اور خدا تعالیٰ سے معافی کے طلب گار ہوں۔

یہ فرض کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ یسوع مسیح کی موت سے متعلق اس نئی معنی خیز توضیح کی بدولت ان کی سیاسی اور فوجی حیثیت سے ''مسیحائی'' کو فوری طور پر مسترد کر دیا گیا۔ پروفیسر برینڈن نے اس نظریے کو بڑے مدلل طریق سے پیش کیا ہے کہ زیادہ تر یہودی جو یسوع مسیح کی واپسی کی توقع ان کے مصلوب ہونے اور یروشلم کے سقوط کے درمیانی عرصے میں رکھتے تھے، بدستور ایک مسیحا کی آمد کے منتظر رہے جو رومیوں کو نیچا دکھا کر یروشلم کو مقدس عیسائی سلطنت کا دارالحکومت بنائے گا۔ ان کے اس نقطۂ نظر کی تائید کئی شہادتوں سے ہوتی ہے۔ لیوک نے یسوع مسیح کی موت کے بعد پیش آنے والے واقعات پر ایک کتاب ''مصلح لیڈروں کے کارنامے'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کی یادداشتوں پر مبنی اس تصنیف کا اولین موضوع یسوع مسیح کی واپسی کی اہمیت اور اثرات سے متعلق وہ سوچ ہے جو اصلاح تحریک کے لیڈروں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں وہ واپس آنے والے یسوع مسیح سے پہلا سوال یہ کرتے ہیں کہ ''آقا کیا اس مرتبہ آپ اسرائیل کی سلطنت دوبارہ بحال کریں گے؟'' ایک اور ذریعہ ''عہد نامہ جدید'' کا ماخذ ''الہامات کی کتاب'' میں واپس آنے والے یسوع مسیح کا حال یوں ہے: ''بہت سے تاجوں سے مزین، سفید گھوڑے پر سوار

جو جنگ کا فیصلہ کرتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے، اس کی آنکھیں آگ کے شعلے کی مانند ہیں، پوشاک خون میں تر بتر ہے اور وہ قوموں پر حکمرانی ایک آہنی عصا سے کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے غیض کو ٹھنڈا کرنے کے لیے واپس آیا ہے۔" اس نکتے کے حق میں آبنائے بحر مردار (ڈیڈسی) سے ملنے والی دستاویزات میں بھی کئی شہادتیں موجود ہیں۔

ذرا پہلے میں ذکر کر چکا ہوں کہ مرنے کے بعد "مسیحا" کے واپس آجانے کا تصور اچھوتا ہونے کے باوجود ایسا نہیں تھا جس کی نظیر پہلے سے موجود نہ ہو۔ بحیرہ مردار سے ملنے والی دستاویزات میں ایک سچے اور راست باز استاد کا حوالہ موجود ہے جسے اس کے دشمن مار ڈالتے ہیں لیکن وہ زندہ واپس لوٹ آتا ہے تاکہ اپنی مسیحائی کے فرائض سرانجام دے۔ کامرانیوں کی طرح عیسائیت کا مذہب اختیار کرنے والے پہلے یہودیوں نے بھی خود کو ایک ایسی جماعت کی شکل میں منظّم کیا تھا جو اپنے "راشت باز استاد" کی واپسی کے منتظر رہتے تھے۔

"ایکٹ آف اپاسٹلز" (مصلحین کے کارنامے) کتاب میں یوں درج ہے۔ "سب معتقدین اکٹھے (یک جا) ہوتے تھے اور ان کی سب چیزیں مشترکہ تھیں۔ انہوں نے اپنی املاک اور مال و اسباب بیچ دیا اور انہیں آپس میں جو کچھ کسی کو ضرورت تھی اس کے مطابق بانٹ دیا۔ کیونکہ جتنے لوگ بھی زمینوں اور مکانوں کے مالک تھے۔ انہوں نے انہیں بیچ کر فروخت سے حاصل ہونے والی رقم مذہبی رہنما کے قدموں میں ڈال دی۔

یہ بھی کافی دلچسپ بات ہے کہ آبنائے بحر مردار سے ملنے والی دستاویزات میں بھی پشیمان کفارہ ادا کرنے والے یہودیوں کی شہروں میں برادریاں بنانے کے نسخے موجود تھے جنہیں ان ہی خطوط پر منظّم کیا جانا تھا جو اشتراکیت کے اصولوں پر مبنی تھے۔ یہ اس امر کی ایک اتفاقی شہادت ہے کہ جنگجو اور لڑاکے کامرانیوں یہودی سے عیسائی ہوجانے والوں کو ایک جیسے ملتے جلتے (یکساں) حالات میں ایک جیسے طریقے اختیار کرنے پڑے یا وہ دونوں ایک ہی عسکری نجات دہندہ تحریک کی شاخیں تھیں۔

میں اس باب کے شروع میں بتا چکا ہوں کہ یسوع مسیح کی شخصیت کا تصور بطور ایک "پرامن مسیحا" کے غالباً سقوط یروشلم کے بعد تک واضح اور مکمل نہیں تھا۔ یسوع مسیح کی وفات اور انجیل کے پہلے نسخے تحریر کئے جانے کے درمیانی وقفے میں ان کے ایک پرامن مسیحائی مسلک کے علمبردار ہونے کا ابتدائی کام "پال" نے شروع کیا۔ لیکن وہ لوگ جن کے

نزدیک یسوع مسیح بنیادی طور پر ایک عسکریت پسند یہودی نجات دہندہ تھے وہ اس پورے عرصے کے دوران گوریلا تحریک کو پھیلانے میں سرگرم رہے جس کا انجام 63ء میں جنگ کی صورت میں ہوا۔ حالات و واقعات کے جس گرداب کے دوران میں انجیل کے دفاتر لکھے گئے وہ نسخے جن میں یسوع مسیح کو خالصتاً ایک عالمگیر پر امن مسیحا بیان کیا گیا ہے وہ یہودیوں کی روم کے خلاف ناکام جنگ کے عواقب و نتائج تھے۔ خالصتاً پر امن مسیحا اس وقت کی عملی حقیقی ضرورت بن گیا جب ویسپاسین اور ٹیٹس جیسے جرنیل سلطنت روم کے حکمران بن گئے جنہوں نے یہودی انقلاب پسند مسیحاؤں کو شکست سے دو چار کیا تھا۔ اس شکست سے پہلے یروشلم میں رہنے والے عیسائی یہودیوں کی حقیقی ضرورت تھی کہ وہ یہودیت کے وفادار رہیں۔ اس شکست کے بعد یروشلم کے یہودی عیسائی مملکت کے دوسرے حصوں میں رہنے والی عیسائی آبادیوں اور بستیوں پر اپنا تسلط مزید عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتے تھے، بالخصوص ایسے عیسائی جو روم میں رہتے تھے۔ مسیحائی کی جنگ میں ناکامی کے مابعد حالات اور اثرات کے باعث عیسائیوں کے لیے اس کی تردید ایک ضرورت بن گئی کہ ان کا مسلک یہودیوں کے اس اعتقاد سے ہم آہنگ تھا جس کے مطابق وہ ایک آنے والے مسیحا سے روم کی سلطنت کو تہہ و بالا کرنے کی توقع رکھتے تھے۔

''ایکٹ آف اپاسٹلز'' کے مطابق یروشلم کے انتظامی علاقے میں بسنے والی عوامی برادری کی قیادت تین ارکان پر مشتمل تھی جنہیں ستون (پلرز) کہا جاتا تھا۔ یہ تین لوگ جیمس، پیٹر اور جان تھے۔ ان میں سے جان جس کی شناخت ''آقا کا بھائی'' کے نام سے کراتا ہے (صحیح خاندانی اور نسبی تعلق کا علم نہیں) جلد ہی نمایاں شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ یہ ''جان'' ہی تھا جس نے پال کی ان کوششوں کے خلاف، جن کے ذریعے وہ یسوع مسیح کی یہودی عسکریت پسندی پر مبنی مسیحائی تحریک کے آغاز کو دھندلانا چاہتا تھا، چلائی جانے والی تحریک کی راہنمائی کی۔

اگرچہ یروشلم 70ء تک عیسائیت کا گڑھ رہا لیکن نیا مسلک اور اعتقاد فلسطین سے باہر سلطنت روم کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں یہودی تاجروں، کاریگروں اور پڑھے لکھے عالموں فاضلوں کے طبقوں میں پھیل گیا۔ سمندر پار رہنے والے یہودیوں نے یسوع مسیح سے متعلق معلومات اور علم تبلیغی جماعتوں سے حاصل کیا جو ان بیرونی ممالک کا دورہ کرتی

رہتی تھی۔ ان مبلغوں میں سب سے اہم پال تھا جس کا اصل نام ساہول تھا اور وہ یونانی زبان بولنے والے یہودی ٹارسیس کا بیٹا تھا۔ اس کے والد نے اپنے اور اپنے کنبے کے لیے یروشلم میں روم کی شہرت حاصل کی ہوئی تھی۔ پال کا اصرار تھا کہ وہ یسوع مسیح کا مرید، اس کے یروشلم میں موجود اصل مریدوں سے کسی رابطے کے بغیر، براہ راست الہامی احکامات کے تحت بنا تھا۔ گلابٹن کے نام اپنے ایک خط میں جو49ء اور 57ء کے درمیانی عرصہ میں کسی وقت لکھا گیا پال نے کہا کہ وہ عرب اور دمشق میں تین سال تک تبلیغ کرتا رہا تھا اور اس نے کسی اصل مرید سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اسی خط میں پال بتاتا ہے کہ اس وقت اس نے ایک مختصر ملاقات سائمن پیٹر سے کی اور ''آقا کے بھائی'' جیمس سے بھی بات ہوئی۔

اگلے پندرہ سالوں کے دوران میں پال پھر سفر پر رہا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک آتا جاتا رہا پہلے پہل اس نے جن لوگوں کو عیسائی بنایا وہ تقریباً سب کے سب یہودی تھے۔ ایسے ہونا بھی تھا کیونکہ وہ یہودی ہی تھے جو پیغمبری کے اس سلسلے کا علم رکھتے تھے جو ایک ہی نسب میں مسلسل چلا آرہا تھا اور جس کے متعلق پال نے دعویٰ کیا کہ اسی نسب کے سلسلے کی کڑی تھے۔ اگر پال یہودیوں کے بڑے عالموں کے ساتھ نہ بھی پڑھتا رہا ہوتا، عبرانی زبان نہ بھی بول سکتا ہوتا اور خود کو ایک یہودی نہ بھی سمجھتا تو بھی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ یہودی جو سلطنت روم کے مشرقی حصوں میں پھیلے ہوئے تھے یسوع مسیح کے مسلک سے دوسروں کی نسبت زیادہ متاثر اور درشت ردعمل کے حامی ہو سکتے تھے۔ یہودی نہ صرف تعداد میں مہاجرین کا سلطنت میں سب سے بڑا گروہ تھے بلکہ سب سے زیادہ بارسوخ بھی تھے۔ 71ء تک انہیں بہت سی ایسی مراعات حاصل تھیں جس سے دوسری نسلیں مذہب کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ یہ تعداد اس تعداد کی دوگنی سے بھی زیادہ تھی جسے جیمس نے فلسطین کے اندر مذہب کی تبدیلی کی راہ پر لانا تھا۔

پال کی ایک خاص کوشش یہ تھی کہ جب سمندر پار کی کسی یہودی برادری کی طرف سے اچانک اسے انکار یا تنقید کا سامنا ہوتا تو وہ غیر یہودیوں کو بھی تبدیلی مذہب کے ذریعے اپنے ساتھ شامل کر لیتا۔ لیکن بذات خود یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ ان سیاسی اور اقتصادی فوائد کی بنا پر جو یہودیوں کو ان کے طویل تجربے اور دارالحکومت میں موجود بساط سیاست پر موجودگی کے باعث حاصل تھے۔ یروشلم میں مذہب تبدیل کرکے آنے والوں کا

تانتا بندھا رہتا تھا۔ نئے یہودی بننے والوں کا اس وقت تک بطور یہودی بڑا سواگت ہوتا تھا جب تک دس احکام ربانی کی بجا آوری پر اور ختنہ کرانے آمادہ رہتے۔ سب سے عجیب اور انوکھی اختراع جسے پال سے منسوب کیا جاتا ہے یہ تھی کہ لوگوں کے مذہب تبدیل کرنے میں اس مسیحائی پیغام یا درس نجات کا دخل نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ ختنہ کرانے یاان کے یہودی ہونے کی تصدیق کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر غیر یہودیوں کو یہودی نژاد عیسائی بنانے پر اس کی آمادگی تھی۔

''ایکٹ آف اپاسٹلز''(مریدوں کے کارنامے) میں بتایا گیا ہے کہ پال ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد یروشلم واپس آیا اور جیمس کے علاوہ یروشلم کے بزرگ عمائدین سے مل کر درخواست کی کہ وہ اس کی غیر یہودیوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں دخل اندازی نہ کریں۔ جیمس کی رائے کے مطابق غیر یہودی ختنے کرائے بغیر عیسائی بن تو سکتے تھے بشرطیکہ وہ بت پرستی، ناجائز جنسی تعلق (زناکاری) اور گلا گھونٹ کر مارے جانے والاے جانور کی خون آلود گوشت خوری ترک کر دیں۔ لیکن جیمس اور یروشلم میں اس کے ہم خیال ساتھیوں کا اصرار تھا کہ ختنہ کرائے بغیر عیسائی بننے والے یہود نژاد عیسائیوں سے رتبے میں کم تر تھے۔ پال بتاتا ہے کہ جب سائمن پیٹر اس سے ''اینٹاچ'' میں ملنے آیا تو سب عیسائیوں نے مل کر اکٹھے کھانا کھایا لیکن جیمس کی طرف سے بھجوائے گئے تحقیقاتی کمیشن کی آمد پر سائمن پیٹر نے ختنہ کرائے بغیر عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے۔ اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ کمیشن کے ممبران ختنہ شدہ یہودی نژاد عیسائی تھے، اور وہ یہودی نژاد عیسائی جیمس سے اس کی شکایت کر سکتے تھے۔

سمندر پار ملکوں میں اس کے حامیوں کی موجودگی کی بنا پر پال کو فوقیت حاصل تھی اور وہ اپنے اس استحقاق کی بدولت دھیمے لہجے اور دھیمی سر تال میں اپنی آواز لوگوں تک پہنچاتا رہتا تھا۔ یہ بات بھی اس کے مفاد میں تھی کہ وہ یسوع مسیح کے ''مسیحائی میشن'' میں سے دنیاوی فوجی اور سیاسی اجزا کو نظر انداز کرتا تھا لیکن پال کی متحدہ عیسائیت (مسیحی اتحاد) پر مبنی طرز عمل اور اختراعات سے ایک نئی محاذ آرائی کا مسئلہ پیدا ہو گیا جسے وہ کبھی حل نہ کر سکا۔ لامحالہ جیمس اور یروشلم کے دوسرے سماجی حلقوں سے اس کا جھگڑا بڑھ گیا کیونکہ یروشلم کے عیسائیوں کی بقا کا انحصار اسی بات پر تھا کہ وہ پرخلوص اور نیک نیت محبّ وطن یہودیوں کی

مانند اپنا مقام و مرتبہ برقرار رکھنے کی اہلیت کے حامل ہوں۔ روم کے ساتھ جنگ میں شدت لانے میں ملوث مختلف فرقوں کے درمیان اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ جیمس اپنی عبادت یروشلم کے گرجا گھروں میں جاری رکھے اور اس کے حواری (پیروکار) یہودی قانون پر کار بند ہونے کے تصور کو برقرار رکھیں ان کے اس اعتقاد کی وجہ سے کہ یسوع مسیح جلدی دوبارہ واپس آئیں گے''یہودا'' کے عہد نامہ سے متعلق ان کا اعتماد اور یقان کم نہیں ہوا بلکہ مزید پختہ ہوگیا۔

پال پر الزام تھا کہ وہ بیرونی ممالک میں مقیم یہودیوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ یہودی قوانین کا احترام نہ کریں اور یہودیوں اور غیر یہودیوں میں کسی فرق یا تمیز کا احساس کئے بغیر ان سے مساویانہ سلوک روا رکھیں۔ گویا یہودی اور کافر (غیر یہودی) مسیحائی کے ذریعے ملنے والی نجات کی برکتوں میں برابر کے حقدار تھے۔ اگر یسوع مسیح کے اعتقاد اور مسلک پر مبنی اس قسم کی تعبیروں کا چرچا کبھی یروشلم میں عام ہوتا تو جیمس اور اس کے حواری معتوب ٹھہرتے۔ برینڈن کے الفاظ میں یہودیوں کے نقطۂ نظر سے یہ الفاظ، یہ بیان نہ صرف مذہبی لحاظ سے اشتعال انگیز تھا بلکہ مذہب سے برگشتہ ہونے کی نہایت افسوس ناک مثال تھا جس کا نشانہ نسل اور مذہب دونوں تھے۔

یسوع مسیح سے منسوب اقدامات اور اقوال پر مشتمل محفوظ شہادت سے پال کی ان کوششوں کی حمایت نہیں ہوتی جن کے ذریعے وہ سمندر پار ملکوں کے معاشروں میں یہودی اور غیر یہودی کی تمیز کو مٹانا چاہتا تھا۔ مثال کے طور پر انجیل میں مارک کے کہنے کے مطابق ایک شام نژاد یونانی عورت یسوع مسیح کے قدموں پر گر کر ان سے درخواست کرتی ہے کہ اس کی بیٹی کے وجود میں سے شیطانی بدروحوں کو بھگا دیں۔ یسوع مسیح یہ کہہ کر انکار کرتے ہیں کہ''پہلے بچوں کو کھانا کھا لینے دو کیونکہ ان کے ملاپ کا مقصد بچوں سے ان کا کھانا چھین کر اسے کتوں کے آگے پھینکنا نہیں۔''یونانی عورت جواب میں پھر یہ کہتی ہے کہ میز کے نیچے کتے بچوں کی روٹی کے نرم ٹکڑے کھاتے ہیں۔'' اس پر یسوع مسیح کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ اس کی بیٹی کا علاج کرتے ہیں۔ یہاں بچوں سے مراد صرف اسرائیل کے بچے ہیں اور کتوں کے معنی غیر یہودی ہیں خصوصاً شام کے نژاد یونانیوں جیسے دشمن۔ اس نوعیت کے واقعات اور اقوال مارک اور انجیل کے دوسرے نسخوں میں اسی لئے محفوظ کئے گئے ہیں کیونکہ دوسرے

MashalBooks.org

انتقامی نسل پرستانہ اقوال اور افعال کو پوری طرح سے حذف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زبانی بیان کی گئی کئی جاندار روایات کی بنیاد تھیں۔ جیمس پیٹر اور جان جیسے کئی چشم دید غیبی گواہ ابھی تک سرگرم تھے جو عسکریت پسند مسیحائی اور نسل پرستی سے متعلق موضوعات کے مستند ہونے پر مصر تھے۔ اس کے علاوہ مارک پیدائشی طور پر یہودی تھا اور شاید اسی لیے وہ نسلی امتیاز پر مبنی متضاد حالات کا کسی نہ کسی حد تک حامل ہونے سے شاید کبھی چھٹکارا نہ پا سکا۔ اور ان ہی خیالات پر یروشلم کلیسا کے بانیوں کو بھی اصرار تھا۔

یروشلم کے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے جیمس نے اس کے مخالف مبلغ روانہ کئے۔ انہیں ہدایات دین کی وہ عیسائیت میں یہودیت پر مبنی انفرادیت اور امتیاز کا تحفظ کریں۔ ان تبلیغی مشنوں نے پال کی حمایت اور اس کی قائدانہ حیثیت کو متنازعہ قرار دے کر اس کی حمایت کو نقصان پہنچانے میں کامیابی حاصل کی کیونکہ اس نے خود یہ تسلیم کیا تھا کہ اس نے یسوع مسیح کو خواب میں دیکھنے کے سوا کبھی ان کی زیارت نہیں کی۔ اس لئے وہ ان الزامات اور فعلوں سے نکتہ چینی کی زد میں آ گیا۔ اس کے علاوہ اسے بیرونی عبادت گاہوں اور مجلسوں کی حمایت بدستور درکار تھی۔ چنانچہ 59ء میں پیشگی اور غیبی تنبیہہ کے باوجود پال نے فلسطین واپس آنے کا فیصلہ کیا تا کہ اپنے اوپر الزامات لگانے والوں سے نمٹ سکے۔

جیمس کے روبرو پال اس طرح پیش ہوا جیسے ایک ملزم جج کے سامنے ہوتا ہے۔ جیمس نے پال کو ملامت کی اور بتایا کہ فلسطین میں ہزاروں یہودی یسوع مسیح کی حقانیت پر یقین رکھتے ہیں لیکن پھر بھی وہ سب کے سب قانون کے ''جوشیلے مخالف'' ہیں۔ پھر اس نے پال کو حکم دیا کہ وہ ایک وفادار یہودی ہونے کا مظاہرہ کرے اور ثابت کرے کہ اس کے خلاف الزامات بے بنیاد تھے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ پال سات دنوں تک یروشلم کے گرجے میں پاکیزگی کی رسوم میں شامل ہو۔ پال نے یہ مطالبات تسلیم کر لئے جس کے ذریعے اس نے اقرار کیا کہ: 1) آقا کا بھائی جیمس اس وقت عالم عیسائیت کا اعلیٰ ترین لیڈر تھا۔ 2) جیمس اور یہودیوں سے عیسائی بن جانے والے اب بھی ایک ہی گرجے میں عبادت کرتے تھے، ان کے کلیسا علیحدہ اور مختلف تھے۔ 3) یہودی سے عیسائی بن جانے والے اس پر یقین رکھتے تھے کہ یسوع مسیح، داؤد کے ساتھ معاہدے کے مطابق یروشلم کو یہودیوں کی مقدس سلطنت کا مرکز بنانے کے لیے پھر لوٹ آئیں گے۔ اور 4) وہ سب لوگ جو اپنے

MashalBooks.org

گناہوں پر نادم ہو کر یسوع مسیح اور یہودا پر ایمان لائے ہیں نجات کے حصول میں فوقیت حاصل ہوگی۔

یہودیوں کے قومی اہداف سے وفاداری کا جو عہد پال نے کیا تھا اس کا دورانیہ مختصر کر دیا گیا، بلاشبہ ایسا اس پر ظلم اور تشدد کے ذریعے کیا گیا۔ ایشیا سے آئے ہوئے زائرین کے ایک گروہ نے اسے پہچان لیا۔ اس کے گرد ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ اسے گھسیٹ کر گرجے سے باہر لایا گیا اور اس کی مار کٹائی شروع ہوگئی جس سے وہ ادھ موا ہوگیا۔ اس موقع پر رومن محافظ گارڈ کے کپتان کی بروقت مداخلت نے پال کو بچایا۔ بڑے پادریوں نے اسے عدالت کے کٹہرے میں لاکھڑا کیا۔ عدالت کے فیصلے میں بھی وہ موت سے بال بال بچا۔ اس کے خلاف مزید سازشیں کی گئیں۔ لیکن بالآخر اس نے فلسطین سے بچ نکلنے کی راہ نکال لی اس نے اپنی روم کی شہریت کا سہارا لیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس کے خلاف مقدمات کی سماعت رومنوں کو کرنی چاہیے یہودیوں کو نہیں۔ چنانچہ اسے روم بھجوا دیا گیا جہاں اسے گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کا کیا انجام ہوا؟ اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالب امکان یہ ہے کہ اسے 64ء میں شہید کر دیا گیا جب شہنشاہ نیرو نے روم کی زبردست آتشزدگی کا الزام محل کے قریب کچی آبادی کے مکینوں پر لگایا جو خون کے پیاسے نئے متشدد فرقے کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ فرقہ ان یہودیوں کا تھا جس کے ارکان ''بنی نوع انسان کے دشمن'' تھے (نیرو کے دشمنوں کے مطابق آگ نیرو نے خود لگائی تھی۔)

پال کی موت کے بعد فلسطین میں بھرپور طور پر جنگ چھڑ گئی جو اس کے لیے بعد از وقت تھی۔ اس کے چھوڑے گئے سیاق وسباق میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ 70ء کے آنے تک فلسطین میں یہودی نژاد عیسائیوں کے مادری کلیسا کو سمندر پار کی عیسائی برادریوں پر حاصل بالادستی باقی نہ رہی۔ سقوط یروشلم کے نقصان اور صدمے سے اگر کسی نہ کسی طرح کسی مفہوم میں ان کا جانبر ہونا مان بھی لیا جائے تو بھی وہ کوئی نمایاں قوت نہ رہے تھے 73-68ء کے دوران جاری رہنے والا طویل انقلابی دور سمندر پار کے یہودیوں اور رومنوں کے مابین میں بڑی تلخی پیدا کر گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ فسادات اور کشیدگی اور یہودیوں کی شکستوں کے ذمہ دار مملکت کے کٹھ پتلی حکام پر بھی سنگ باری کا سبب بنے۔

71ء میں ویسپاسین اور اس کے بیٹے ٹیٹس نے فتح کا ایک عظیم الشان جلوس نکالا جس کی یادگار کے طور پر روم میں ''ٹیٹس کی محراب'' بنائی گئی۔ اس جلوس میں یہودی قیدیوں اور ان کے تباہ شدہ سامان کی نمائش گلی کوچوں میں پریڈ کے ذریعے کی گئی اور یروشلم کے جوشیلے اچکوں کے آخری کمانڈر سائمن بن گیور اس کو اس ہجوم میں پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد ویسپاسین اپنی قلمرو میں موجود یہوودیوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا۔ ان کی آزادیوں کو محدود کر دیا اور ان کے گرجوں کا ٹیکس سرکاری خزانوں کو منتقل کر دیا۔ پہلی صدی کے بقایا عرصے کے دوران میں یہودی ثقافت اور یہودیت پرستی کی مخالفت رومن زندگی اور معاشرت کا مسلم اصول بن گئی۔ اس معمول کی شدید مخالفت بھی ہوئی اور حکم عدولی بھی۔ ہنگامہ، شورش نافرمانی اور بغاوت کو کچلنے کے لیے بے پناہ تشدد کیا گیا جس کا نتیجہ دوسری فیصلہ کن جنگ کی صورت میں نکلا 135ء میں بارکوچوا کی قیادت میں لڑی گئی۔

مارک نے جس مؤثر انداز میں یروشلم میں گرجے کی تباہی کو یسوع مسیح کے قاتلوں کی سزا کا ذریعہ قرار دیا ہے اس سے بریڈن اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ انجیل کا پہلا نسخہ تھا جو نوعیت کے اعتبار سے دوسروں کے لیے ایک نمونہ تھا۔ یروشلم کے زوال کے بعد عوام میں مرتب کیا گیا جیسا کہ بریڈن کا کہنا ہے یہ غالباً 71ء کی فتح کے جشن کی تقریبات کے براہ راست ردعمل کے طور پر تجویز کیا گیا۔

بالآخر وہ مرحلہ آن پہنچا جب ایک ''امن پسند مسیحا'' ہونے کے مسلک کی مقبولیت کے لیے حالات انتہائی سازگار تھے۔ اب یہودی نژاد عیسائی غیر یہودی کافروں سے عیسائی بننے والوں سے بخوشی ملتے جلتے تاکہ رومنوں کو یقین دہانی کرائی جا سکے کہ ان کا مسیحا ان جوشیلے راہزن (لڑاکے اور فسادی) مسیحاؤں سے مختلف تھا جو جنگ کا سبب بنے تھے اور جو اب بھی مشکلات پیدا کیے جا رہے تھے، یعنی یہودیوں کے برخلاف عیسائی بے ضرر اور امن پسند تھے جن کی کوئی دنیاوی اور غیر مذہبی امنگیں یا عزائم نہیں تھے۔ عیسائیوں کی خدائی حکومت سے مراد اس جہان کی حکومت نہیں تھی۔ عیسائیوں کی نجات موت کے بعد قبر کی ابدی زندگی میں تھی۔ عیسائی مسیحا کی موت بنی نوع انسان کے لیے ابدی زندگی لانے کی غرض سے تھی۔ اس کی تعلیمات رومیوں کے لیے نہیں بلکہ صرف یہودیوں کے لیے خطرے کا باعث تھیں۔ رومن یسوع مسیح کی موت سے بالکل بری الذمہ تھے۔ وہ یسوع مسیح کی موت

کے لیے موردِ الزام نہیں تھے۔ یہودیوں نے اکیلے ہی انہیں مارا تھا اور پونٹیس پائیلیٹ بے بس ہو کر ساتھ کھڑا تھا جو مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔

مسیحا کے پُرامن ہونے کا راز میدانِ کارزار اور دو فیصلہ کن زمینی جنگوں کے مابعد نتائج و حالات میں مضمر تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں مسیحا کے امن پسند ہونے کا مسلک مقبولِ عام نہ ہوتا اگر جنگ کا نتیجہ تاریکی کے بیٹوں کے خلاف ہوتا۔

عیسائیت کا نیا مذہب اختیار کرنے والوں میں اہم لوگ (اگر تعداد کے لحاظ سے نہیں تو اثر و رسوخ کے اعتبار سے) یقیناً شہری علاقوں کے وہ یہودی باشندے تھے جو بحیرہ روم کے پورے مشرق میں پھیلے ہوئے تھے۔ قصے کہانیوں اور روایات کے برعکس عیسائیت کو اجڈ اور گنوار دیہاتیوں اور غلاموں پر مشتمل عوام میں جو مملکت کی آبادی کا بڑا حصہ تھے کوئی کامیابی یا ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ جیسا کہ مؤرخ سالوہیرن کا کہنا ہے کسی پگاس (پگاس جو لاطینی زبان میں اجڈ دہقان کا متبادل ہے) کے نزدیک عیسائی ''کافر'' کا ہم معنی تھا۔ عیسائیت نمایاں طور پر شہری پناہ گزین نسلوں کا مذہب بن گئی۔ ''شہروں میں جہاں یہودی عموماً آبادی کا ایک تہائی حصہ یا اس سے زیادہ ہوتے تھے وہاں صیہونیت کی اس نئی شکل کے پیروکار فاتحانہ انداز میں آگے بڑھتے گئے۔''

ایسے یہودی جو یہودی رہے اور مذہب تبدیل نہیں کیا وہ عیسائی ہو جانے والے یہودیوں کی نسبت رومیوں کی ایذا رسانی اور ظلم و ستم کا زیادہ نشانہ بنے۔ عیسائیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر شاہی اور سامراجی جور و ستم کا دور نیرو کے زمانے سے شروع نہیں ہوا بلکہ اس کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ 150ء کے بعد اس وقت تک چونکہ وہ شہری علاقوں میں مرتکز ہو چکے تھے، رومیوں کے بالائی طبقوں تک رسائی پا چکے تھے، معاشرتی بہبود کے مؤثر پروگراموں پر عمل پیرا تھے اور مالی لحاظ سے ایک خود مختار بین الاقوامی ادارے کا قیام ماہر منتظمین کی زیرِ نگرانی عمل میں لا رہے تھے، اس لیے عیسائیوں کے گرجے ایک دفعہ پھر رومن امن و امان کے لیے سیاسی خطرہ بن چکے تھے۔ وہ ریاست کے اندر ریاست کا درجہ پا چکے تھے۔

مجھے ان دنیاوی حالات و واقعات کو گنوانے سے گریز کرنا ہوگا جن کے نتیجے میں روم کی سلطنت کا مذہب بالآخر عیسائیت قرار پایا لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب شہنشاہ

MashalBooks.org

کانسٹنٹائن نے اس عظیم پیش قدمی کی ابتداء کی اس وقت تک عیسائیت کا مسلک ''امن پسند مسیحائی'' والانہیں رہ گیا تھا۔ کانسٹنٹائن نے 311ء میں عیسائیت اختیار کی جب وہ کوہ ایلپس پر چھوٹی سی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ تھکاوٹ کی حالت میں روم پہنچتے ہوئے اس نے خواب میں صلیب کے نشان کو سورج پر ایستادہ دیکھا اور صلیب پر یہ الفاظ دیکھے ''ان ہاک سگنونکس'' جن کا مطلب تھا ''اس نشان سے تم فتح پاؤ گے۔'' یسوع مسیح کانسٹنٹائن پر طلوع ہوئے اور اسے ہدایت کی کہ وہ اپنے امتیازی فوجی جھنڈے کو صلیب کے نشان سے مزین کرے۔ اس نئے عجیب وغریب پرچم کو تھامے اور اس کے سایہ تلے کانسٹنٹائن کی سپاہ کو ایک فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اس فوجی لشکر نے دوبارہ سلطنت حاصل کر لی اور ساتھ ہی یہ ضمانت بھی کہ امن پسند مسیحا کی صلیب کا نشان (ریڈ کراس) مر جانے والے کروڑوں عیسائی سپاہیوں اور ان کے دشمنوں کے سروں پر ہمیشہ لہراتا رہے گا۔

☆☆☆

MashalBooks.org

اڑن کھٹولے اور عیش ونشاط کی محفلیں

جیسا کہ ''بڑے آدمیوں'' نے ہمیں ''مسیحاؤں'' کی عملی اور انفرادی اہمیت کو سمجھنے میں مدد دی اور اب، کہ ہمیں مسیحاؤں کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم ہے تو ہم جادوگروں کی انفرادیت اور راہمیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ پائیں گے۔ لیکن میں آپ کو ایک دفعہ پھر یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا تعلق واضح اور بظاہر فوری طور پر سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کئی ابتدائی معاملات پہلے سمجھ لینے چاہئیں تا کہ ان کا تعلق واضح کیا جا سکے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ پندرھویں اور سترھویں صدی کے درمیان میں یورپ میں پانچ لاکھ لوگوں کو جادوگری کا مجرم قرار دے کر انہیں جلایا اور موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ ان کے جرم کیا تھے۔ شیطان کے ساتھ معاہد، جھاڑوؤں پر سوار ہو کر طویل فاصلوں کا ہوائی سفر ''سباطس'' میں غیر قانونی اکٹھ۔ شیطان کی پرستش، شیطان کی دم کے نیچے اس کا بوسہ لینا، مادہ ملعونوں کا ٹھنڈے یخ بسہ آلہ تناسل والی ملعون اور خبیث روحوں کے ساتھ جنسی اختلاط اور شیطان مردوں کی بھیانک شکل کی چڑیلوں سے مباشرت وغیرہ۔

ان کے علاوہ عام اور معمولی الزامات بھی اکثر شامل کر دیئے جاتے تھے مثلاً پڑوسی کی گائے کو مارنا۔ طوفان بادوباراں لانا، فصلوں کو تباہ کرنا، چوری کرنا اور چھوٹے بچوں کو کھانا وغیرہ لیکن کئی جادوگرنیوں کو اس کے علاوہ کہ وہ جادوگروں اور جادوگرنیوں کے جشن نیم شب میں رنگ رلیاں منانے کے لیے ہوا میں اڑ کر گئیں اور کسی جرم میں سزا نہیں ہوتی تھی۔

میں چاہتا ہوں کہ جادوگری کے ضمن میں ایک دوسرے سے علیحدہ دو مختلف گتھیوں کو سلجھا کر ان کے فرق کو واضح کر دوں۔ پہلا مسئلہ یہ کہ جادوگرنیوں کے جھاڑوں پر سوار ہو کر ہوا (فضا) میں پرواز کرنے پر کسی شخص کا یقین کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس کے علاوہ اس سے بالکل الگ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی کے دوران میں محض تصویر پر مبنی یہ گمان لوگوں میں اتنے مقبول عام کیوں ہو گئے؟ میرا خیال ہے کہ ان دونوں مخمصوں کا سادہ اور آسان حل تلاش ہو سکتا ہے۔ آیئے ہم آغاز ا وضاحت پر غور سے کرتے ہیں کہ یہ جادوگرنیاں کیوں اور کیسے اڑ کر محفل نیم شب میں رنگ رلیاں منانے کے لیے شامل ہوتی تھیں۔ اعتراف جرم کی بہت سی مثالوں کی موجودگی کے باوجود ''اپنے منہ میاں مٹھو' بننے والی جادوگرنیوں کے حقائق سے متعلق ریکارڈ (کیس ہسٹری) سے معلوم نہیں ہو سکا۔ کئی مؤرخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ سارا انوکھی باتوں کا مرقع ...... شیطانی معاہدہ، اڑن طشتریوں کے ذریعے پرواز اور چڑیلوں کا رنگ رلیاں منانے کا جشن، جادوگرنیوں کی نہیں بلکہ انہیں نذر آتش کرنے والوں کی ذہنی اختراع تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ کئی ملزم جادوگرنیوں کو مقدمے کا سامنا کرنے سے پہلے اپنے جادوگرنیاں ہونے کا احساس موجود تھا اور وہ پر جوش انداز میں یقین رکھتی تھیں کہ وہ ہوا میں اڑ کر شیطانوں کے پاس مباشرت کے لئے جا سکتی تھیں۔

جہاں تک اقرار جرم کا تعلق ہے اس میں قباحت یہ تھی کہ بالعموم یہ اقرار جرم ملزمہ جادوگرنی پر تشدد کے دوران میں اس سے کرایا جاتا تھا۔ یہ تشدد اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک وہ یہ اقرار نہ کر لیتی کہ اس نے ابلیس کے ساتھ معاہدہ کیا تھااور وہ اڑ کر ''سباطس'' میں جادوگروں اور جادوگرنیوں کی نیم شب رنگ رلیوں میں شریک ہونے گئی تھی۔ یہ تشدد پھر بھی جاری رہتا تا آنکہ جادوگرنی ان دوسرے لوگوں کے نام نہ بتا دیتی جو اس محفل طرب میں شریک تھے۔ اگر کوئی جادوگرنی اپنے اقرار جرم سے مکرنے کی کوشش کرتی تو تشدد میں مزید اضافہ کیا جاتا تا آنکہ وہ اپنے پہلے اعتراف جرم کی مزید توثیق نہ کر دیتی۔ اس صورت حال میں جادوگری کے الزام میں ملوث کسی فرد کے لیے دو ہی راستے ہوتے تھے یا تو وہ اقرار جرم کے ذریعے زندگی کو داؤ پر لگا کر موت کو گلے لگانے کا خطرہ مول لے اور یا پھر بار بار تشدد کا نشانہ بنائے جانے کے لیے تیار رہے۔ اکثر افراد موت سے ہم

کنار ہونے کے امکان کو قبول کر کے اقبال جرم کو ترجیح دیتے۔ گنہگار جادوگرنیوں کو ان کے اس مفاہمانہ طرزِ عمل اور رویے کے صلے میں انہیں آگ میں جلانے سے پہلے ان کا گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا تھا۔

مؤرخین نے جن سینکڑوں واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک کو میں نمونے کے طور پر بیان کروں گا جسے جادوگرنیوں کے یورپی مؤرخ چارلس ہنری لی نے تحریر کیا ہے۔ یہ واقعہ 1601ء میں اس علاقے کے ایک شہر ''آفیزنگ'' میں پیش آیا جو علاقہ بعد میں مغربی جرمنی بنا۔

دو آوارہ خانہ بدوش عورتوں نے تشدد کے نتیجے میں اپنے جادوگرنیاں ہونے کا اعتراف کیا۔ جب انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ان دوسرے لوگوں سے متعلق جنہیں انہوں نے محفل عیش ونشاط میں شریک دیکھا تھا بتائیں، تو انہوں نے ایک بیکری والے کی بیوی ''ایلسی گونز'' کا نام لیا۔ ایلسی گونز 31 اکتوبر 1601ء کو تفتیش کرنے والوں کے سامنے پیش کی گئی۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو غیر ضروری مصیبت اور تکلیف میں مبتلا نہ کرے، لیکن وہ اپنے انکار پر ثابت قدمی سے قائم رہی۔ آخر اس کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ کر اس کی کلائیوں کو رسّے میں جکڑا گیا اور زمین سے اونچا لٹکایا گیا۔ اذیت کے اس طریقے کو ''سٹراپیڈو'' کہا جاتا تھا۔ اس پر اس نے چلانا شروع کر دیا کہ وہ اقرار کرتی ہے اور درخواست کی کہ اسے نیچے اتارا جائے۔ جب اسے نیچے اتارا گیا س تو اس نے جو کچھ کہا وہ یوں تھا: ''اے باپ انہیں معاف کر دو کیونکہ انہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔'' ایذا رسانی دوبارہ شروع کی گئی لیکن اس کا نتیجہ اس کے بے ہوش ہو جانے کی صورت میں نکلا۔ اسے جیل لے جا کر ایذا رسانی کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ 7 نومبر کو اسے تین دفعہ سٹراپیڈو کے ذریعے جھٹکے دیئے گئے۔ تیسرے جھٹکے پر اس نے چیخ کر کہا کہ وہ برداشت نہیں کرسکتی۔ اسے نیچے اتارا گیا اور اس نے تسلیم کیا کہ اس نے ایک بدروح سے محبت کا لطف اٹھایا تھا۔ تفتیشی عملہ اس سے مطمئن نہ ہوا اور مزید کچھ جاننے کا خواہاں ہوا۔ انہوں نے اس کے ساتھ بتدریج زیادہ وزن باندھ کر پھر لٹکا دیا اور اسے سچ سچ بات بتانے کی ترغیب دی جب اسے پھر زمین پر نیچے لایا گیا تو ایلسی نے بہ اصرار کہا کہ اس کے اقرار جرم جھوٹ پر مبنی تھے، جو اس نے تکلیف اور آزار سے بچنے کے لیے بولے تھے اور سچ یہ تھا کہ وہ بے گناہ تھی۔ اس دوران محتسبوں

نے ایلسی کی بیٹی اگاتھی کو بھی گرفتار کر لیا اور اگاتھی کو اسی کوٹھڑی میں لے جا کر اسے مارا پیٹا یہاں تک کہ اس نے یہ اقرار کر لیا کہ وہ اور اس کی ماں دونوں جادو گرنیاں تھیں اور روٹی کی قیمت میں اضافے کے لیے فصلوں کو پیداوار سے محروم بھی انہوں نے کیا تھا۔ جب ایلسی اور اگاتھی دونوں کو اکٹھے لایا گیا تو بیٹی اپنے بیان کے اس حصے سے منحرف ہوگئی جس میں اس نے ماں کو ملوث قرار دیا تھا۔ لیکن جونہی محتسبوں کے روبرو وہ اکیلی رہ گئی اس نے اپنے اقرار کو پھر من وعن دہرایا اور التجا کی ماں کے روبرو اسے دوبارہ طلب نہ کیا جائے۔

ایلسی کو ایک اور قید خانے میں لے جایا گیا اور اس کے انگوٹھوں کو مروڑ کر مطلب براری کی کوشش کی گئی۔ ہر درمیانی وقفے میں اس نے اپنی بے گناہی کا اعادہ کیا لیکن بالآخر اس نے اس حد تک پھر تسلیم کر لیا کہ ایک بدروح اس کی عاشق تھی۔ یہ بدروح جن تھا لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ 11 دسمبر کو تشدد کے دوران میں وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے گئے اور وہ چلائی تا کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

لیکن جونہی تشدد میں وقفہ آتا وہ اپنے اقبال جرم سے مکر جاتی۔ آخرکار اس نے تسلیم کر لیا کہ اس کا عاشق شیطان (بدروح) اسے دو دفعہ پرواز کے ذریعے محفل عیش ونشاط (سباط) میں لے کر گیا تھا۔ اس سے پوچھ گچھ کرنے والوں نے اس سے یہ بتانے کا مطالبہ کیا کہ وہاں ان محفلوں میں اس نے کن لوگوں کو دیکھا تھا۔ ایلسی نے دو آدمیوں کے نام بتائے ......فراؤ سپائز اور فراؤ وائز۔ اس نے وعدہ کیا کہ بعد میں وہ مزید ناموں کا انکشاف کرے گی۔ لیکن 13 دسمبر کو وہ اسی پادری کی کوششوں کے باوجود جس نے اگاتھی سے حاصل ہونے والی اضافی شہادت کا حوالہ دیا۔ اپنے اقبال جرم سے مکر گئی۔ اس سے پوچھ گچھ کرنے والوں نے اسے بتا دیا کہ وہ اس پر اس وقت تک تشدد جاری رکھیں گے جب تک وہ سچ نہیں بتا دے گی۔ اداس ہوگئی لیکن اپنی بے گناہی پر اڑی رہی۔ اس نے اپنا پہلا اقبال جرم (موقف) پھر دہرایا لیکن بہ اصرار کہا کہ اسے فراؤ سپائز اور فراؤ وائز کی شناخت میں غلطی ہوئی تھی۔ وہاں اتنا زیادہ ہجوم اور بدنظمی تھی کہ کسی کی پہچان مشکل تھی۔ بالخصوص اس لئے کہ وہاں موجود سب لوگوں نے اپنے چہرے ممکن حد تک ڈھانپ رکھے تھے۔ مزید ایذا رسانی کی دھمکی کے باوجود اس نے اپنی بے گناہی کے حق میں حلف اٹھانے سے انکار کیا۔ ایلسی گونر 21 دسمبر 1601ء کو جلا کر ہلاک کر دی گئی۔ اوپر بیان کی گئی اذیتوں کے علاوہ اور بھی کئی

Mashalbooks.org

طریقوں اور حربوں سے جادوگرنیوں پر تشدد روا رکھا جاتا تھا مثلاً تیز نوکیلی کرسیوں کا استعمال، نیچے سے آگ جلا دینا، کاٹنے والے جوتوں، سوئیوں والی پیٹیوں، دہکتی ہوئی سرخ استریوں کے ذریعے، اس کے علاوہ فاقہ زدگی اور بے خوابی میں مبتلا رکھ کر۔

جادوگرنیوں کے خبط سے متعلق اس دور کے ایک نقاد ''جان متھاس'' نے لکھا تھا کہ وہ خوش قسمت ہوگا اگر وہ اپنے ذہن سے ان یادوں کو فراموش کر سکتا جو اس نے ایذا رسانی کے ایوانوں میں دیکھی تھیں:

> ''میں نے زبردستی سے کاٹے گئے اعضا دیکھے۔ آنکھیں سر سے نکلی ہوئی، پاؤں ٹانگوں سے کٹے ہوئے، پٹھے جوڑوں سے مروڑے ہوئے، کندھے کی ہڈیاں اپنی جگہوں سے ہلی ہوئیں، پتلی نسیں سوجی ہوئیں اور موٹی رگیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والا کبھی اوپر اٹھایا ہوا، کبھی نیچے گرایا ہوا، کبھی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر، یہ سب کچھ دیکھا۔ میں نے سزا دینے والے کو کوڑے برساتے، بیدزنی کرتے، پنجوں سے شکنجے میں جکڑتے، سوئیاں چبھوتے، گندھک سے جلاتے، غرضیکہ ہر قسم کے عذاب میں مبتلا کرتے دیکھا۔ مختصراً یہ کہ میں شہادت دے سکتا ہوں، بیان کر سکتا ہوں، مذمت کر سکتا ہوں کہ انسانی جسم سے کیا کیا زیادتیاں کی گئیں۔''

جادوگری کی دیوانگی کے پورے عرصے کے دوران میں تشدد کے ذریعے کسی بھی اقبال جرم کی تصدیق سزا سنائے جانے سے قبل ضروری تھی۔ چنانچہ جادوگری سے متعلق سب مقدمات میں یہ معمول کا حصہ تھا کہ ''فلاں فلاں نے برضا و رغبت تشدد کے زیر اثر اپنے اقبال جرم کی توثیق کی ہے۔'' لیکن جیسا کہ ''میفر تھ'' کہتا ہے کہ یہ اقبال جرم اصلی اور بناوٹی جادوگرنیوں میں تمیز کرنے کے سلسلے میں بالکل فضول اور بے وقعت تھے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ ''اس کا کیا مطلب اور کیا معنی ہیں جو کسی کو اس قاعدے کلیے کا سامنا کرنا پڑے کہ مارگریٹا نے ججوں کے بینچ کے سامنے بلا جبر و اکراہ اپنے اس جرم کے اقبال کی توثیق کی ہے جو اس نے تشدد کے زیر اثر کیا تھا؟''

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب ناقابل برداشت تشدد اور ظلم کے تحت اس نے اقبال

جرم کیا تو محتسب نے اس سے کہا کہ ''مجھے بتاؤ کہ اگر تمہارا ارادہ اس اقبال جرم سے انکاری ہونے کا ہے جس کا تم نے اب اقرار کیا ہے تو مجھے ابھی بتاؤ۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا، لیکن اگر تم نے عدالت کے سامنے اس کی تصدیق سے انکار کیا تو تم نے میرے پاس واپس آنا ہے اور تم دیکھو گے کہ میں نے اب تک تم سے صرف مذاق کیا ہے۔ پھر میں تم سے وہ سلوک کروں گا کہ جسے دیکھ کر پتھر کے بھی آنسو ٹپک پڑیں گے۔'' جب ''مارگریتھا'' کو عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس کے پاؤں میں بیڑی ہوتی ہے اور ہاتھ اس طرح جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ خون بہہ نکلتا ہے۔ اس کے دونوں طرف جیلر اور محتسب ہوتے ہیں اور پیچھے مسلح حفاظتی دستہ۔ اقبال جرم کو پڑھنے کے بعد محتسب اس سے پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس کی توثیق کرتی ہے یا نہیں؟

مؤرخ ''ہف ٹریور روپر'' کا اصرار ہے کہ کئی اقبال جرم ''عوامی مختار'' لوگوں کے روبرو تشدد کی کسی شہادت کے بغیر کئے گئے لیکن اپنی رضا و رغبت پر مبنی بے ساختہ اعتراضات کو بھی ان دہشت آمیز اختیارات کی روشنی میں پرکھنا چاہیے جو محتسبوں اور ججوں کو حاصل تھے۔ جادوگری کے محکموں کا یہ مسلمہ معمول تھا کہ وہ پہلے ایذا رسانی کی دھمکی دیتے، بعد میں ان آلات کی نمائش کرتے، ملزمہ ان تینوں مرحلوں کے دوران میں کسی بھی وقت اقبال جرم کر لیتی تھی۔ مقدمے کی عدالت میں سماعت سے پہلے اقبال جرم کے لیے دی جانے والی دھمکیوں کے اثر پر شائد توجہ نہیں دی جاتی۔ ان دھمکیوں سے بے اعتنائی کے باعث آج ہمیں وہ اقبال جرم بے ساختہ اور اپنی مرضی کے مطابق برجستہ محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے اصلی جادوگرنیوں کے سچے اعترافات سے انکار نہیں، لیکن مجھے موجودہ دور کے ماہرین کا اس پر اصرار کج روی اور ہٹ دھرمی کا منظر لگتا ہے کہ جادوگری کے ضمن میں تحقیقات کے دوران میں تشدد کی کارروائیاں معمولی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ محتسب اس وقت تک ہرگز مطمئن نہ ہوتے جب تک وہ اقبالی جادوگرنیاں دوسرے مشتبہ افراد کے نام ظاہر نہ کرتیں جنہیں بعد میں معمول کے مطابق مقدمے میں ملوث کیا جاتا اور تشدد کا شکار بنایا جاتا۔

میفرتھ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک بوڑھی عورت نے تین دن تک تشدد برداشت کیا تھا۔ بعد میں اس نے اس آدمی کے سامنے جس کو اس نے نامزد کیا تھا اقرار کیا کہ میں نے تجھے رنگ رلیوں کی محفل میں کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اپنے اوپر ہونے

MashalBooks.org

والے تشدد کے خاتمے کے لیے میں نے کسی نہ کسی الزام پر دھرنا تھا۔میرے دل میں تمہارا خیال آیا کیونکہ جب مجھے جیل لے جایا جا رہا تھا تو تم مجھے ملے تھے اور کہا تھا کہ تم میرے مجرم ہونے کا کبھی یقین نہیں کر سکتے تھے میں تم سے معافی چاہتی ہوں لیکن اگر مجھ پر پھر تشدد ہوا تو پھر بھی تمہیں ملوث کروں گی۔ اس عورت کو پھر اڈے پر لے جایا گیا اور اس نے اسی اصل اعتراف کو صحیح مان لیا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جادوگری کے جنون نے کیسے اتنے زیادہ لوگوں کو نشانہ ستم بنایا۔ اس سے قطع نظر کہ کتنے لوگ سچ مچ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ اڑ کر عشرت کدے پہنچے تھے۔

درحقیقت دنیا کے ہر معاشرے میں جادوگری کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے،لیکن جادوگری سے وابستہ یورپی جنون دوسرے علاقوں میں اس قسم کے خبطوں سے زیادہ خطرناک، زیادہ عرصے تک جاری رہنے والا اور زیادہ تعداد میں لوگوں کے نشانہ ظلم وستم بننے کا موجب بنا۔ جب پسماندہ معاشروں میں جادوٹونے کا شک وشبہ پایا جائے تو کسی کے قصوروار یا بے قصور ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اسے تکلیف دہ آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔لیکن جہاں تک جادوگرنیوں کے معاملے میں مجھے علم ہے، ان کو دوسری جادو گرنیوں کی شناخت کے لیے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جاتا۔

خود یورپ میں بھی 1480ء کے بعد تشدد کا اس صورت میں آغاز ہوا۔ 1000ء سے قبل کسی کو اس بنا پر پھانسی نہیں دی جاتی تھی کہ عیسائیوں نے اسے شیطان کے ساتھ دیکھا جانے کا مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر جادوگرنی ہونے یا برائی کے لیے مافوق الفطرت قوت کا حامل ہونے کا الزام تھوپتے رہتے تھے اور کئی عورتوں کے متعلق یہ قیاس آرائیاں عام تھیں کہ وہ ہوا میں سفر کر سکتی اور فضا میں کافی تیز رفتاری سے بڑے طویل فاصلے طے کر سکتی تھیں، لیکن مجاز حکام نے کبھی منظم طریق سے ایسی جادوگرنیوں کو پکڑنے اور ان سے اپنے جرم کا اعتراف کرانے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ دراصل کیتھولک چرچ کے مطابق اس پر اصرار کیا جاتا تھا کہ جادوگرنی قسم کی کسی مخلوق کا جو ہوا میں سفر کرتی ہو کوئی وجود نہیں تھا۔ 1000ء میں ایسی پروازوں پر اعتقاد کو کہ وہ فی الواقعی ہوتی تھیں، ممنوع قرار دے دیا گیا، تاہم بعد میں 1480ء میں ان پرازوں سے متعلق عدم اعتماد کی ممانعت کر دی گئی۔ 1000ء میں چرچ کا سرکاری موقف یہ تھا کہ ہوا میں جادوگرنیوں کا سفر محض ایک وہم

تھا جو شیطان کا پیدا کردہ تھا۔ پانچ سو سال بعد چرچ نے قرار دیا کہ جو لوگ اس ہوائی پرواز کو محض ایک وہم کہتے تھے وہ خود شیطان کے ساتھی تھے۔

پرانا نقطۂ نظر ایک دستاویز کی بنیاد پر قابل اعتماد اور نافذ تھا، جسے ''کینن اپسکوپی'' (مخصوص مکتب فکر والی مجلس کلیسا) کا وضع کردہ ضابطہ کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کے حوالے سے جو یقین رکھتے تھے کہ جادوگرنیاں رات کو ہوا میں اڑتی تھیں یہ ضابطہ یوں خبردار کرتا ہے ''بد اعتقاد بے دین ذہن کی سوچ یہ ہے کہ ایسے واقعات روحانی طور پر نہیں ہوتے بلکہ جسمانی طور پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔'' دوسرے لفظوں میں شیطان تمہیں اس وسوسے میں مبتلا کرتا ہے کہ تم دوسرے لوگ رات کو ہوائی سفر پر جانے کا یقین کرنے لگتے ہو۔ لیکن ''درحقیقیت'' نہ تم ایسا کر سکتے ہو اور نہ وہ دوسرے لوگ۔ ''درحقیقت'' کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے مطلب اور حقیقت کی بعد میں دی گئی تشریح کے مابین جو فیصلہ کن فرق پایا جاتا ہے اسے یوں پرکھنا چاہیے کہ وہ افراد جن کے متعلق تم یا تمہارے خواب دیکھنے والے دوسرے ساتھی یقین رکھتے ہوں کہ: وہ تمہارے ساتھ ہم سفر تھے، ان میں سے کسی کو غلط کاری کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ محض ایک خواب ہے کہ وہ تمہارے ساتھ وہاں موجود تھے اور اسی لیے دوسرے لوگ خود سے منسوب کئے گئے ان اعمال کے جواب دہ نہیں ہو سکتے جو وہ تمہیں خواب میں کرتے نظر آئے۔ ہاں یہ (صحیح) ہے کہ خواب دیکھنے والا برے خیالات رکھتا ہے، اس لئے سزا کا مستحق ہے۔ لیکن یہ سزا اس کو جلا ڈالنا نہیں بلکہ اس سے ترک تعلق کی صورت میں ہونی چاہیے۔

مجلس کلیسا کے وضع کردہ اس ضابطے کو معکوس سمت میں نافذ العمل کرنے کا دور کئی صدیاں گزر جانے کے بعد آیا جب جادوگرنیوں کے جسمانی اور روحانی دونوں شکلوں میں ہوائی سفر سے منکر ہونے کو ملحدانہ جرم قرار دیا گیا۔ جب ایسے سفر کی حقیقت نے مسلم حیثیت اختیار کر لی تو اس کا اقرار کرنے والی جادوگرنی سے ان دوسرے لوگوں کے متلعلق (جو محفل عیش وطرب میں شریک تھے) پوچھ گچھ کرنا ناممکن ہوگیا۔ اس موقع پر تشدد ایک ایسے ردعمل کی ضمانت تھا جس کے ذریعے خاطر خواہ نتائج یقینی تھے۔ بہت سے لوگوں کے راز طشت ازبام ہوئے ...... نئے ماڈل کی ایٹمی بھٹیوں کی مانند ہر جلنے والی جادوگرنی مزید دو یا اس سے زیادہ جلنے والے امیدوار پیدا ہونے کا سبب بنتی۔ نظام کو یکساں آسانی سے

MashalBooks.org

چلانے کے لیے اس میں مزید عمدگی، نفاستیں اور لطیف اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ اس نظام کے اخراجات کم رکھنے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے۔ مثلاً جادوگرنی کے خاندان کو مجبور کیا جاتا کہ وہ تشدد کرنے والوں اور پھانسی دینے والوں کی خدمات کے عوضانے کا بل ادا کریں۔ انہیں جلانے کے لیے ایندھن کا بل اور جلائے جانے کے بعد ججوں کے لیے کھانے کی دعوت کے اخراجات کے بل بھی ادائیگی کے لیے دیئے جاتے تھے۔ جادوگرنیوں کو پھانسنے کے لیے مقامی افسران میں کافی جوش وخروش پیدا کیا جاتا تھا کیونکہ انہیں اختیار دیا گیا تھا کہ بازی گری کے سلسلے میں سزا پانے والے کسی فرد کی پوری جائداد کو ضبط کر سکتے تھے۔

جادوگرنیوں کو پکڑنے کے نظام میں بہتری کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں کو پختہ کرنے والے کئی اقدامات تیرھویں صدی کے اوائل میں بروئے کار لائے گئے، لیکن یہ اقدامات جادوگرنیوں پر تشدد کا نہیں تھا بلکہ ناجائز طور پر بنائی گئی ایسی نام نہاد متبرک تنظیموں کے خلاف تشدد کا تھا جو پورے یورپ میں ابھر رہی تھیں اور روم کی اس اجارہ داری کے لیے خطرے کا باعث تھیں جو اسے پادریوں کے لیے مخصوص دسویں حصے (عشر) اور عشائے ربانی سے متعلق مذہبی رسوم کے سلسلے میں حاصل تھی۔ مثلاً تیرھویں صدی تک جنوبی فرانس میں ''البی جینشین'' نے جو ''کتھاری'' بھی کہلاتے تھے ایک طاقتور خودمختار متبرک تنظیم اپنے کلیسا کے ساتھ قائم کر لی تھی جو فرانس کی اشرافیہ پر مشتمل مذہبی اختلاف رکھنے والے گروہوں کی سرپرستی اور تحفظ میں کھلے عام چلتی تھی۔ اس پر یورپ نے ''البی جنشیانو'' کے خلاف جنگ کی صدا لگائی تاکہ جنوبی فرانس کو عیسائیت کے گڑھ کے طور پر محفوظ رکھا جا سکے۔ انجام کار ''البی جنشیانوں'' کو وہاں سے نکال دیا گیا لیکن کئی دیگر گمراہ کن اور ملحد فرقوں مثلاً والڈینیز اور وڈانس نے ان کی جگہ لے لی۔ ان تخریبی تحریکوں سے نمٹنے کے لیے چرچ نے آہستہ آہستہ باز پرسی کی خاطر ایک نیم فوجی مخصوص تنظیم تخلیق کی جس کا بڑا مقصد اور فرض الحاد اور بدعتوں کو نیست ونابود کرنا تھا۔ فرانس، اٹلی اور جرمنی میں باز پرس اور تفتیش سے خائف ہو کر یہ ملحد فرقے زیرزمین چلے گئے، پوشیدہ اور خفیہ ٹھکانے بنائے اور خفیہ میٹنگیں کرنے لگے دشمن کی خفیہ سرگرمیوں کے باعث اپنے مشن کو ناکامی سے بچانے کے لیے تفتیشی حکام نے تشدد کے اختیارات دیئے جانے کی درخواست کی تاکہ ملحدوں کو اپنا جرم تسلیم کرنے اور اپنے شریک جرم ساتھیوں کے نام بتانے پر مجبور کیا جا سکے۔ تیرھویں صدی کے وسط میں انہیں پوپ الیگزینڈر

چہارم نے یہ اختیارات تفویض کر دیئے۔

جہاں ''والڈینیز'' اور واڈانس'' پر تشدد کیا جا رہا تھا وہاں جودوگرنیوں کو پھر بھی پادریوں کی جماعت کے صادر کردہ ضابطے اور فتوے کے تحت تشدد سے استثنیٰ کا تحفظ حاصل تھا۔ جادوگری ایک جرم تھا لیکن جرم الحاد کے زمرے میں نہیں آتا تھا کیونکہ جودوگروں اور جادوگرنیوں کی نیم شبی رنگ رلیوں کی محفلیں مصنوعی اور بے بنیاد تصورات پر مبنی تھیں...... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ باز پرس کے لیے پوپ کی طرف سے تعینات تحقیقاتی عملے کی پریشانی جادوگری سے متعلق کیسوں میں اختیارات کی عدم موجودگی کے باعث بڑھتی چلی گئی۔ ان کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی تھی کہ جادوگری اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے اب ویسی نہیں رہی تھی جیسی ''اپسکوپی'' کا ضابطہ اور فتویٰ نافذ ہونے کے وقت تھی جس کی رو سے جادوگری بے ضرر تھی۔ اب ایک نئی اور انتہائی خطرناک قسم کی جادوگری منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ ایسی جادوگری جو واقعتاً پرواز کے ذریعے محفل عیش ونشاط میں شریک ہوسکتی تھی اور رنگ رلیوں کی یہ محفلیں بالکل دوسرے ملحد فرقوں کی خفیہ میٹنگوں کی طرح تھیں بلکہ ان کی رسومات ملحد فرقوں کی رسومات سے بھی زیادہ نفرت انگیز تھیں۔ دوسرے ملحدوں کی طرح اگر جادوگرنیوں پر بھی تشدد روا رکھا جائے تو ان کے اقبال جرم اور اپنے اعمال کے اعتراف سے پوشیدہ اور در پردہ سازشوں کا وسیع جال منظر عام پر لایا جا سکے گا۔ بالآخر روم ان دلائل کی روشنی میں اپنے موقف سے دست بردار ہوگیا۔ ایک پاپائے روم (پوپ) نے جس کا نام ''انوسینٹ'' (اردو میں بمعنی معصوم) تھا 1484ء میں ایک حکم جاری کیا جس کے ذریعے دو تفتیشی افسران ہینرچ انسٹیٹر اور جیکب سپرینجر کو تفتیش کے سلسلے میں پورے اختیارات استعمال کرنے کا مجاز قرار دیا تا کہ پورے جرمنی سے جادوگری کا صفایا کیا جا سکے۔

انسٹیٹر اور سپرینجر نے اپنے دلائل سے پوپ کو قائل کر لیا اور بعد میں یہی دلائل انہوں نے اپنی کتاب ''ہیمر آف دی وِچز'' (جادوگرنیوں کا ہتھوڑا) میں بھی پیش کیے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے کئی جادوگرنیوں کے متعلق یہ مانا کہ وہ صرف تصور ہی میں ''سباط'' کی رنگ رلیوں کی محفل میں شریک ہوتی تھیں، لیکن اکثر کو وہاں جسمانی طور پر منتقل کیا جاتا تھا۔ ان دونوں میں سے صورت کوئی بھی ہو، بات یکساں طور پر ایک ہی جیسی رہتی ہے کیونکہ جو جادوگرنی خیال ہی خیال میں وہی کچھ اتنے ہی وثوق سے دیکھتی ہے (کہ وہاں کیا ہو رہا

ہے) جیسے وہ جادوگرنی جسے جسمانی طور پر منتقل کیا گیا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں جہاں ایک خاوند قسم کھا کر حلفیہ بیان کرتا ہے، کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بستر میں موجود تھی لیکن دوسرے لوگ اس کے برعکس تصدیق کرتے ہیں کہ وہ نیم شب کی محفل عیش ونشاط میں موجود تھی، وہاں وہ عورت جسے خاوند نے بیوی سمجھا ہوتا ہے اصل میں وہ شیطان ہوتا ہے، جو جو اس کی جگہ سویا ہوتا ہے۔ شائد ''ایپسکو پی'' کے مذہبی ضابطے اور فتوے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا، کہ اڑان محض تصوراتی اور خیالی ہوتی تھی۔ لیکن جادوگرنیاں جو نقصان پہنچا رہی تھیں وہ تو ہرگز کسی تصور یا خیالی وہم کا نتیجہ نہیں تھا۔

''اتنا شقی القلب کون ہوسکتا ہے جو ...... اس ساری جادوگری اور اس سے لگنے والی چوٹوں کو محض تصوراتی پیکر، توہم اور بھوت پریت ہونے پر محمول کرے جبکہ صورت حال اس کے برعکس ہونے کی شہادت ہر شخص کا شعور دے رہا ہو؟ انسانی سوچ میں آنے والی ہر بدقسمتی ...... مال مویشی اور فصلوں کا نقصان، بچوں کی اموات، بیماری، درد اور ٹیسیں، بے وفائی، دغابازی، کفر والحاد، بانجھ پن اور دیوانگی...... یہ سب جادوگری کا کیا دھرا ہیں۔''ہیمر آف دی وِچز'' کے آخر میں جادوگرنیوں کی شناخت، ان پر الزام لگانے، مقدمہ چلانے، تشدد کرنے، جرم ثابت کرنے اور سزا دینے سے متعلق سب امور کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اب جادوگرنیوں پر قابو پانے کا نظام پورے یورپ میں آئندہ دو سو سالوں تک نافذ رہنے کے لیے اپنے سنگین نتائج اور حشر سامانیوں کے ساتھ پروٹسنٹ اور رومن کیتھولک دونوں فرقوں سے وابستہ جادوگرنیوں کے شکاریوں کے لیے سہولت پایہ تکمیل کو پہنچا چکا تھا۔ یوں ہر سال کے آغاز سے لے کر اختتام تک قید ہو جانے والی یا جلا دی جانے والی جادوگرنیوں کی جگہ لینے کے لیے نئے گرفتار شدگان کی آمد لامتناہی سلسلہ جاری رہنے لگا۔

''ایپسکو پی'' کا فتویٰ کیوں منسوخ ہوا؟ اس کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ باز پرس کرنے والے تفتیش کنندگان صحیح تھے۔ جادوگرنیاں رنگ رلیوں کی خفیہ محفلیں سجا رہی تھیں خواہ انہیں ہوا میں پرواز کے لیے ''بروم سٹک'' (جھاڑو) کی سواریاں نہ بھی ملتیں اور یوں وہ دراصل عیسائیت کے لیے اتنے ہی بڑے خطرے کا باعث تھیں جتنی ''ویلڈ ینیشنی'' یا اس جیسی دوسری خفیہ مذہبی تحریکیں تھیں۔

''بروم سٹکس'' (اڑن طشتریوں) کے ذریعے پرواز سے متعلق حالیہ دریافتوں نے

اس نظریے کو غیر معقول اور نا قابل مداخلت قرار دیا ہے۔ معاشرتی تحقیق کے نئے تحقیقی سکول میں پروفیسر میکائل ہارنر نے ثابت کیا ہی کہ یورپی جادوگروں کا تعلق بالعموم جادو اثر تسکین آور علاج اور مرہموں کے استعمال سے تھا۔ اپنے اڑن کھٹولوں کے ذریعے ہوا میں پرواز سے پہلے جادوگر اپنی مالش کرتے تھے ہارنر نے جن مخصوص واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک سترھویں صدی کی ایک ایسی انگلستانی جادوگرنی کا ہے جس نے اقرار کیا کہ ''میٹنگوں میں شرکت کے لیے پرواز سے پہلے وہ اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں کی کلائیوں کی ایسی مرہم سے مالش کرتی ہیں جو انہیں ایک ''روح'' مہیا کرتی ہے، جو سونگھنے میں بے بو ہوتی ہے۔'' دوسری انگریز جادوگرنیوں نے یہ اطلاع فراہم کی کہ یہ تیل (مرہم) رنگ میں سبزی مائل اور ایک پر کے ذریعے اسے پیشانی پر لگایا جاتا تھا۔ پہلے سے موجود ایک روئداد میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جادوگرنی اس مرہم کو پہلے ایک لاٹھی پر لگاتی جس کے بعد وہ اپنی حسب خواہش کبھی دلکی چال سے اور کبھی سرپٹ دوڑتی ہوئی چلتی۔ ہارنر نے پندرھویں صدی کے دوران میں ایک اطلاعاتی ذریعے کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ لاٹھی اور بدن دونوں کو مرہم لگائی جاتی تھی۔ ''وہ ایک لاٹھی کو مالش کرنے کے بعد اس پر سوار ہو جاتے ہیں یا خود اپنے بازوؤں کے نیچے اور بالوں والی دوسری جگہوں کی مالش کرتے ہیں۔'' ایک اور ذریعے کے مطابق جادوگر مرد ہوں یا عورتیں جن کا شیطان کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے، اپنے بدن پر مرہم کا لیپ کرنے اور کوئی کلام پڑھنے کے بعد انہیں رات کو کہیں دور دراز کے علاقوں میں لے جایا جاتا ہے۔

سولھویں صدی کے ایک ڈاکٹر ''اینڈرس لاگیونا'' نے جو ''لارائن'' میں معالج تھا ایک جادوگرنی سے ایک بوتل کی برآمدگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ''ایک سبز رنگ کی مرہم اس جار میں نصف حصے تک بھری ہوئی تھی جس سے وہ اپنی مالش کر رہی تھی۔ مرہم اتنی بدبودار داور تلخ وترش تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کئی انتہائی زہریلی اور خواب آور جڑی بوٹیوں کا مرکب تھی۔ مثلاً ہیملاکر، نائٹ شیڈ، ہین بین اور مینڈریک وغیرہ۔ لاگوینا نے اس مرہم سے بھرا ہوا ایک کنستر حاصل کر لیا اور ایک جلاد کی بیوی پر اسے آزمایا۔ اس عورت پر سر سے پاؤں تک مرہم کا لیپ چڑھا دیا۔ جس کے نتیجے میں ''وہ عورت اچانک سوگئی اور کھلی آنکھوں کے ساتھ گہری نیند میں ایسی مستغرق ہوئی کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے کیسے جگاؤں۔ (وہ

نظر بھی بھنے ہوئے خرگوش کی مانند آرہی تھی) بالآخر لاگیونا جب اسے جگانے میں کامیاب ہو گیا اس وقت وہ 36 گھنٹے سو چکی تھی۔ اس نے شکایت کی کہ ''آپ نے مجھے ایسے ناموزوں وقت پر کیوں جگا دیا؟ میں دنیا بھر کی مسرتوں اور شادمانیوں میں محو تھی۔'' پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر مسکرائی جو پاس ہی کھڑا تھا اور کہا ''تم سے مجھے جلادوں والی بدبو آرہی ہے۔ اور اے دغاباز اور بدمعاش مکار تمہیں معلوم ہو کہ میں نے تمہیں ایک غیر عورت کے ساتھ مباشرت کرتے دیکھا ہے جو عمر میں تم سے کافی جوان اور شکل میں خوبرو حسینہ تھی۔''

ہارنر نے کئی مختلف لوگوں کے ایسے تجربات کو جن میں مرہموں کا استعمال خود جادو گروں پر کیا گیا تھا یک جا کر دیا۔ ہر تجربے میں مرہم کا لیپ کروانے والے افراد پہلے گہری نیند سو گئے اور جب انہیں جگایا گیا تو انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ایک دور دراز سفر پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے مرہم کے اس راز سے کافی تعداد میں لوگ واقف تھے جو جادو گری کے خبط میں مبتلا دور میں زندہ تھے۔ گو کہ جدید دور کے مؤرخین نے بالعموم اس سے اغماض برتنے کی کوشش کی ہے یا اس کا کم سے کم ذکر کرنے پر مائل رہے ہیں، اس سلسلے میں بہترین چشم دید شہادت پر مبنی بیان ''گلیلیو'' کے ساتھی ''گیامباتیا ڈیلا پورٹا'' کا ہے جس نے اس مرہم بنانے کا نسخہ حاصل کر لیا جس میں ''نائٹ شیڈ'' کے نیند آور زہریلے پودے بھی شامل تھے۔ (آپ بھی یہ بیان پڑھیں)

جونہی یہ ختم ہوتا ہے وہ جسم کے اس حصے پر مرہم لگاتے ہیں جسے وہ اپنی مالش کے دوران میں پوری طرح لیپ کر چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ''گلابی'' ہو جاتی ہیں...... یوں کسی چاندنی رات کو نہیں یہ احساس ہوتا کہ انہیں کسی کھانے، موسیقی یا راگ رنگ کی محفل میں نوجوانوں کے ساتھ جوڑے بننے کے لیے (جس کی وہ بے حد متمنی ہوتی ہیں) لے جایا جا رہا ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز اتنی تیز ہوتی ہے اور تخیل میں رونما ہونے والی صورتیں اتنی غیر مبہم اور واضح ہوتی ہیں کہ ''دماغوں میں موجود یادداشت'' میں ان کے سوا اور کوئی دوسری یاد نہیں سماتی اور وہ باقی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہیں اور چونکہ قدرتی طور پر انہیں اس اعتقاد میں رغبت ہوتی ہے اس لیے وہ ان نظر آنے والی صورتوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لاتی ہیں کہ ذہن خود بخود ماؤف ہو کر، دن یا رات، اور کسی بات کو نہیں سوچتا۔

ہارنر کے خیال میں جو پیرو میں آباد جویرو انڈینز میں غیبی آوازیں سنانے والی مسحور

کن ادوایات اور دیوتاؤں سے گفتگو کرنے والے پادریوں کے حالات کا مطالعہ کرتا رہا ہے، خوابوں کی دنیا میں لے جانے والی ادویات اور مرہموں میں سب سے زیادہ مشہور ''ایٹروپین'' تھی، جو جادوگرنیوں کے زیر استعمال بھی ہوتی تھی۔ ''ایٹروپین'' قلمی شورے کی طرح ایک کھاری قسم کی بجی ہوتی ہے جو یورپ کے زہریلے پودوں مینڈریک اور انتہائی زہریلے نائٹ شیڈ اور بیلا ڈونا وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ایٹروپین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسمانی کھال کی جھلی میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس کی اسی خاصیت کے باعث اسے ''بیلا ڈونا پلاسٹرس'' (مرہم) میں پٹھوں کے درد سے نجات پانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید دور کے محققین نے پرانی دستاویزات میں محفوظ جادوگروں کے زیر استعمال مرہموں کے نسخوں کو دوبارہ آزمایا ہے۔ جرمنی کے ایک گروپ نے بتایا ہے کہ چوبیس گھنٹے محوخرام رہنے کے بعد انہوں نے آزادانہ کھلی دوڑیں لگاتے، دیوانہ وار ناچتے اور دیگر ایسی مہم جوئیوں میں مصروف رہنے کے خواب دیکھے جو قرون وسطیٰ کے عیش ونشاط اور خرمستیوں سے ملتے جلتے تھے۔ ایک اور محقق جس نے ''ہین بین'' کی بھاپ کا صرف دم کھینچا تھا، بتایا ہے کہ ''میں ایک عجیب خبط کے احساس میں مبتلا ہوگیا کہ میرے پاؤں ہلکے ہو گئے تھے، پھیل رہے تھے اور بدن سے جدا ہو رہے تھے...... اس کے ساتھ ہی مجھے نشے سے مدہوشی کے عالم میں اپنے اڑنے کا احساس بھی ہوا۔''

پھر یہ لاٹھی یا یہ جھاڑو، (کوئی ایک) ان کا کیا مطلب؟ جو آج بھی جدید دور کی نشہ باز جادوگرنیوں کی ٹانگوں کے بیچ دیکھی جا سکتی ہیں۔ گارنز کی رائے میں یہ محض خیالی یا تصوراتی علامت نہیں تھی۔ لاٹھی یا جھاڑو کا استعمال بلاشبہ محض فرائڈ کی تصوراتی علامت سے کچھ بڑھ کر اور زیادہ اہم تھا جس سے ایٹروپین کے کنستر میں ڈبو کر جسم کے اندر اندام نہانی کی نازک جھلیوں پر لگانے کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس جھاڑو یا لاٹھی پر سوار ہونے کا احساس بھی ہوتا تھا جو جادوگرنیوں کو بالخصوص اس فریب میں مبتلا کرتا تھا کہ وہ محفل عیش وطرب میں شرکت کے لیے فضائی سفر پر روانہ تھیں۔

اگر ہارنر کی پیش کردہ وضاحت کو صحیح مان لیا جائے تو پھر عیش وعشرت کی ساری ''اصلی'' محفل ہائے نیم شب، خواب آور اور سرور آمیز ادویات کے استعمال سے وابستہ خالی خولی تخیلات کے نتیجہ نظر آتی ہیں۔ یہ مرہمیں ہمیشہ جادوگرنیوں کی محفل عیش وعشرت میں

شرکت پر روانہ ہونے سے پہلے استعمال کی جاتی تھیں اور ان کے وہاں جانے کے بعد کبھی نہیں۔ چنانچہ پاپائے روم کے جادوگری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور نیست و نابود کرنے کے لیے تفتیش اور باز پرس کے فیصلے کے پس پردہ جو وجوہات بھی ہوں اس فیصلے کی محرک محفل ہائے عیش وعشرت کی روز افزوں مقبولیت نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ لوگوں کو بے خودی کے لالچ نے نشہ آور ادوایات کے استعمال کی لت میں مبتلا کر دیا ہو۔ میں اس امکان کو رد نہیں کرتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ باز پرس اور تحقیق کو اتنی قوت حاصل تھی کہ وہ ان لوگون کے نام معلوم کرسکتی تھی جو غیر حقیقی اور محض خیالی عیش وطرب کی محفلوں میں موجود پائے جاتے تھے۔ پھر ہم یہ کیسے فرض کر لیں کہ وہ سب لوگ بھی منشیات کے عادی تھے؟ چونکہ تفتیش کرنے والوں کو اس پر اعتراض تھا اور نہ کوئی غرض کہ جادوگرنیوں کے پاس مرہم ہوتی تھی اور نہ وہ کسی کے پاس مرہم کی موجودگی کی بنیاد پر اس کے جادوگرنی ہونے کی شناخت کرتے تھے۔

''ہیمر آف دی وِچز'' کتاب اس موضوع کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ میرے خیال میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ زیادہ تر ''اصلی'' جادوگرنیاں یعنی نشہ آور اور سرور آمیز ادویات کی عادی کبھی شناخت نہیں ہوتی تھیں اور زیادہ تر ایسے لوگ جنہیں جلا دیا گیا کبھی نشہ کی لت میں مبتلا نہیں رہے تھے۔

جادوگری سے متعلق اعتقاد کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ تو سرور آمیز خواب آور ادویات کی آمیزہ مرہمیں کرتی ہیں۔ یہ اعتقادات اور اذیت رسانی کی وجہ سے منشیات اور مرہموں کے عادی لوگوں کی اصل تعداد سے بہت زیادہ تعداد میں پھیلے۔ لیکن یہ مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے کہ ان پانچ لاکھ کے لگ بھگ لوگوں کو کیوں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جن کے جرم صرف یہ تھے کہ دوسرے لوگوں نے اپنے خوابوں میں انہیں ارتکاب جرم کرتے دیکھا تھا...... اس مخمصے کو حل کرنے کے لیے ایک دفعہ پھر ''عسکریت پسند'' مسیحائی روایات پر مزید غور کرنا ہوگا۔

☆☆☆

MashalBooks.org

جادوگری کا جنونی خبط

بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ عسکریت پسندانہ مسیحائی پر استوار تحریکیں تیرھویں اور سترھویں صدی کے دوران میں یورپ میں اتنی ہی عام تھیں جتنی یونانیوں اور رومیوں کے غلبے کے دوران میں فلسطین میں۔ نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ اصلاحات بھی کئی لحاظ سے اسی مسیحائی لہر (عدم اطمینان) کی تکمیلی شکل یا ضمنی نتیجہ تھیں۔ فلسطین میں ان کے پیشروؤں کے بارے میں صحیح تھا یورپ میں بھی مسیحائی تحریکوں کا جوش وخروش سے پھیلاؤ اور اور مقبولیت بھی حکمران طبقوں کے زیر قبضہ دولت اور اختیارات کی قوت کے خلاف تھی۔ میں جادوگری کے جنون کے بارے میں یہ توضیح کروں گا کہ اس خبط کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے میں بڑی حد تک حکمران طبقوں کا ہاتھ تھا جس کا مقصد عیسائیت کے حق میں اٹھنے والی مسیحائی کی لہر کو دبانا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ جادوگری کو ایک روز افزوں نمایاں عروج عین اس دوران میں حاصل ہوا جب سماجی اور معاشی عدم مساوات کے خلاف پر تشدد مسیحانہ احتجاج زوروں پر تھے۔ پوپ نے جادوگروں کے خلاف تشدد کے اجازت پروٹسٹنٹ تحریک سے ذرا پہلے دے دی تھی اور جادوگری کا جنون سولھویں اور سترھویں صدی کی جنگوں اور انقلابات کو دوران میں جن کی وجہ سے عیسائی اتحاد کا عہد اختتام کو پہنچا، اپنے پورے عروج پر تھا۔

یورپی عوام کے لیے وڈیرہ شاہی کے غلبے اور قوم پرستی پر استوار مضبوط بادشاہتوں کا وجود بڑا اعصاب شکن زمانہ تھا۔ تجارت، منڈیوں کی تشکیل اور بینکوں کے نظام نے مالکان

زمین اور سرمایہ داروں سے زیادہ نفع آور کاروبار میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا لیکن یہ صرف نواب آباواجداد کی طرف سے ورثہ میں ملنے والی جاگیروں اور قلعہ نما شہروں کی چھوٹے حصوں میں تقسیم سے ہی ممکن تھا۔ چنانچہ زمینی ملکیتوں کو تقسیم کیا گیا، غلامانہ زراعتی نظام ختم کر کے مزارعوں کی جگہ مالکانہ حقوق کے ساتھ مستاجری یا پیداوار کے بٹوارے کے اصول لائے گئے۔ زمین کو صرف اپنی نوابی اور جاگیرداری کا ذریعہ بنانے کی بجائے نقد آور فصلوں کی کاشت کا زراعتی نظام نافذ ہونے لگا۔ دیہاتی آبادی اپنی گزر بسر کے لیے چھوٹے چھوٹے قطعات زمین اور رہائشی ٹھکانوں سے محروم ہونے لگی اور زرعی زمین چھن جانے کے باعث اس نے شہروں کا رخ کیا جہاں انہیں روزگار کے لیے مزدوری کرنی پڑی۔ گیارھویں صدی سے زندگی ذاتی انا اور ذاتی پسند ناپسند سے ہٹ کر مقابلہ بازی اور تجارتی بنیادوں پر قائم ہونے لگی......جس میں روایات کی بجائے نفع نقصان کا عمل دخل تھا۔

روزگار میں تنگی اور زمینوں کی غیروں کو منتقلہ میں اضافے کے باعث بہت سے لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پھر واپسی کے بارے میں پیش گوئیاں شروع کر دیں۔ کئی لوگوں نے چرچ کی بداعمالیوں اور عیاشیوں، دولت کے ارتکاز، قحط اور دباؤں، اسلام کے پھیلنے اور یورپی خواص کے مختلف دھڑوں کے مابین ختم نہ ہونے والے لڑائی جھگڑوں اور جنگوں کی شکل میں اس دنیا کی بساط کو لپٹتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

مغربی یورپ میں مسیحائیت سے متعلق اولین نظریہ ساز فیورا کا رہنے والا جوشم تھا، جس کے پیش گوئی کا نظام کو مؤرخ نارمن کوہن نے مارکسزم کے ظہور سے قبل یورپ میں سب سے زیادہ مؤثر قرار دیا ہے۔ 1190ء اور 1195ء کے درمیان کسی وقت جوشم نے جو ایک پادری تھا اس راز کو پا لیا کہ ابتلا اور مصیبتوں کا موجودہ دور کب ''روحانی بادشاہت'' کے سامنے سرنگوں ہوگا۔ جوشم کو یقین تھا کہ پہلا دور ''باپ'' کا تھا دوسرا عہد ''بیٹے'' کا اور تیسرا دور ''مقدس روح'' کا زمانہ ہوگا۔ یہ تیسرا زمانہ عیش و آرام کا ہوگا۔ جب کسی دولت یا جائداد، محنت و مشقت، خوراک یا رہائش وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ انسانی وجود خالصتاً روحانی ہوگا اور مادی احتیاج سے مبرا۔ 1260ء تک ایک نئے زمانے کا آغاز ہوگا جس میں مذہبی پیشوائی سے متعلق اداروں مثلاً ریاست اور چرچ وغیرہ کی جگہ ایک آزاد روحانی معاشرہ لے لے گا۔ یہ تاریخ کئی عسکری مسیحائی تحریکوں کے نزدیک مقررہ ہدف سمجھی جانے لگی، جب

MashalBooks.org

ان کے اعتقاد کے مطابق شہنشاہ فریڈرک دوم (از 1194ء تا 1250ء) تیسرے زمانے کا آغاز کرنے والا ہوگا۔

فریڈرک کھلے بندوں پوپ کی مداخلت اور احکامات کی خلاف ورزی کرتا تھا مثلاً اس کی حکومت پر پاپائیت کی بالادستی، بپتسمہ کی ممانعت، شادی اور اقبال جرم کی ممانعت اور دیگر مقدس معاملات وغیرہ سے متعلق فتووں کی حکم عدولی کا الزام تھا۔ فریڈرک کی حمایت میں ''روحانیت سے متعلق حکم کے اسیر'' سے موسوم تنظیم کے شعبہ غربت سے منسلک جنوبی لوگ پیش پیش تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ فریڈرک جلد ہی عیسائیت مخالف کردار ادا کرتے ہوئے دولت اور عیش وعشرت کے منبع و ماخذ چرچ سے نجات دلائے گا۔ جرمنی میں پھیری لگاتے ہوئے واعظوں نے فریڈرک کے نجات دہندہ ہونے کا اعلان کیا اور پوپ اور اس کے جاری کئے ہوئے فتووں کی مذمت کی اور پوپ کی مداخلت اور کفر کے فتوون سے مکمل برأت کا اعلان کیا۔ ''سربیا'' میں ان واعظوں میں سے ایک برادر آرنلڈ نے اعلان کیا کہ یسوع مسیح 1260ء میں اس دنیا میں واپس آجائیں گے۔ اور یہ تصدیق کر دیں گے کہ پوپ عیسائیت کا مخالف تھا اور اس کے ماتحت سب پادری اسی ''عیسائیت مخالف'' کے رگ و ریشہ تھے۔ انہیں عیش وعشرت کی زندگی گزارنے اور غریبوں کا استحصال کرنے کی سزا دی جائے گی۔ پھر فریڈرک روم کی بے حد وحساب دولت کو ضبط کر لے گا اور اسے غریبوں میں تقسیم کرے گا...... جو صحیح معنوں میں اصل عیسائی تھے۔

1250ء میں فریڈرک کی بے وقت موت نے ان جنونی مسیحائی مفروضات اور تخیلات کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جو اس کی بادشاہت سے وابستہ تھے۔ اسے ایک ''خوابیدہ شہنشاہ'' کی حیثیت حاصل ہوگئی اور 1284ء میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ فریڈرک تھا جو ''نیند سے بیدار'' ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے کافی پیروکار جمع کر لیے۔ اسے الحاد کے جرم میں جلا دیا گیا۔ اس قسم کے فریڈرک کے روپ میں آنے والے نجات دہندوں کو بعد میں سینکڑوں سالوں تک جلایا جاتا رہا۔

نارمن کوہن عسکریت پسند مسیحائی سے متعلق ایک دستاویز کا ذکر کرتا ہے جس کا نام ''سو باب پر مشتمل کتاب'' تھا۔ یہ سولھویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔ اس میں یہ پیش گوئی درج تھی کہ ''فریڈرک ایک سفید گھوڑے پر سوار، پوری دنیا پر حکمرانی کرنے آرہا تھا۔ کلیسا

کے پوپ سے لے کر اس کے نتیجے کے سب ماتحت پادریوں کو 2,300افراد روزانہ کے حساب سے فنا کر دیا جائے گا۔ شہنشاہ سارے سودخور قرضہ دینے والوں، کوتاہ اندیش قانون دانوں، من مانی قیمتیں لینے والے تاجروں کو بھی تباہ کر دے گا ساری دولت ضبط کر کے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے گی، پرائیویٹ نجی جائدادوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور سب چیزیں مشترکہ ہوں گی۔ ساری جائدادیں ایک واحد جائداد کی شکل اختیار کر لیں گی اور تب بلاشبہ ایک ہی گلہ بان ہوگا اور ایک ہی ریوڑ۔''

فیورے کے جرشم کی پیش گوئی کے مطابق آئندہ آنے والے تیسرے زمانے کے استقبال کی تیاریوں کے سلسلے میں لوگوں نے گروہ درگروہ خود کو آہنی سروں والے بیدوں سے مارنے میں مہارت حاصل کی اور شہر شہر گھومنا شروع کیا۔ کسی بھی شہر کے وسط میں کھلی جگہ پہنچ کر خود کو گناہوں سے پاک کرنے (سزا کے ذریعے) کے یہ دعوے دار اپنی کمر سے بندھے ہوئے بید اپنی پیٹھ پر اس وقت تک برساتے جب تک لہولہان نہ ہو جاتے۔

شروع میں خود کو سزا کے ذریعے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے ان کا مقصد گناہوں سے توبہ تائب ہونا تھا، خود کو سزا دے کر گناہوں سے پاک ہونے کی تحریک کا نقطہ عروج کو نارڈشمڈ کی زیر قیادت ہونے والی مسیحائی بغاوت تھی جس نے خدائی شہنشاہ فریڈرک ہونے کا دعویٰ کیا۔ شمڈ نے اپنے پیروکاروں پر کوڑے برسا کر انہیں ان کے اپنے خون میں نہلا دیا۔ یہ عمل اس کے نزدیک بپتسمہ دینے کا اعلیٰ تر طریقہ تھا۔ نیوگنی کے کارگو پر یقین رکھنے والوں کی طرح تھرنجیا کے لوگوں نے اپنی ملکیتوں کو فروخت کر دیا، کام کاج سے انکاری ہو گئے اور اپنا مقام فضیلت مآب فرشتوں کی صفوں میں بنانے لگے جو لاسٹ ججمنٹ کے بعد خدائی شہنشاہیت سے قریب ترین ہوں گے۔ اس واقعے کے لیے 1369ء مقرر تھا۔ احتساب اور تفتیشی ماہرین کی فعال مداخلت کے باعث شمڈ کو اپنا کام مکمل کرنے سے پہلے سپرد آتش کر دیا گیا۔ اس کے کئی سالوں بعد تک خود کو اذیت دینے والے تھرنجیا میں تلاش کئے جاسکتے تھے۔ 1416ء میں 300ایسے لوگوں کو ایک ہی دن میں جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

بے گھر اور بے زمین ہو جانے والے غریبوں کی ریشہ دانیوں سے نجات پانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں میں، جن کا مقصد یروشلم کو ان سے

MashalBooks.org

چھین کر دوبارہ قبضہ کرنا تھا، ان غریبوں کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ ان میں سے کئی جنگوں کا نتیجہ چرچ اور اشرفیہ کے خلاف مسیحائی انقلابی تحریکوں کی صورت میں نکلا۔ مثلاً گڈریوں کی صلیبی جنگ میں جیکب نامی ایک غدّار راہب نے اعلان کیا کہ اسے حضرت مریمؑ کا خط ملا جس میں انہوں نے سارے گڈریوں (گلہ بانوں) کو حکم دیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے مزار مقدس کو آزاد کرائیں۔ لاکھوں آدمی جیکب کے جھانسے میں آگئے اور اس کی سرکردگی میں لاٹھیوں، سوٹوں، کلہاڑیوں اور خنجروں سے مسلح ہو کر جب وہ کسی شہر میں داخل ہوتے تو حکام کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اپنے ہتھیاروں کو اوپر اٹھا لیتے تاکہ حکام ان کا مناسب طور پر استقبال کریں۔ جیکب خواب دیکھتا تھا۔ بیماروں کو شفا ہوتی تھی۔ بے حد مکلّف اور معجزوں بھری دعوتیں کرتا تھا جن میں خوراک کی رسد، اس کے کھائے جانے سے زیادہ تیز رفتار ہوتی تھی۔ پادریوں کی جماعت کی مذمت کرتا تھا اور جو بھی اس کے وعظوں میں خلل اندازی کرتا اسے مار ڈالتا تھا۔ اس کے پیروکار شہر شہر میں گھومتے پھرتے تھے اور پادریوں پر حملہ آور ہوتے یا انہیں دریا میں ڈبو دیتے تھے۔

بنیادی طور پر قدامت پرستی پر مبنی لیکن ایک دوسرے سے متصادم چرچ اور حکومت (مملکت) کے مفادات اور دوسری طرف بنیادی تبدیلیوں کے خواہش مند غریب طبقوں کی طرف سے انقلاب کے خطرے نے آہستہ آہستہ یورپ کو پروٹسٹنٹ کی تحریک اصلاح سے قریب تر کر دیا۔ یہ عمل کس طرح اثر انداز ہوا، اس کے لیے حسائٹ کی تحریک کو دیکھنا ہوگا جو پندرھویں صدی کے دوران بوھیمیا میں شروع ہوئی۔

حسائیٹوں نے چرچ کی جائداد ضبط کر لی اور پادریوں کو مفلسانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے ردعمل میں پوپ اور اس کے حامیوں نے انہیں دبانے کی مہمات کا ایک سلسلہ شروع کیا جسے اب حسائٹ کی جنگوں کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی تشدد پھیلنے لگا، محروم و مجبور عوام پر مشتمل ایک تیسرا گروہ جنگ کے لیے میدان میں آ گیا۔ یہ لوگ ٹیبو رائٹس کے نام سے مشہور تھے، ان کی یہ عرفیت زیتون کے پہاڑ (ماؤنٹ آف اولیو) پر واقع ٹیبر کے مقام کی نسبت سے تھی جہاں یسوع مسیح نے اپنی دوسری بار آمد کی پیش گوئی کی تھی۔ ٹیبو رائٹس کے عقیدے کے مطابق حسائٹ کی جنگیں دنیا کے خاتمے کا آغاز تھیں۔ وہ اپنے مسیحائی پیامبروں کی زیر قیادت جنگ میں کود پڑے تاکہ اپنے ہاتھوں کو خون سے دھوسکیں۔

ان کی مسیحائی پیشواؤں کا اصرار تھا کہ ہر سچے پادری پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ ہر گناہ گار کا تعاقب کرے، اسے زخمی کرے اور مار ڈالے۔ دشمنوں سے گلو خلاص کے بعد ٹیبو رائٹس کو توقع تھی کہ جوشم کا بتایا ہوا تیسرا زمانہ شروع ہوگا۔ اس زمانے میں معمول کی طبعی تکالیف یا طبعی ضروریات ناپید ہوں گی۔ محبت، امن و آشتی کا معاشرہ ہوگا جس میں نہ ٹیکس ہوں گے، نہ جائدادیں یا سماجی طبقات۔ 1419ء میں بوھیمیا کی ان ''آزاد روحوں'' کی ہزاروں کی تعداد نے دریائے لزہانیکا کے قریب ''استی'' کے شہر میں ایک جمعیت قائم کی اور یوٹپیزم کا معاشرہ وجود میں آگیا۔ یہ لوگ اپنی گزر اوقات دیہات پر اچانک حملوں، لوٹ مار اور جو چیز ان کے ہاتھ لگتی، اسے چھین کر کرتے تھے کیونکہ خدائی قانون کے بندے ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھتے تھے کہ خدا کے دشمنوں کی جو چیز بھی ان کے ہاتھ آئے وہ اسے لینے کے حق دار تھے۔

جرمنی میں اس نوعیت کے واقعات پوری پندرھویں صدی کے دوران میں ہوتے رہے۔ مثلاً 1476ء میں ہانس بوہم نامی ایک گڈریے نے حضرت مریمؑ کو دیکھا۔ اسے ہدایت کی گئی کہ آئندہ سے غریب لوگ آنے والی بادشاہت کی تیاری کے سلسلے میں ہر قسم کے ٹیکس اور عشر کی ادائیگی سے انکار کر دیں۔ سب لوگوں کو لکڑی، پانی، چارے، مچھلی اور شکار وغیرہ تک یکساں رسائی حاصل ہوگی۔ پورے جرمن سے زائرین نے نکلا شاؤسن کا رخ کیا تاکہ ہولی یوتھ (مقدس جوانی) کو دیکھیں۔ وہ لمبی لمبی قطاروں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ بھائی اور بہن سے مخاطب ہوئے اور انقلابی ترانے گائے۔

پروٹسٹنٹ اور اصلاحی تحریک سے جو مخصوص صورت ظہور میں آئی اسے بنیادی لحاظ سے عسکری مسیحائی کا متبادل جانے بغیر سمجھنا مشکل ہے جس سے بے دین قوتیں بھی اتنی ہی خوف زدہ تھیں جتنا کلیسا تھا۔ اپنے متعدد پیش روؤں کی طرح لوتھر کو بھی یقین تھا کہ وہ زمانے کے آخری ایام میں رہ رہا تھا اور پوپ حضرت عیسیٰؑ کا مخالف تھا اور پاپائیت کا خدائی شہنشاہیت کی آمد سے پہلے پہلے تباہ ہونا ضروری تھا۔ لیکن لوتھر کی خدائی شہنشاہی اس دنیا کے لیے نہیں تھی۔ اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس مقصد کے حصول کی خاطر مسلح بغاوت کی بجائے وعظ اور تبلیغ زیادہ مناسب طریقہ کار تھا۔ جرمن اشرافیہ نے لوتھر کی اس بنیادی

پارسائی اور قدامت پرستی کی آمیزش پر مبنی معتدل انداز سیاست کا خیر مقدم کیا۔ پاپائیت کی حکمرانی سے نجات کے لیے یہ مناسب طریقہ کار تھا اور اس میں سماجی بے چینی کا خطرہ بھی نہیں تھا۔

تھامس منٹزر نے جو ابتدا میں لوتھر کا مرید تھا، لوتھر کی تحریک سے بالکل الٹ نظریہ پیش کیا۔ لوتھر اور منٹزر نے 1525ء میں دہقانوں کی طرف سے ہونے والی بڑی بغاوت میں ساتھ دینے کے لیے ایک دوسرے سے مختلف اور مخالف فریقوں کو چنا۔ لوتھر نے اپنے پمفلٹ میں دہقانوں کی مذمت کی جس کے جواب میں منٹزر نے کہا کہ جو لوگ لوتھر کی حمایت کر رہے ہیں وہ خود ڈاکو ہیں، جو دوسروں کو ڈاکوؤں سے باز رکھنے کے لیے قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ منٹزر نے یہ اصرار کیا کہ لوتھر جسے خدا کا قانون قرار دیتا تھا وہ جائداد کو محفوظ رکھنے کا ایک حیلہ تھا۔ سود خوری، چوری، ڈاکہ زنی، ان سب برائیوں کا اصل سبب ہمارے لارڈز اور شہزادے ہیں۔ اس نے لوتھر کو، ''خدا مخالف بدمعاشوں کی قوت کو مضبوط تر کرنے'' کا مورد الزام ٹھہرایا تاکہ وہ اپنے پرانے طور طریقے جاری رکھ سکیں۔ اس بات کا پوری طرح قائل ہونے کے بعد کہ دہقانوں کی یہ تحریک نئی بادشاہت کی ابتدا تھی، منٹزر نے دہقانوں کی فوج کو اپنی زیر کمان لے لیا۔ اس نے اپنے کردار کا موازنہ گڈمین کے کردار سے کیا جو ''اس نے میڈیا نائٹس'' کی جنگ میں ادا کیا تھا اور جنگ میں جب دشمن کی فوج کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے ہتھیاروں سے محروم اور غیر تربیت یافتہ اپنے دہقانی پیروکاروں سے کہا کہ خدا نے اس سے بات کی ہے اور فتح کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ وہ خود بھی توپ کے گولوں کو اپنی بغل میں دبالے گا اور اس طرح ان کی مدد کرے گا۔ خدا کبھی اپنے منتخب پسندیدہ لوگوں کو تباہ نہیں ہونے دے گا...... گولہ باری کے پہلے ہلّے کے دوران میں دہقانوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اس بھگدڑ کے دوران میں پانچ ہزار افراد قتل کر دیئے گئے۔ منٹزر خود بھی بربریت کی زد میں آیا اور کچھ عرصہ بعد اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

تحریک اصلاح کا بنیادی شعبہ پوری قوت کے ساتھ سولھویں صدی کے دوران میں اور سترھویں صدی کے اوائل تک بدستور قائم رہا۔ ''اناباپٹسٹ'' کے نام سے مشہور تحریک کے کم از کم چالیس مختلف فرقے (مکاتب فکر) اور درجنوں کی تعداد میں عسکریت پسند مسیحاؤں کی شورشوں کو جنم دیا جو پٹورائٹ اور منٹزر کی روایات سے ہم آہنگ تھیں۔ یہ

تحریک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں مسلکوں کے حکمرانوں کی نظروں میں یکساں طور پر کھٹکتی تھی جو اسے ہمہ گیر الحادی سازش قرار دیتے تھے، جس کا مقصد جائداد اور مالی مفادات کے پیارے رشتوں کو توڑ پھوڑ کر چرچ اور ریاست کی ساری دولت کو غریبوں میں تقسیم کرنا تھا۔ مثال کے طور پر منٹزر کے ایک مرید ہانس ہٹ نے اعلان کیا کہ حضرت عیسیٰؑ 1528ء میں خدا کی بادشاہت کا افتتاح کرنے کے لیے واپس آئیں گے۔ اس دور بادشاہت میں انس و محبت عام ہوگی اور معاشرہ اچھائیوں سے بھرپور ہوگا۔ انابیپٹسٹ جھوٹے اور غلط پادریوں، بادشاہوں، اشرافیہ اور زمین پر بزعم خود بڑے لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔ منٹزر کے ایک اور پیروکار ہافمین نے پیشگوئی کی کہ دنیا 1533ء میں ختم ہو جائے گی۔ ہافمین کی جگہ پر اس کے بعد آنے والا جان میتھیو ہارلم تھا، اس نے یہ تبلیغ شروع کی کہ حق و صداقت کو تلوار ہاتھ میں تھام لینی چاہیے اور پوری طرح سرگرم ہو کر زمین کو خدا کے خلاف لوگوں (خدا مخالف لوگوں) سے پاک کر کے حضرت عیسیٰؑ کے لیے راہ ہموار کرنی چاہیے۔ 1534ء میں منٹزر ویسٹفیلیا انابیپٹسٹ تحریک کا مرکزی کردار بن گیا۔ سارے رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ بے گھر کر دیئے گئے اور نجی جائداد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ قیادت جلد ہی جان آف لیڈن نے سنبھال لی جو داؤدؑ کی اولاد کا جانشین ہونے کا دعوے دار تھا اور جس نے سارے شاہی اعزازات اپنے لئے طلب کر لئے اور جس سرزمین کو انابیپٹسٹ اپنا نیا فلسطین کہتے تھے اس کو مکمل طور پر اپنی زیر اطاعت قرار دیا۔

انگلستان میں اسی قسم کی بنیادی مسیحائی کے مرکزی خیال اور تصور نے زیریں طبقوں میں نئی روح پھونک دی جس سے سول وار کی راہ ہموار ہوگئی۔ آلیور کرامویل کی نئی ماڈل فوج میں ہزاروں ایسے رضا کار موجود تھے جنہیں یقین تھا کہ انگلستان کی سرزمین پر راہبوں کی بادشاہت قائم ہوگی اور حضرت عیسیٰؑ ان پر حکومت کرنے کے لیے نازل ہوں گے۔ 1649ء میں جیراڈ ونسٹنلے نے خواب دیکھا جس میں اسے حکم دیا گیا کہ وہ دنیا ختم ہو جانے کی تیاری کرے۔ وہ اس طرح کہ ڈگرز کا ایک ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں نجی جائداد، طبقاتی تفریق اور ہر قسم کی تخریب کے لیے کوئی جگہ نہ ہواوسر قبل ازیں کرامویل کے حمایتی لوگ اس نئے ہزار سالہ دور کے حوالہ سے سرگرم ہوئے جب حضرت عیسیٰؑ بزور شمشیر پانچویں بادشاہت راہبوں کی حکومت کی شکل میں قائم کریں گے اور ایک ہزار سال تک

MashalBooks.org

حکومت کریں گے۔

ان سب حالات اور واقعات کا جادوگری سے کیا تعلق ہے؟ جیسا کہ میں نے اس باب کی ابتدا میں ظاہر کیا تھا کہ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے جادوگری کے خبط کا آغاز اور یورپی مسیحائی تحریکیں آپس میں کافی مربوط ہیں اور ان کا باہمی تعلق کافی گہرا ہے۔ انسٹیٹر اور سپرنجر کا وضع کردہ جادوگروں کو پکڑنے کا نظام پوپ انوسینٹ ہشتم نے اس وقت منظور کر لیا جب یورپ کی فضا میں تیسرے زمانے کی آمد کی پیش گوئیوں اور مسیحائی تحریکوں کی گونج پوری آب وتاب سے جاری تھی۔ جادوگری کا جنوں، تحریک اصلاح کے مابعد نتائج کے طور پر اپنے عروج کو پہنچا...... کیونکہ لوتھر اور کیلون دونوں جادوگری کے خطرات پر راسخ یقین رکھتے تھے اور اسی طرح پر تشدد تحریکوں نے بھی جو تیسرے زمانے کی آمد سے متعلق مسیحائی اعتقاد سے متفق تھیں، زور پکڑا۔

کیا سماجی اور معاشی احتجاج اور جادوگری کے جنون کے باہم متوازی عروج کی کوئی وضاحت پیش کی جا سکتی ہے؟ اس سلسلے میں ایک رسمی نقطۂ نظر یہ ہے کہ جادوگری بذات خود سماجی احتجاج کی ایک شکل تھی۔ مثال کے طور پر پروفیسر جیفری برٹنڈ رسل کے مطابق...... قرون وسطیٰ کے دوران میں افراتفری، جادوگری، معرفت، خود اذیتی اور مقبول عام الحاد ...... یہ سب ایک ہی نوعیت کی مختلف صورتیں ہیں جو سب کم و بیش حد تک ادارہ جاتی ڈھانچوں کو مسترد کرتی تھیں اور اس استرداد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جادوگری کے جنون کو سماجی احتجاج سے منسلک کرنے کے لیے ہیمر آف وچز کتاب میں متعینہ حقیقت کی تعریف سے متعلق نظریے کو بڑی حد تک قبول کرنا ہوگا۔ آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ یورپ میں ایسے لوگ بھرپور تعداد میں موجود تھے جو شیطان کی پوجا پاٹھ کے لیے جمع ہو کر امن عامہ اور صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کی راہ میں خطرے کا باعث بنتے تھے۔ لیکن اگر فضا میں پرواز کرنے والی، حقیقی جادوگرنیوں کی اکثریت سرور آور ہین بین جیسی مسکرات کی رسیا تھیں تو ان کا شمار اس ایک زمرے میں نہیں کیا جا سکتا جس میں ٹیبو رائٹس یا اناببٹسٹ آتے ہیں۔ اگر کہیں کہیں مدہوشی کے عالم میں شیطان سے مباشرت یا ہمسائے کی گائے کو چرانے کے اکا دکا واقعات میں کئی لوگ ملوث نظر آتے تھے تو یہ کسی طرح بھی صاحب جائداد لوگوں اور برسراقتدار طبقوں کی بقا کے

MashalBooks.org

لیے خطرے کا باعث ہرگز نہیں تھے۔ جادوگروں کا انتخاب غالباً مایوس، آزردہ خاطر اور غیر مطمئن طبقوں کے لوگوں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جادوگری کو تخریب کاری پر محمول کیا جائے، نہ اس سے جادوگروں کو تخریب کار قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی معروضی صورت حال میں تبدیلی کے لیے اس کے خلاف سنجیدہ احتجاج پر مبنی کوئی بھی تحریک یا تو اپنے واضح مقاصد اور اصولوں کی آئینہ دار ہو یا پھر اسے خطرناک دھمکی آمیز لائحہ عمل کے ذریعے چلایا جائے۔ جادوگرنیوں کی ٹولیوں نے عیش وطرب اور رنگ رلیوں کی محفلوں میں (اگر بفرض محال وہ کبھی ان میں شریک ہوسکی ہوں) جو کچھ بھی کیا ہو، اس سے ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے اپنا وقت چرچ کی عیاشیوں یا نجی ملکیتوں کی مذمت میں صرف کیا ہو یا مقام و مرتبے کے امتیاز اور اختیارات کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہو...... اگر کسی نے ایسے کیا تو وہ جادوگر نہیں تھے بلکہ ویلڈ ینشنز، ٹیبورائٹس، اناپیپٹسٹس یا ان جیسے کسی دوسرے سیاسی مذہبی فرقے کے ارکان تھے جن میں سے اکثر کو بلاشبہ جلا دیا گیا لیکن ان کی مسیحائی اعتقادات کی وجہ سے نہیں...... بلکہ ان کے جادوگر ہونے کی آڑ لے کر۔

جادوگری کے جنون کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک حقیقت کی شناخت پر آمادہ ہونا چاہیے جو نوعیت کے اعتبار سے جادوگروں اور ان کی تفتیش پر مامور حکام، دونوں کے معاشرتی شعور سے الگ اور متضاد ہے۔ پروفیسر رسل کے نزدیک ''یہی کافی ہے کہ کلیسا اور اشرفیہ دونوں جادوگری کو خطرناک اور تخریب کاری سمجھتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگوں کے خیال کے مطابق جو کچھ ہوا اور جتنا کچھ مقصد اور ہدف کے حصول میں ہوا دونوں یکساں طور پر دلچسپی کے حامل ہیں۔'' لیکن یہی مؤقف اسٹیٹر اور اسپرنیچر کا تھا کہ کسی دوسرے کے خوابوں میں تم جو کچھ کرتے دکھائی دیتے ہو، اس کے لیے تم ذمہ دار ہو۔

ہمیں کئی واقعات کے لیے اپنے ذہنوں کو تیار رکھنا چاہیے۔ ایلسی گونر نے شیطان کے ساتھ کوئی رنگ رلیاں نہیں منائی تھیں اور یہ کوئی غیر دلچسپ یا غیر متوقع نتیجہ نہیں ہے کہ اگر ہم غور کریں تو اسے اس جرم کے مبینہ ارتکاب کی پاداش میں نذر آتش کیا گیا۔

جن بظاہر عجیب وغریب اور انوکھے معمولات کا ذکر میں نے اب تک کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے معاملے میں جادوگری کے جنون کی توضیح اس جنون کو ان لوگوں کے شعور سے ہم آہنگ قرار دینے سے نہیں کی جا سکتی جنہوں نے اس میں حصہ لیا۔ بلکہ ہر چیز کا

دارومدار دیکھنے والے (ناظر) کی آمادگی پر تھا کہ وہ اس میں شریک، مختلف لوگوں کے تخیلات اور خوابوں پر مبنی واقعات کو تسلیم کرے یا رد کر دے۔

اگر تفتیشی افسران کی سوچ اور اصرار کے مطابق جادوگری خطرناک قسم کا الحاد تھی تو پھر اس میں کوئی اسرار باقی نہیں رہ جاتا کہ پوچھ گچھ اور تفتیش کرنے والے اس کے قلع قمع کرنے میں ان کے سروں پر قابوس کی طرح کیوں سوار تھے اور ان پر غلبہ پا سکنے میں کیوں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور دوسری طرف اگر جادوگری نسبتاً بے ضرر تھی اور وسیع پیمانے پر نشہ بازی کی لت کا نتیجہ نہیں تھی تو پھر اس کو دبانے کے لیے اتنی کوششیں کیوں بروئے کار لائی گئیں...... خصوصاً اس وقت جب چرچ کے وسائل پندرھویں صدی کے دوران میں عسکری مسیحائی شورشوں کی وجہ سے محدود ہو گئے تھے۔

اس صورت حال سے ایک فیصلہ کن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ دراصل واقع ہوا اور جو کچھ لوگوں کی سوچ کے مطابق واقع ہوا اس میں فرق کیا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تحقیق و تفتیش، جادوگری کے کفر کو دبانے کے لیے وقف تھی؟ اس مفروضے کی بنیاد کہ جادوگروں کی پکڑ دھکڑ ور ان سے پوچھ گچھ کرنے والوں کا بڑا کام انہیں نیست و نابود کرنا تھا، تفتیش کنندوں کے شعوری اعتراف پر ہے لیکن دوسری جانب اس کے برعکس مفروضہ...... جادوگروں کی پکڑ دھکڑ اور پوچھ گچھ کرنے والے اپنی بساط سے بڑھ کر ان کی تعداد میں اضافے اور اس اعتقاد کو پھیلانے کا سبب بنے کہ جادوگرنیاں حقیقی، ہمہ وقتی اور خطرناک تھیں...... بڑی ٹھوس شہادتیں رکھتا ہے...... جدید دور کے سکالر خود کو تفتیش کرنے والوں کے معاشرتی شعور تک کیوں محدود رکھیں؟ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم، یہ پوچھنے کی بجائے کہ تفتیشی حکام جادوگری کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے اس پر غلبہ کیوں نہیں پا سکتے، یہ دریافت کریں کہ وہ اس کو پروان چڑھانے میں کیوں کامیاب ہوئے؟ اس سے قطع نظر کہ ان کے اور ان کے ظلم و ستم کا شکار ہونے والوں کے مقاصد اور ارادے کیا تھے، تفتیشی نظام کا ناگزیر اثر، جادوگری پر اعتماد کے فروغ اور اسی لیے جادوگری میں ملوث ملزموں کی تعداد میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جادوگری کے خلاف نظام نہایت مہارت سے مرتب کیا گیا تھا۔ یہ بے حد ظالمانہ خوف ناک اور منہ زور تھا۔ جن مفادات کے تحت اسے قائم کیا گیا تھا وہ بھی اسی طرح برابر

MashalBooks.org

کے سخت جان اور ظالمانہ تھے۔ جادوگری کا کھوج لگانے والوں کی طرف سے بیان کیے گئے مقاصد اور اہداف سے ہٹ کر میں ان معاوضوں اور دیگر مراعات کا حوالہ یہاں نہیں دے رہا جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں......یعنی جائداد کی ضبطی اور تشدد کرنے کی فیس، پھانسی دینے کی فیس وغیرہ۔ یہ حیلے اس جوش وخروش کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں جو جادوگری کے انسداد سے متعلق بنائی گئی مشنری کا حصہ تھے اور خود جادوگری کے انسداد کی وجوہات میں شامل نہ تھے۔

میری رائے میں جادوگری کے خبط کی وضاحت کو سمجھنے کے لیے اس کے آسمانی عزائم کی بجائے، زمین ہونے والے اس کے نتائج کا جائزہ لینا چاہیے۔ جل کر کوئلہ ہو جانے والے جسموں کے علاوہ، جادوگری کے انسدادی نظام کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ غریب لوگوں کو جادوگرنیوں اور بدروحوں کے ہاتھوں اپنی محرومیوں اور ظلم وستم کا نشانہ بننے پر یقین آنے لگا۔ وہ اعتماد کرنے لگے کہ ان کی محرومیوں کا باعث شہزادے اور پوپ نہیں تھے بلکہ جادوگر اور بدروحیں تھیں۔ کیا آپ کی چھت ٹپکی تھی؟ کیا آپ کی گائے کا بچہ ضائع ہو گیا؟ جو کی فصل سوکھ گئی، انگور کی شراب کھٹی ہو گئی، سر دکھنے لگا، آپ کا بچہ مر گیا؟ یہ سب آپ کے ہمسائے کا کیا دھرا تھا۔ جس نے آپ کے گھر کا چھجا توڑا، آپ سے رقم ادھار لی یا آپ کی زمین پر نظریں رکھے ہوئے تھا...... ایک ہمسایہ جو جادوگر بن گیا۔ کیا روٹی کی قیمت بڑھ گئی، ٹیکسوں میں اضافہ ہوا، مزدوری کی اجرتوں میں کمی ہوئی اور روزگار کا ملنا دشوار ہو گیا؟ یہ سب جادوگرنیوں کے کارنامے تھے۔ کیا وباؤں اور قحط کی وجہ سے ہر قصبے اور گاؤں کی ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا؟ یہ شیطانی اور قابل نفرت ابلیسی جادوگر روحیں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ دیدہ دلیر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان عوام دشمن شیطانی بدروحوں کے خلاف چرچ اور حکومت نے بڑی دلیرانہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ صاحب اختیار اور مجاز حکام اس برائی سے نجات کے لیے اپنی پوری کوششیں صرف کر رہے تھے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے جس کے لیے امرا اور غربا، یکساں طور پر ان کی قوت اور بہادری کے مظاہرے پر شکر گزار تھے۔

چنانچہ عملی لحاظ سے جادوگری کے خبط کی اہمیت یہ تھی کہ قرون وسطیٰ کے آخری دور میں پیدا ہونے والے بحران کی ذمہ داری چرچ اور حکومت کے کندھوں سے، انسانوں کے روپ میں تخیلاتی بدروحوں کو منتقل ہو گئی۔ ان شیطانی روحوں کے خیالی کرتوتوں اور سرگرمیوں سے مرعوب اور خوف زدہ بے گھر، بے زمین، نادان اور سادہ لوح عوام نے بدعنوان، رشوت

خور کلیسا اور لالچی اور حریص اشرافیہ کی بجائے، اپنی مصیبتوں اور محرومیوں کا دوش بے قابو شیطان کو دیا۔ چرچ اور ریاست کو نہ صرف برأت مل گئی بلکہ انہیں ناگزیر تسلیم کیا جانے لگا۔ کلیسا اور اشرافیہ کو بنی نوع انسان کے اس دشمن سے تحفظ کے بڑے ضامن کی صورت میں قبول کر لیا گیا جو ہر جگہ موجود لیکن گرفت سے بڑی حد تک محفوظ تھا۔ بالآخر ان حالات میں عشر ادا کرنے اور ٹیکس کلیکٹر کے حکم کی تعمیل کا جواز مل گیا۔ کئی حد تک محفوظ تھا۔ کئی اہم خدمات جن کا تعلق اگلے جہان کی بجائے موجودہ زندگی میں سہولتیں فراہم کرنے سے تھا، حکومت احکامات کے ذریعے، ڈنڈے کے زور پر سزا اور تعزیر سے کام لے کر سرانجام دے رہی تھی۔ آپ کی نظروں کے سامنے مجاز حکام لوگوں کی زندگیوں کو مزید تحفظ دینے کے لیے حتی المقدور کئی تدابیر اختیار کرنے میں مصروف تھے، آپ جادوگروں کی چیخیں سن سکتے تھے جب وہ جہنم رسید کئے جا رہے تھے۔

دوسروں کی خاطر قربانی کا بکرا بنائے جانے والے لوگ کون تھے؟ ایم سی ایرک مڈل فورٹ نے ایک بے مثال کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس نے 1285ء جادوگروں کی پھانسیوں کا مطالعہ کیا جنہیں 1562ء اور 1684ء کے دوران میں مغربی جرمن میں پھانسی دی گئی۔ ان پھانسی پانے والوں میں سے 82 فیصد جادوگر عورتیں تھیں۔ اپنا دفاع کرنے سے محروم، بوڑھی عورتیں اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی دائیاں پھانسی چڑھائے جانے کے لیے بالعموم پہلی ترجیح ہوتی تھیں۔ چونکہ زائد اضافی نام پہلے سزا پانے والوں سے ان کی شہادت (گواہی) کے ذریعے حاصل کیے جاتے تھے اس لیے دونوں صنفوں کے بچوں اور مردوں کی تعداد زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ خوف ودہشت سے بھرپور آخری دور میں جب کئی لوگوں کو بیک وقت اکٹھے پھانسیاں دی جانے لگیں تو ان میں ہوٹلوں کے مالک چند ایک امیر تاجر اور کبھی کبھار ایک آدھ مجسٹریٹ اور معلم بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن جونہی موت کے شعلے کسی صاحب اختیار اور عالی مرتبت کے نام کے قریب پہنچنے لگتے تو جج صاحب کا اقبال جرم پر اعتماد باقی نہ رہتا اور عدم اعتماد کے باعث ان کی موت کا خوف ٹل جاتا۔ ڈاکٹر، وکیل، یونیورسٹی کے پروفیسروں کو کبھی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ تفتیش کرنے والے خود اور کلیسا سے وابستہ لوگ بھی پوری طرح محفوظ تھے۔ اگر کسی موقع پر کوئی پریشان حال روح اتنی بے وقوفی کی مرتکب ہوتی کہ کسی پادری یا شہزادے کو کسی حالیہ رنگ

رلیوں کی محفل میں دیکھنے کا ذکر کر بیٹھتی تو وہ خود کو بے انتہا تشدد اور ظلم وستم کا نشانہ بننے کی دعوت دیتی...... اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ مڈل فورٹ کو صرف تین مثالیں ایسی ملیں جن میں جادوگری میں ملوث لوگوں نے اشرافیہ کے ارکان کے خلاف الزامات لگائے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی پھانسی نہیں ہوئی۔

مسلمہ اور مروجہ اداروں کے مطلوبہ ڈھانچے کی غیر موجودگی کا پرتو ہونے کی بجائے، جن کی کمی محسوس کی جا رہی تھی، جادوگری کا خبط اس ڈھانچے کے دفاع کا اہم ذریعہ تھا۔ اگر جادوگری کے خبط کا موازنہ ناقص اور متضاد ہم عصر عسکری مسیحائی کی تحریکوں سے کیا جائے تو یہ بات بہتر طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔ جادوگری کے جنون اور عسکری مسیحائی تحریکوں، دونوں میں ایسے مقبول عام مذہبی موضوعات شامل تھے جن کی جزوی طور پر مسلمہ چرچ تصدیق کرتا تھا۔ دونوں اس وقت موجود معاشرتی شعور کی بدولت متعارف ہوئے لیکن پوری طرح متضاد اور مختلف نتائج کے ساتھ۔ عسکریت پسند مسیحائی نے مفلس اور محروم طبقوں کو یکجا اور اکٹھا کیا اور انہیں ایک اجتماعی مشن میں شامل ہونے کا احساس دلایا، معاشرتی اور سماجی فاصلوں میں کمی کا باعث بنے اور انہیں ایک دوسرے کے بھائی بہن ہونے کا جذبہ دیا۔ اس سے پورے خطے کے لوگ متحرک ہو گئے۔ انہوں نے اپنی توانائیوں کو مخصوص وقت اور مقام پر مرکوز کیا جس کے نتائج مفلس و نادار عوام اور مراعات یافتہ برسراقتدار طبقوں کے درمیان جنگوں کی صورتوں میں سامنے آئے۔ اس کے برعکس دوسری طرف جادوگری کے جنون نے احتجاج کی ساری خوابیدہ صلاحیتوں کو منتشر کر دیا۔ وہ ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے۔ سماجی تفاوت میں اضافہ ہوا۔ ہمسایہ ہمسائے کے خلاف ہوگیا، ہر شخص احساس تنہائی کا شکار ہوگیا اور اس پر خوف و ہراس طاری ہونے لگا۔ عدم تحفظ کا احساس ہر فرد پر طاری ہوگیا اور ہر کوئی خود کو بے بس اور حکومت کا دست نگر پانے لگا۔ ہر ایک کا غصہ اور نا امید محض اس کا ذاتی اور مقامی مسئلہ بن گئے۔ اس روش نے غریبوں کو مقدس مذہبی قیادت اور لادین انتظامیہ سے محاذ آرائی کی راہ سے مزید دور کر دیا جس پر چل کر وہ دولت کی تقسیم نو اور مرتبے میں مساوات کا مطالبہ کرتے تھے۔ یوں جادوگری کا روگ، بنیادی طور پر عسکری مسیحائی کے الٹ تھا۔ یہ معاشرے کے مراعات یافتہ اور مقتدر طبقوں کے ہاتھ میں ایک طلسماتی بندوق کی گولی تھی۔ یہ ہی اس کا راز تھا۔

سحر کی واپسی

ضعیف الاعتقادی پر محمول کئے جانے اور مدتوں تک تضحیک کا نشانہ بننے کے بعد ساحری تخیل وتصور میں گدگدی پیدا کرنے کے ایک قابل احترام ذریعے کے طور پر واپس آ گئی ہے۔ صرف جادوگری ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے پراسرار علوم نجوم، جوتش، ٹونے ٹوٹکے، تصوف کے ماہرین سمیت، مراقبے، گیان دھیان سے لے کر سادی شعبدہ بازی، ہرے کرشنا اور آئی چنگ (ایک قدیم چینی جادوگری) کے نظام تک سب کے ماہرین وارد ہو چکے ہیں۔ وقت کے تقاضوں اور احساسات پر مبنی ایک نصابی کتاب ماڈرن کلچرل اینتھر وپولوجی'' نے حالیہ دور میں فوری کامیابی اور مقبولیت پائی جب اس میں یہ اعلان شائع ہوا کہ انسان کی آزادی میں یقین کرنے کی آزادی شامل ہے۔''

مغربی علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کہ ہمہ گیری سے کافی طویل عرصہ تک غیر مطابق اور ناموافق قرار دیے جانے کے بعد، رویوں اور نظریات میں غیر متوقع طور پر ان پراسرار علوم کے دوبارہ اُمڈ آنے کا تعلق اس طرز معاشرت سے جوڑا جا سکتا ہے جسے ''تمدن مخالف'' (کونٹر کلچر) سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس تحریک کے کہنہ مشق بانیوں میں سے ایک زاس زاک کے مطابق یہ تمدن مخالف معاشرہ دنیا کو باطل اور مذموم معروضی شعور سے بچائے گا۔ یہ سائنسی دنیا کے نظریات کو ختم کر کے ان کی جگہ ایک نیا تمدن لائے گا جس میں ذہانت اور فہم و فراست سے غیر موافق صلاحیتیں حکمران اعلیٰ ہوں گی۔ موجودہ دور کا ایک اور جونیئر ''پیامبر'' چارلس اے ریچ ایک ہزار سالوں پر محیط امن کے ذہنی سکون کی بات کرتا ہے جسے

وہ شعور ''ثالث'' کا نام دیتا ہے۔ شعور ثالث پانے کے لیے، منطق، معقولیت، تجزیہ اور اصولوں پر گہرے شک وشبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

''جوابی تمدن'' والے معاشرے میں احساسات، بے ساختگی اور تخیل اچھائیاں ہیں جبکہ سائنس، فلسفہ، منطق، معروضیت برائیاں...... اس کے ارکان فخریہ کہتے ہیں کہ انہوں نے معروضیت کو یوں بھگا دیا ہے جیسے کسی ایسے گھر سے جس میں وبا پھیلی ہو۔

''جوابی تمدن'' کا مرکزی نکتہ ی اعتقاد ہے کہ آگئی اور شعور تاریخ کو کنٹرول کرتا ہے۔ لوگ وہی کچھ ہیں جو کچھ ان کے ذہنوں ہے۔ انہیں اچھا بنانے کے لیے آپ کو اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا کہ آپ انہیں اچھے خیالات دیں۔ معروضی حالات بے معنی باتیں ہیں۔ پوری دنیا کو ایک شعوری انقلاب کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے۔ جرم کو روکنے، غربت کا خاتمہ کرنے، شہروں کو خوبصورت بنانے، جنگوں کا نام ونشان مٹانے، خود بھی امن و عافیت سے رہنے اور قدرت کو بھی پر سکون رکھنے کے لیے ہمیں صرف اتنا کچھ کرنا ہے کہ اپنے ذہنوں کے در ''شعور ثالث'' کے لئے وا کر دیں کہ اس کی پذیرائی ہو۔ ڈھانچے کی تعمیر سے پہلے آگئی اور شعور مقدم ضرورت ہے۔ پوری اجتماعی اور منتشر کوششوں کی بنیاد ''شعور کے سوا اور کسی چیز پر نہیں۔''

جوابی تمدن میں شعور کو جلا ملتی ہے اور خوابیدہ صلاحیتوں کا ادراک ہونے سے انہیں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ جوابی تمدن والے لوگ مصروف سفر ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن کیف ومستی سے سرشار ایک گونہ بے خودی کے عالم میں محو پرواز ہوتے ہیں جس کے دوران میں ان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ پاٹ، ایل ایس ڈی یا مشروم استعمال کرتے ہیں، (یہ سب سرور آمیز ادوایات ہیں) تاکہ اپنے سر جوڑ کر بیٹھ سکیں۔ وہ ایک دوسرے کو ہلکی پھلکی مار پیٹ کرتے ہیں۔ مقابلہ بازی بھی ہوتی ہے یا گیت بھی گنگناتے ہیں تاکہ وہ یسوع مسیح، گوتم بدھ، ماؤزے تنگ وغیرہ سے احمقانہ ملاقات اور بات چیت کر سکیں۔

ان کا مقصود اپنے شعور کا اظہار، شعور کی شہادت، شعور میں تبدیلی، شعور کو اجاگر کرنا، شعور کو وسعت دینا ......غرضیکہ کسی نہ کسی طرح شعور ہی کو اپنا ہدف بنائے رکھنا ہوتا ہے۔ نشے میں محمود بربریت کے شکار احمقانہ تصورات کے اسیر ماؤف ذہنوں والے ''شعور ثالث'' سے بہرہ ور دہقانوں کے نزدیک دلیل بازی عسکری اور صنعتی پیچیدہ مرکب کی ایجاد

MashalBooks.org

ہے۔ کسی دوسرے خنزیر کی طرح اسے بھی مار بھگانا چاہیے۔

نفسیات پر اثر انداز ہونے والی نشہ آور ادویات اسی لئے مفید ہیں کہ ان استعمال سے غیر منطقی تعلقات عین قدرتی لگتے ہیں۔ وہ ادویات اس لئے اچھی ہیں کیونکہ ریچ کے الفاظ میں ”جن باتوں کو معاشرہ انتہائی سنجیدہ قرار دیتا ہے وہ انہیں غیر حقیقی اور بے مطلب بنا دیتی ہیں۔ مثلاً نظم اوقات، معقول تعلقات، مقابلہ مسابقت، طیش، غصہ، فضیلت، اختیار، نجی ملکیت، قانون، مقام و مرتبہ اور ریاست کی اولیت (برتری) وغیرہ۔ یہ ادویات سچ کا ٹیکہ ہیں جو جھوٹے شعور سے چھٹکارہ دلاتا ہے۔ شعور ثالث سے بہرہ ور انسان واقعاتی حقیقت کو نہیں مانتا کیونکہ وہ اب بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہے۔“ ”جوابی تمدن میں عہد کی قوموں کی مفروضہ قدرتی زندگیوں کی یادیں منائی جاتی ہیں۔ اس کے ارکان منکوں والی تسبیحیں گلے میں ڈالتے، سروں پر پٹیاں باندھتے۔ جسموں پر رنگ و روغن ملتے اور بھڑکیلے رنگوں والے کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود کو ایک قبیلوں کے لوگ دنیاوی مادی مفادات سے بے پروا بے ساختگی کے خوگر اور پراسرار جادوٹونے کے ساحرانہ ذرائع کا احترام کرتے اور ان سے بخوبی متعارف ہوتے ہیں۔

عم انسانیات میں جوابی تمدن سے متعلق ابتدائی آگہی کی مختصر پیمانے پر مثال شمن کی ہے۔ یہ شمن جو روشنی اور توانائی استعمال کرتا ہے لیکن بجلی کا بل کبھی ادا نہیں کرتا۔ شمن کی توصیف اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ وہ بیرونی آگہی کی کیفیتوں پر عبور حاصل کرنے اور کائنات کی مخفی قوتوں میں گھومنے پھرنے کا ماہر ہے۔ شمن اعلیٰ اور بالاتر شعور و آگہی رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس آگ سے بنی ہیں جو دنیا کی معمولی اور عام سی کیفیات سے صرف نظر کرکے، ان سے کہیں آگے کی عجائبات اور دہشتوں کا ادراک رکھتی، انہیں دیکھ لیتی اور محسوس کرتی ہیں۔ انسان کو فریب نظر کا شکار بنانے والی ادویات کے استعمال اور دوسری ترکیبوں مثلاً خود اپنی دم کشی اور خواب آور ڈھول اور ناچ اور سروں کے ذریعے راس زاک کے الفاظ“ میں اپنا رابطہ اور تعلق، کسی شخصیت کے ساتھ اس کی واجبی سی ذہنی اور عقلی فہم و فراست کے ساتھ اتنی محنت اور انتھک انہماک وعزم سے جوڑتا ہے جیسے کوئی سائنسدان اپنی تربیت معروفیت کے سلسلے میں کرتا ہے۔

ہمیں جوابی تمدن سے متعلق جاننے کو بہت کچھ مل سکتا ہے اگر ہم کارلوس سٹنڈا

کے مقبول عام ہیروڈان جوآن پر غور کریں۔ یہ پراسرار زود فہم اور ذی شعور شخصیت ایک یاقوتی انڈین صاحب علم کی ہے۔ کاسٹنڈا اپنے ان تجربات کو انسانیات کے ایک نو آموز طالب علم کے تجربات قرار دیتا ہے جو شمن کی دنیا میں ایک الگ اور جدا غیر معمولی حقیقت میں جھانکنا چاہتا تھا۔ ڈان جوآن نیکاسٹنڈا کو بطور ایک نو آموز کے قبول کر لیا اور کاسٹنڈا نے جوآن کی دی ہوئی تعلیم سے فیض یاب ہو کر عالمانہ فہم وفراست کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ کاسٹنڈا کو صاحب علم بنانے کے لیے ڈان جوآن نے معصوم طالب علم کو فریب نظر میں مبتلا کرنے والی کئی ادویات سے روشناس کرایا۔ ایک واضح اور شفاف کتے اور سوفٹ لمبی کاٹنے والی مکھی کا سامنا کرنے کے بعد کاسٹنڈا اس شک میں مبتلا ہو گیا کہ اس کی عام حقیقت اس غیر معمولی حقیقت سے کہیں زیادہ حقیقی تھی جس کا ادراک اس کے معلم نے اسے کرایا تھا۔ ابتدا ہی سے کاسٹنڈا یہ جاننے کے لیے پرعزم تھا کہ دنیا کو کیسے دیکھنا اور سمجھنا ہے لیکن طالب علم کو آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ اسے خود دنیا کے بارے میں علم حاصل ہو رہا تھا۔

نیویارک ٹائمز کے کتابوں پر تبصرے کے ایک کالم میں ایک اور عالم تاریخ انسانیات پال ریزمن نے لکھا کہ ''یہ محض حماقت اور تضیع اوقات ہے اگر ہم سمجھیں کہ ڈان جوآن کا علم...... یا اسی طرح دوسری غیر مغربی اقوام کا دعویٰ ایک متعین حقیقت کے تصور سے زیادہ اور کچھ نہیں۔'' کاسٹنڈ اتفصیل سے واضح کرتا ہے کہ ''ڈان جوآن کی تعلیمات سے ہمیں دنیا کی اصل حقیقت سمجھنے میں کہ دنیا کیا ہے، مدد ملتی ہے۔''

یہ دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ کاسٹنڈا کسی بات کو واضح نہیں کرتا اور ڈان جوآن کی ایک علیحدہ حقیقت سے مغربی اقوام پہلے ہی آشنا ہیں۔

کاسٹنڈا کی سب سے زیادہ مشہور ومعروف ترنگ ان بیتے ہوئے دنوں کی یاددلاتی ہے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ ڈان جوآن اور کاسٹنڈا دونوں کئی دنوں تک ایک مرہم کی تیاری میں لگے رہے جو یرباڈل ڈیبلو...... ایک شیطانی جڑی بوٹی...... کو سؤر کی چربی اور دوسرے اجزاء سے ملا کر بنائی گئی تھی۔ ڈان جوآن کی نگرانی میں شاگرد طالب علم نے اس مرہم کو اپنے پاؤں کے تلووں کے نیچے اور ٹانگوں کے اندرونی حصوں پر لگایا لیکن اس کا زیادہ حصہ اعضائے تناسل پر استعمال کیا۔ اس مرہم میں دم گھٹنے والی اور تیز بدبو تھی۔ کسی قسم کی گیس کے مانند کاسٹنڈا اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور چلنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کی

ٹانگیں ربڑ کی طرح لچکیلی اور لمبی، حد سے زیادہ لمبی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے کہا: میں نے نیچے کی طرف دیکھا تو ڈان جوآن نظر آیا جو میرے نیچے بیٹھا ہوا تھا...... میرے راستے کے نیچے میری حرکت کی قوت بڑھ جانے سے میں ایک قدم اور آگے بڑھا جو پہلے کی نسبت اور زیادہ لچکیلا اور طویل تھا۔ اور پھر وہاں سے میں اوپر کی طرف اڑنے لگا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں ذرا نیچے آیا۔ پھر میں نے دونوں پاؤں دبائے۔ پیچھے کی طرف جھکا اور پیٹھ کے بل پرواز کرنے لگا۔ میں نے سیاہ آسمان کو اپنے اوپر دیکھا۔ بادل میرے پاس سے گزر رہے تھے۔ میں نے اپنے بدن کو جھٹکا دیا اور یوں میں نیچے دیکھنے لگا۔ میں نے سیاہ پہاڑوں کے نشانات دیکھے اور میری رفتار غیر معمولی تھی۔

کاسٹنڈا کو جب سر کو موڑنے سے نقل وحرکت کی سمجھ آگئی تو اس نے اتنی آزادی اور پھرتی محسوس کی جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ آخر کار اس نے خود کو نیچے آتا محسوس کیا۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ وہ ننگ دھڑنگ تھا اور جس جگہ سے وہ روانہ ہوا تھا وہاں سے نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ ڈان جوآن نے اسے یقین دہانی کرائی کہ مشق کے ساتھ وہ اچھا ''اڑنے والا'' بن جائے گا۔

''تم ہوا میں سینکڑوں میلوں تک جہاں تک چاہو جا سکتے ہو اور دیکھ سکتے ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے یا اپنے دشمنوں کو ایک مہلک مکا رسید کر سکتے ہو خواہ وہ کتنے ہی دور ہوں۔'' اس پر کاسٹنڈا نے اپنے استاد سے دریافت کیا، ''کیا میں نے فی الحقیقت پرواز کی تھی؟'' اور شمن نے جواب دیا، ''مجھے تم ہی نے تو بتایا تھا۔ کیا تم نے بتایا نہیں تھا؟''

''ڈان جوآن! پھر میں فی الحقیقت اڑا نہیں تھا۔ میں محض اپنے تصور ہی میں محو پرواز تھا۔ میرے ذہن میں یہ ہی تھا کہ میں اڑ رہا تھا لیکن میرا جسم کہاں تھا؟''

اس پر ڈان جوآن نے یوں جواب دیا:

''تم نہیں خیال کرتے کہ ایک انسان اڑتا ہے پھر بھی ایک جادوگر ایک سیکنڈ میں ہزار میل طے کر کے دیکھ سکتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے سے کافی دور دشمنوں کو مکے مار سکتا ہے۔ کیا وہ ایسے کرتا ہے یا نہیں کرتا؟''

کیا یہ گفتگو مانوس سی نہیں لگتی؟ جیسے پہلے کبھی اس قسم کی بات کا ذکر ہوا ہو؟ ہاں یہ مانوس لگنی چاہیے۔ ڈان جوآن اور کاسٹنڈا کے درمیان ہونے والی بحث ایک طرف پوپ کی

طرف سے پہلے جاری ہونے والے نقرے ''اپسکوپی'' اور دوسری طرف ''ہیمر آف دی وچز'' کتاب میں مذکور انسٹیٹر اور سپرنجر کے مؤقف، دونوں کے حق میں دلائل پر موقوف نہیں تو س کے علاوہ اور کیا ہے؟ یعنی کیا جادوگر کا صرف ذہن ہی پرواز کرتا ہے یا اس کا جسم بھی ذہن کے ساتھ محو پرواز ہوتا ہے؟ آخر میں کاسٹنڈا ڈان جوآن سے دریافت کرتا ہے کہ اگر وہ خود کو ایک بھاری زنجیر کے ذریعے ایک چٹان سے باندھ لے تو پھر کیا ہوگا۔ (جواب یوں تھا) ''مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس چٹان کو بھاری زنجیر سمیت جس سے تم بندھے ہوگے، اپنے ساتھ لے کر اڑو گے۔''

جیسا کہ ہمیں پروفیسر ہارنر نے بتایا تھا کہ یورپی جادوگر کئی ایسی ادویات، مرکبات اور نسخوں کو استعمال کرنے کے بعد اڑتے تھے جن کا ایک اہم جزو، جسم کی کھال میں سرایت کر جانے والی دوائی ایٹروپین ہوتی تھی۔ پروفیسر ہارنر ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ''دھتورا'' نسل کے مختلف النوع پودوں کا جونئی دنیا میں ''گیبریل ٹرمپٹ''، ''جمسن ویڈ''، ''تھارن ایپل''، ''میڈ ایپل'' اور ''ڈیول ویڈ'' کے ناموں سے مشہور ہیں۔ ایٹروپین ایک اہم جزو ہے اور ان مذکورہ انواع میں سے آخری قسم کی جڑوں کو کاسٹنڈا ان اڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کاسٹنڈا کے ''ڈیول ویڈ'' سے اپنی مالش کرنے سے قبل ہی ہارنر نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ کاسٹنڈا جادوگر کی مانند اڑے گا۔ کئی سال ہوئے مجھے دھتورا کی مرہم کے استعمال سے متعلق ایک حوالہ پڑھنے کو ملا جس میں شمالی میکسیکو کے یاقوئی انڈینز کا ذکر تھا کہ وہ مبینہ طور پر اس مرہم کی مالش معدے پر کرتے تھے تاکہ انہیں کشف نصیب ہو۔ میں نے اپنے ایک ساتھی اور دوست کاسٹنڈا کو اس طرف متوجہ کیا جو ایک یاقوئی شمن کے زیر تعلیم تھا اور اس سے یہ پتہ لگانے کو کہا کہ کیا یاقوئی اسے اڑنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس کے نتائج کیا تھے۔

چنانچہ شمن طرز کا ارفع شعور وہ ساحرانہ شعور ہے جسے اب دنیا کی تائید (پسندیدگی) حاصل ہے اور جو پوچھ گچھ اور تحقیق و تفتیش کے خطرے سے آزاد ہے۔ ایک علیحدہ حقیقت، جس کا پہلے خود پسند مغربی اقوام کو ادراک نہیں تھا اب ان ہی مغربی اقوام کی تہذیب کا ایسا انکار کرتے تو انہیں نذر آتش ہونے کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا۔ میں پہلے باب میں اس دعوے کا ذکر کر چکا ہوں ک معروضی آگہی و شعور کے پھیلنے سے اخلاقی احساس

بیگانگی پیدا ہوتا ہے۔ ''جوابی تمدن'' اور ''شعور ثالث'' دونوں انسان دوستی کے رجحانات کی پرورش کے مظہر ہیں جن میں انسانی تعلقات، ہمدردی، جذبات کی بحالی، محبت اور باہمی اعتماد وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن مجھے جادوگری اور شمن ازم سے وابستہ مفادات میں ان اخلاقی پہلوؤں کی جھلک نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر ڈان جوآن کو صرف ایک غیر اخلاقی شخصیت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسے بے شک یہ معلوم ہوگا کہ کائنات کی مخفی قوتوں میں کیسے دخل اندازی کی جا سکتی ہے لیکن اسے مغرب کی روائتی اخلاقی سمجھ بوجھ سے کوئی غرض نہیں کہ اچھے اور برے میں کوئی تمیز کرے۔ درحقیقت اس کی تعلیمات اخلاقی تمیز سے محروم ہیں۔

کاسٹنڈا کی دوسری کتاب میں شمن کے ارفع شعور سے متعلق اخلاقی ابہام کو مختصراً، ایک واقعے کے ذریعے ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر اس کا اظہار اور کہیں نہیں ملتا۔ ''دی ٹیچنگز آف ڈان جوآن'' کی کتاب سے شہرت اور دولت پا کر کاسٹنڈا نے کوشش کی کہ اپنے استاد کو تلاش کرے اور اسے کتاب کا ایک نسخہ دے۔ جب کاسٹنڈا ڈان جوآن کی آمد کا منتظر تھا تو اس نے دیکھا کہ گلی کوچوں کے کچھ شریر اور آوارہ بچوں کی ایک ٹولی اس کے ہوٹل کی میز کے کھانے کے بچے کھچے ٹکڑوں پر پلتی تھی۔ تین دن تک ان بچوں کو گدھوں کی طرح اندر باہر آتے جاتے دیکھ کر کاسٹنڈا صحیح معنوں میں افسردہ ہو گیا۔ ڈان جوآن یہ سن کر حیران رہ گیا۔ کیا تم واقعی ان کے لیے خود کو غمگین کر رہے ہو؟ کاسٹنڈا نے یہ اصرار کیا کہ وہ واقعی افسردہ تھا۔ اور ڈان جوآن نے اس سے پوچھا ''کیوں؟''

''کیونکہ مجھے اپنے انسانی ساتھیوں کی بہبود سے متعلق تشویش ہے اور وہ بچے ہیں اور ان کی زندگی بڑی غلیظ اور سستی ہے۔''

کاسٹنڈا یہ نہیں کہتا کہ اسے بچوں کے ان بچے کھچے ٹکڑوں کے کھانے پر افسوس ہے جو اس نے میز پر بچا چھوڑے ہیں بلکہ اسے غم اس بات کا ہے کہ ان کی زندگیاں غلیظ اور سستی ہیں۔ بھوک اور غربت سے برے خیالات جنم لیتے ہیں۔ یہ سن کر ڈان جوآن نے اپنے شاگرد کو اس کے اس مفروضے پر ملامت کی کہ ایسے لاوارث اور بھوکے بچے بھول بھٹک کے باعث ذہنی طور پر پختہ نہیں ہو پاتے کہ صاحب علم ہو سکیں۔

وہ کہتا ہے:

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری امارت اور تمہاری بہت امیر دنیا تمہیں ''صاحب علم''

بنانے میں مددگار ہوگی۔'' جب کاسٹنڈا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی خوش حالی نے اس کے کامیاب جادوگر بننے میں کوئی مدد نہیں کی تو جوآن اس سے پوچھتا ہے: ''تو پھر تم ان بچوں کے لیے کیوں افسردہ ہوتے ہو؟ ان میں سے کوئی بچہ ''صاحب علم'' بن سکتا ہے۔ ایسے سب ''صاحب علم'' لوگ جنہیں میں جانتا ہوں وہ بھی اس طرح کے بچے تھے جیسے تم نے بچا کھچا کھانے اور میزیں چاٹنے والوں کو دیکھا۔''

''جوابی تمدن'' ٹولے کے اکثر ارکان کے نزدیک، سائنسی دنیا جسے علوم وفنون اور ٹیکنالوجی کا ماہر کہتی ہے اس سے زیادہ گھٹیا اور پست ذہنیت شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سنگدل اور ناقابل بیان ٹیکنیکی ماہر جو مہارت کے لیے خود کو وقف کئے ہوئے ہے، لیکن اس سے قطعاً بے پروا ہے کہ اس علم کو کون استعمال کرتا ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس نفرت کے باوجود ڈان جوآن ٹیکنوکریٹ کی تعریف کے عین مطابق اس پر پورا اترتا ہے۔ جس علم سے وہ کاسٹنڈا کو بہرہ ور کرتا ہے اس میں اخلاقی جواز کا کوئی دخل نہیں۔ صاحب کشف بننے میں کاسٹنڈا کو سب سے زیادہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کے استعمال سے اجتناب کرے جو اسے مستقل طور پر گردش کے لیے مدار میں چھوڑ دے۔ کاسٹنڈا کی ساری فکرمندی یہ تھی کہ ڈان جوآن کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اطلاق کس طرح کیا جائے جس کی بدولت کاسٹنڈا بی-52 طیارے کو اڑانا سیکھ سکے۔ ڈان جوآن سے اس کا تعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ٹیکنالوجی کو افضل ترین اچھائی سمجھتا ہے خواہ وہ اور اس کا معلم اس کی پیچیدگیوں سے اس حد تک ناواقف ہوں کہ طیارے کے بٹن دبانے کی بجائے انہیں کھا جاتے ہوں۔

میرا مؤقف یہ ہے کہ معروضی علم کو زیر وزبر کرنا اخلاقی غوروفکر اور تدبر کی بنیاد منہدم کئے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ نہیں جان لیتے کہ کس نے کیا کیا، کہاں کیا اور کب کیا تو ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ہم خود اپنا اخلاقی جواز پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہم مجرم اور اس کے جرم کا شکار ہونے والے مظلوم، امیر اور غریب، استحصال کرنے والے اور استحصال کی زد میں آنے والے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے تو ہمیں انصاف کے اخلاقی جواز کو یکسر ختم کر دینے کے حق میں وکالت کرنی چاہیے اور یا پھر تفتیشی چھان بین کرنے والے کی حیثیت سے لوگوں کو اس کے ایسے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے جس کے

MashalBooks.org

مرتکب وہ ایک دوسرے کے خوابوں میں پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ٹائم میگزین کے رپورٹروں نے کاسٹنڈا پر مضمون میں انکشاف کیا کہ شعور ثالث سے معمولی انسانی حالات و واقعات کو بھی ناقابل عبور طور پر دھندلایا جا سکتا ہے۔ یقین اور اعتماد کی آزادی سے کام لیتے ہوئے کاسٹنڈا نے اپنے تخیل کی پرواز کے زور پر اپنی سوانح عمری میں بہت سے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے:

پیرو میں پیدا ہوا برازیل میں نہیں
تاریخ پیدائش 1925ء ہے 1935ء نہیں
ماں کا انتقال اس وقت ہوا جب اس کی عمر 6 سال تھی 24 سال نہیں
رنگ سازی اور مجسمہ سازی کی تعلیم لیما میں حاصل کی میلان میں نہیں۔

کاسٹنڈا کا کہنا تھا کہ مجھ سے میری زندگی کے متعلق اعداد و شمار کی تصدیق چاہنا ہی ایسے ہے جیسے سائنس کو فسوں کاری کے جائز قرار دینے کے حق میں استعمال کیا جائے۔ یہ دنیا کو اس کے طلسم سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

کاسٹنڈا کے کہنے کے مطابق ڈان جوآن بھی اس طرح ہے۔ دنیا بھر کا مانا ہوا نامور شمن نہیں چاہتا کہ اس کا فوٹوگراف لیا جائے ٹیپ ریکارڈ میں اس کی آواز محفوظ کی جائے یا کوئی اس سے سوال پوچھے خواہ وہ اس کا زیر تربیت شاگرد کیوں نہ ہو...... کاسٹنڈا کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ ڈان جوآن کون ہے۔ کاسٹنڈا بے تکلفی سے تسلیم کرتا ہے کہ ''اوہ میرا واسطہ ایک ارنا بھینسے کے غیض و غضب سے ہے۔ اوہ مجھے کیسے پسند ہے کہ اسے چھوڑ دوں۔'' کم از کم پیرو میں اس کا ایک دوست اسے بڑا جھوٹا کہہ کر یاد کرتا ہے۔

ڈان جوآن کا وجود نہ ہو یا شائد ہم سمجھیں کہ کاسٹنڈا کی ملاقات ایک یاقوئی جادوگر سے تخیل میں ہوئی، لیکن جسمانی طور پر نہیں پوچھ گچھ اور تفتیش کے اختیارات کے نتیجے میں ہی ڈان جوآن کی تعلیمات کا صحیح احوال سامنے آیا ہو یا شائد کبھی تو کاسٹنڈا تخیل کے ذریعے اور کبھی جسمانی طور پر ڈان جوآن سے ملتا رہا ہو۔ یہ سارے خیالات بڑے دھوکہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کسی کی اخلاقی حسیات کی اصلاح میں صرف تصوراتی حد تک ہی شامل ہیں۔

جوابی تمدن انفرادی اخلاقیات کٹ مفروضہ تحفظ کے ضمن مین بہت بلند بانگ

دعوے کرتا ہے۔ اس کے حمایتیوں کا اصرار ہے کہ شعور عالیہ دنیا کو زیادہ انسان دوست، زیادہ قابل رہائش جگہ بنا سکتا ہے۔ وہ معروضیت سے پرواز (مراجعت) کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس کے ذریعے دولت کی منصفانہ تقسیم، وسائل کو دوبارہ قابل استعمال بنانے، افسر شاہی کی من مانیاں روکنے اور جدید دور کے ٹیکنو کریٹ معاشروں کے غیر انسانی پہلوؤں کی اصلاح کا مقصد سیاسی لحاظ سے موثر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی برائیوں کے لیے برے خیالات کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے جو ہمارے ذہنوں میں ہمارے مقام و مرتبہ اور ہمارے اعمال کی پیداوار ہیں اگر ہم نمود نمائش کی کوشش بند کر دیں اور یہ یقین کرنا چھوڑ دیں کہ کام بذات خود ایک اچھا عمل ہے تو انقلابی تبدیلیاں آنا شروع ہوں گی اور کسی کو تکلیف پہنچانے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ جیسے کہانیوں میں بتایا جاتا ہے کہ ہم جب چاہیں اپنے لئے نئی راہیں چن سکتے ہیں۔ سرمایہ داری، ریاستی وسائل، سائنس کا زمانہ، پروٹیسٹنٹ عقیدہ اور مسلک---- یہ سب شعور کی مختلف قسموں کی نمائندگی رکھتے ہیں اور ان سب کو ایک نئے شعور کے انتخاب سے بدلا جا سکتا ہے۔ ''ہمیں صرف اتنا کچھ کرنا ہے کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ تصور کریں کہ ہر شخص ''شعور ثالث'' سے بہرہ ور ہو گیا ہے۔ ریاستی ادارہ گم ہو جائے گا اور اس کی طاقت ایسے معجزہ انداز میں خاتمے کو پہنچے گی جیسے ایک بوسہ جادوگری کے سحر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

''شعور و آگہی''، جس کا اب تک کسی عام یا عملی مزاحمت سے ٹکراؤ نہیں ہوا درحقیقت یہ جادوگری ہے سیاست گری نہیں۔ لوگ جب چاہیں اپنا شعور بدل سکتے ہیں لیکن بالعموم لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ شعور کو درپیش حالات اور شرائط کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ ان حالات کے وجود یا عدم وجود کا تصور اس طرح نہیں کیا جا سکتا جیسے ایک دشمن ایک سوفٹ لمبے بچھوؤں کو تصور کی آنکھ سے نظر آنے اور غائب ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں (پاکیج کے باب) کہ شہرت کے نظام بیرونی فضا میں ارتعاش کے ذریعے وضع نہیں ہوتے۔ لوگ خود مقابلے بازی اور جوش مسابقت سے مغلوب ہو کر اسراف بے جا کا شعور پاتے ہیں کیونکہ مقتدر اور بے انتہا طاقتور سیاسی اور اقتصادی قوتیں انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان قوتوں کی تجدید صرف ایسی عملی سرگرمیوں سے ہو سکتی ہے جن کا مقصود شعور میں تبدیلی لانا ہو اور شعور میں تبدیلی اس کی مادی لحاظ سے تبدیلی میں مضمر ہے۔

''تمدنی خلافی'' کی مسرت انگیز ترنگیں جو آگہی پر منحصر ہوتی ہیں' نہ تو نئی ہیں اور نہ انقلابی۔ عیسائیت اسی شعور و آگہی کے ذریعے انقلاب لانے کی دو ہزار سالوں سے کوشش کرتی رہی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عیسائیت کے شعور کی بیداری دنیا کو بدل سکتی تھی لیکن الٹا دنیائے عیسائیت کے شعور کو بدل ڈالا۔ اگر ہر شخص ایک پر امن' محبت و یگانگت' سخاوت اور جوش ہمسری سے پاک اسلوب زندگی کو شعار بناتا تو ہم ''جوابی تمدن'' سے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے---- ہم خدا کی حکومت کو پا سکتے تھے-----

''شعور ثالث'' کی شکل میں سیاست کی سوچ ذہن میں جاگزیں ہوتی ہے، جسم میں نہیں۔ سیاست کی اس صورت میں سہولتیں ان لوگوں کے لیے تو ظاہر ہے کہ دستیاب ہیں جو پہلے ہی دولت اور طاقت کے مالک ہیں۔ فلسفانہ انداز میں اس پر غور و خوض کہ ''غربت'' بہرحال ایک ذہنی کیفیت ہے، ان لوگوں کے لیے جو غریب نہیں ہیں، ہمیشہ تسکین و آسائش کا ذریعہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ''جوابی تمدن'' اس روایتی تحقیر کو ذرا جدید صورت میں آگے بڑھایا ہے۔ جس کا اظہار، عیسائی نظریہ ساز، دنیاوی مال و متاع کے خلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ ضمانت بھی روایتی اور قدامت پسند سیاسی دھارے کا حصہ ہے کہ طاقت اور قوت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ شعور ثالث تشدد، بغیر سیاسی قوت حاصل کئے، بغیر لوگوں کے کسی دھڑے کو ہٹائے، ریاستی ادارے کو تباہ کر سکتا ہے۔ ''جوابی تمدن'' کا وار (حملہ) ذہنوں پر ہوتا ہے مالی مفادات یا مراعات کے خاتمے یا کمی پر نہیں۔

تعریف کے لحاظ سے جوابی تمدن بے گھر لوگوں، درمیانی طبقے، کالج کے پڑھے لکھے نوجوانوں کا اسلوب زندگی ہے۔ اس سے وہ لوگ خصوصی طور پر خارج ہیں جو پرولتاری انقلاب کے حامی اور جنگجو سیاہ فام جوان ہیں۔ جوای تمدن سے یہ رجائیت کہ یہ معاشرے میں ایسی تبدیلیاں لائے گا جن کی بدولت بنی نوع انسان اسے اپنے گھر کے طور پر شناخت کر سکے س وجہ سے وابستہ ہے کیونکہ یہ درمیانی طبقے کی تحریک ہے۔ اس کی اہمیت میں اضافہ اس سے مشروط ہے کہ بنیادی طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے استرداد کو معاشرے میں ایک مرکزی حاصل ہو۔ یہ نہیں کہ اس استرداد کا وجود کہیں کہیں اور خال خال ہو یا برائے نام ہو۔ یہ درمیانی طبقے کی تحریک ہے جس کے نوجوان اس ''شعور'' کی سیاست کو چلا رہے ہیں۔

علاوہ اس سوال کے اس خالص شعوری سیاست کو سیاست کا نام دیا جائے یا جادوگری اور فسوں کاری کی کوئی اور قسم سمجھا جائے، دو اور پیچیدہ نکتے بھی توجہ طلب ہیں۔ پہلا یہ کہ تمدن مخالف ٹیکنالوجی کی قدر و قیمت کو کلی طور پر رد نہیں کرنا۔ دوسرا یہ کہ مخصوص قسم کے سائنسی علوم کی مخالفت اور استرداد کو ہمیشہ ہماری تہذیب میں مرکزی مقام حاصل رہا ہے۔

جوابی تمدن ٹیکنالوجی کی ایجادات کو استعمال کرنے کا مخالف نہیں اگر وہ ایجادات معروضی سائنسی تحقیق کا اصل ہوں۔ ٹیلفون، ریڈیو سٹیشن، سستی جیٹ پروازیں، ضبط تولید کی گولیاں اور سرور آور کیمیائی مرکبات اور زہریلے اثرات کو ختم کرنے والے تریاق، یہ سب شعور ثالث کی حامل بہتر زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

علاوہ ازیں پرشور، ہنگامہ خیز اور وارفتگی کے حامل میوزک پر انحصار نے اداکاری کے فن کی تاریخ میں بری طرح علوم وفنون کو مدھ بھرے گیتوں اور سریلی زیروبم کا محتاج بنا دیا ہے۔ اس لیے کم از کم اندر ہی اندر (در پردہ) خاموشی کے ساتھ جوابی تمدن طبقاتی اور حیاتیاتی ماہرین کو تسلیم کرتا ہے جن کے فرائض میں معاشرت کے بنیادی ڈھانچے کی فنی تشکیل اور اسے برقرار رکھنا ہے۔

شعور ثالث کے نزدیک سائنسی علوم کی سب سے زیادہ قابل نفرت اقسام وہ نہیں جن کا تعلق تجربہ گاہوں (لیبارٹریوں) سے ملے، بلکہ وہ اقسام ہیں جو تاریخ اور معاشرتوں کے مطالعے میں تجربہ گاہوں والے معیارات کا اطلاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوابی تمدن تاریخ اور معاشرت کے سائنسی مطالعہ سے روگردانی کی تصویر کشی اس انداز سے کرتا ہے گویا اسلوب زندگی اور معاشرت سے متعلق ان نام نہاد سائنسدانوں میں بھی رائج الوقت علم اس کی ضرورت سے زیادہ خوراک (اوور ڈوز) پر معترض کیسے ہوسکتا ہے جب معاشرتی علوم کی سائنس کو اصرار ہو کہ پہلے ابواب میں بیان کی گئی پہیلیوں اور مخصوص کا کوئی سائنسی جواز نہیں۔ طرز معاشرت کے مطالعاتی عمل میں کسی بھی تجسیم کو جوابی تمدن کے موہوم معاشرتی تصور سے زیادہ کچھ نہیں سمجھنا چاہیے۔ موجودہ دور میں اسلوب زندگی کے عمل سے متعلق رائج الوقت جانکاری، پیشہ ور شارحین کی اکثریت کی شناخت حقیقی مضمون میں شعور ثالث سے مختلف نہیں۔ اگر جادوگر کی واپسی میں فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی تجربہ گاہوں کو ان لوگوں

کے حوالے کرنا شامل ہے جو ٹھوس شہادتوں اور معقول تجزیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمارے نزدیک ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اعتقاد اور یقین کی آزادی پر مبنی مشق، تجربہ گاہوں میں عارضی طور پر اس وقت تک تکلیف کا باعث ہوگی جب تک شعور عالیہ کا تجربہ کرنے والوں کے جل کر خاکستر ہو جانے والوں کی ''باقیات'' کا بھی اپنے کاٹھ کباڑ سمیت صفایا نہیں ہو جاتا۔ بدقسمتی سے وہ ابہام اور راز داری جو معاشروں میں برتی جاتی ہے وہ خود بخود ختم ہونے والی نہیں۔ ایسے اصول اور نظریات معاشرتی لحاظ سے بڑی قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں جو لوگوں کو اپنے سماجی وجود اور موجودگی کی وجوہات کو سمجھنے سے باز رکھتے ہوں۔ ایسے معاشرے میں جہاں پیداوار اور اس کے تبادلے کے ذرائع پر عدم مساوات کا غلبہ ہو وہاں طرز زندگی سے متعلق ایسی سمجھ سوچ جو معاشرتی نظام کی قدرتی شکل میں ابہام اور بگاڑ کا موجب ہو بہت زیادہ مقبول ہوتی ہے اور اس کی قدر و قیمت بھی خوفناک اور دہشت بھرے تمدن مخالف اساطیری اور دیومالائی اعتقادات پر مبنی، سمجھ اور سوچ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ معاشرت کے سلسلے میں ابہام اور راز داری برتنے سے تجربہ گاہوں کے مسلمہ سائنسی اصولوں میں کمی ہوتی ہے۔ دروغ گو، عارف، مجذوب، صوفی، بعید العقل اور ذومعنی گفتگو کرنے والوں کا ان کے کاٹھ کباڑ سمیت صفایا آسان نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی کاٹھ کباڑ ہے ہی نہیں، کیونکہ ہر چیز اپنے سابقہ معمول کے مطابق چل رہی ہے۔

میں نے پہلے ابواب میں واضح کیا ہے کہ حد درجہ عارفانہ شعور (گیان) بعض اوقات پریشان حال اور مختلف الرائے عوام کو مؤثر تحریکوں کی شکل میں متحد کر کے ایک لڑی میں پرو دینے کا باعث بنتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یکے بعد دیگرے فلسطین، یورپ اور ملائیشیا میں کتنی قسم کی مسیحائی کے زیر اثر تحریکوں نے عوام کے انقلابی جذبوں کو آگے بڑھایا جن کا مقصد دولت اور اقتدار کی زیادہ مساویانہ تقسیم تھا۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح کلیسا اور مملکت کی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں نے جادوگروں کے جنون سے معاشرتی انتہا پسندوں کو پاگل اور بے وقوف بنایا۔

اس صورت حال میں جوابی تمدن کہاں موزوں اور حسب حال ہے؟ کیا یہ قدامت پسند قوت ہے یا بنیادی قوت؟ اپنے خوابوں کی دنیا میں یہ جوابی تمدن اس ہزار سالہ روایتی تبدیلی کی شناخت کرتا ہے۔ راس زاک کہتا ہے کہ جوابی تمدن کی ابتدائی منزل ایک نیا

بہشت اور نئی زمین کا اعلان کرنا ہے اوراس کے تشکیلی مرحلے میں، شعور ثالث نے مختلف الخیال اور منقسم نوجوانوں کے ہجوموں کو رقص کی محفلوں اور جنگ کے خلاف احتجاجوں میں اکٹھا کیا۔ لیکن منظّم و مربوط بنانے کی استعداد کے زمانہ عروج کے دوران میں بھی جوابی تمدن میں مسیحائی کی بنیادوں کا فقدان نمایاں تھا۔ اس میں کرشماتی قیادت کی کمی تھی اور کسی واضح اخلاقی ضابطے کی بصیرت سے بھی محروم تھا۔ شعور ثالث کے مطابق قیادت کو بھی عسکری اور صنعتی کمپلیکس کی ایک اور چال (حربہ) بتایا جاتا ہے اور جیسا کہ لمحہ بھر پہلے میں نے بتایا کہ پوری طرح واضح اخلاقی اہداف کے علمبردار ڈان جوآن جیسے اخلاقیات سے عاری شخص کی اضافیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔

تصوراتی واقعیت پسندی سے لے کر غیر اخلاقی اضافیت اور تخیل کی ہمہ گیر قوت تک اڑان، یہ سب فسوں کاری کی گواہی تو دیتی ہیں، نجات دہندہ ہونے کی نہیں۔ شعور ثالث کی ساری علامات ایسی معاشرت کے خوابوں کی شکل تو ہوسکتی ہیں جس کے سماجی فرائض میں منتشر توانائیوں کو مزید ٹکڑوں میں بانٹنا اور تقسیم کرنا ہو۔ یہ بات اس قول کو بڑی اہمیت دینے سے واضح ہوجانی چاہیے جس کا مطلب اپنے کام سے کام رکھو ہے۔ آپ انقلاب برپا نہیں کر سکتے اگر ہر شخص اپنے کام سے مطلب رکھے۔ انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ سب لوگ ایک ہی کام سے غرض رکھیں اور ایک ہی کام کریں۔

چنانچہ جادوگر کی واپسی محض ایک ناقابل بیان وہم یا گمان نہیں۔ موجودہ دور کی فسوں کاری کے احیا میں قرون وسطیٰ کے آخری دور سے متعلق جنون سے متشابہ کئی قطعی نکات موجود ہیں۔ ہاں اس میں البتہ شک نہیں کہ کئی اخلاقی نکات بھی ہیں۔ جدید دور کی جادوگری (فسوں کاری) کی تعریف کی جاتی ہے جبکہ پرانی جادوگری خوف کی علامت تھی۔ جوابی تمدن کا کوئی شخص کسی کو اس لیے جلانا نہیں چاہتا کہ وہ جادوگروں پر یقین رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ ریچ اورراس زاک انسٹیٹر یا اسپرنجر (پوچھ گچھ کرنے والے) کی طرح نہیں ہیں اور خوش قسمتی سے جوابی تمدن کی کسی اصول پسند جماعت سے کوئی وابستگی نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اس حقیقت کا سامنا ہے کہ جوابی تمدن والے اور پوچھ گچھ کرنے والے جادوگروں کی اڑان سے متعلق مسئلے پر آپس میں متفق اور شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ جوابی تمدن کے اندر ''یقین اور اعتقاد کی آزادی'' کی بدولت جادوگری ایک مرتبہ پھر ہر دوسری چیز کی طرح قابل یقین ہو

گئی ہے۔ یہ اعتقاد اور یقین اپنی تمام تر معصومیت اور کھلنڈرے پن کے ساتھ موجودہ دور کی ہمعصر عدم مساوات کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں یقینی کردار ادا کرتا ہے۔ لاکھوں پڑھے لکھے نوجوانوں کا پختہ اعتقاد کہ ریاستی ادارے کو چوم کر اس سے چھٹکارا پاؤ کیونکہ یہ بڑا الفریب سحر ہے پر مبنی تجویز سیاسی شعور کی کسی بھی صورت سے کم موثر نہیں ہے۔ ہمارے اپنے قرون وسطٰی کے پیش رووں کی طرح، آج کے جدید دور کی جادوگری احتجاجی قوتوں کو دھیما، سست اور بیوقوف بناتی ہے۔ جوابی تمدن کی دوسری خصوصیات کی طرح معقولیت پر مبنی سیاسی عزائم اور اقدامات کو متعارف کرانے میں التوا کو سہارا دیتی ہے ہمارے آسودہ حال طبقوں میں اس کی مقبولیت کی یہی وجہ ہے اور اسی وجہ سے جادوگری واپس آ گئی ہے۔

☆☆☆

MashalBooks.org

حرفِ آخر

اگر جادوگری واپس آ گئی ہے تو کیا نجات دہندہ ابھی بہت پیچھے ہے؟ نارمن کوہن نے اپنی کتاب (دی پرسوٹ آف دی ملینیم) میں ایک مقدمہ تیار کیا ہے جس کے ذریعے اس نے اصلاحی پروٹسٹنٹ تحریک سے پہلے کی مسیحائی تحریکوں کا تعلق بیسویں صدی کے لامذہبی اضطراب اور افراتفری سے جوڑا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت سے متعلق مخصوص افسانوی داستانوں اور قصے کہانیوں کی تحقیر کے باوجود لینن، ہٹلر اور مسولینی جیسی شخصیات کی زندگیوں کے اسلوب اور معلومات سے شناسائی کا وجدان کئی عام اور عملی واقعات کے تحت پیدا ہوا۔ یہ واقعات ویسے ہی تھے جیسے مذہبی نجات دہندوں مثلاً جان آف لیڈن، منسٹرز وغیرہ کو پیش آئے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ مناھم بار کو چوا اور یالی کے علاوہ غیر مذہبی دہریئے عسکری مسیحاؤں کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ یہ لوگ بھی اپنے مذہبی پیروؤں کے ان عزائم میں شریک ہیں جن کے مطابق وہ لامحدود پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ اپنے ہزار سالہ وعدے پر جو انہوں نے کیا ہے، لامحدود پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ اپنے مذہبی پیروؤں کے ان عزائم میں شریک ہیں جن کے مطابق وہ لامحدود استقامت کے ساتھ قائم شریک ہیں۔ یہودی اور عیسائی نجات دہندوں کی طرح ان کا دعویٰ ہے ک انہیں تاریخ کو پہلے سے مقررہ انجام تک پہنچانے کا مشن سونپا گیا ہے۔ ہٹلر کے نزدیک یہ مشن، یہودیوں اور دوسری رہائش پذیر بدروحوں اور شیطانوں کی نجاست سے معاشرے کو پاک کرنا تھا۔ لینن کا جواب اسے ایک اشتراکی (کمیونسٹ) یروشلم بنانا جس کا ماٹو (مقولہ) پہلے عیسائی سماج والا تھا یعنی ''وہ

سب جو یقین رکھتے تھے اور اکٹھے تھے اور ان کا سب کچھ مشترک تھا۔'' یا جیسے ٹراٹسکی نے کہا کہ ''ہر مکتب فکر کے مذہبی علماء کو اس دنیا کے بعد آنے والے، اگلے جہاں میں بہشت کی خوشخبری سنانے دیں...... ہم کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے لئے اسی دنیا کو صحیح معنوں میں بہشت بنا دیں گے۔'' سرد مہری کے شکار غیر محفوظ، جسم و جان کا رشتہ بمشکل قائم رکھنے والے خستہ حال، بدروحوں اور فسوں کاری سے متاثرہ عوام کے لیے یہ غیر مذہبی مسیحائی، نجات اور ایفائے عہد کا وعدہ کائناتی سطح پر کرتی ہے جو نہ صرف روز مرہ کی زندگی میں بہتری کے مواقع لائے گی بلکہ ایک عظیم الشان اور بے مثال اہمیت کے حامل مشن میں مکمل شمولیت کا موقع فراہم کرے گی۔

اگر پرشکوہ عسکری شعور و آگہی کے پیمانے سے اندازہ لگایا جائے تو ثقافت مخالفت جوابی تمدن سیاسی کشمکش کے رائیگاں جانے کی بظاہر نسبتاً بے ضرر انداز میں تصدیق کرتا ہے۔ خواہ وہ بائیں بازو سے متعلق ہو، دائیں بازو سے یا معتدل اور درمیانی ہو۔ لیکن خوش خلقی، شعور ثالث کے جواب میں، صرف مختصر عرصے کے لیے اور وہ بھی ایک باقاعدہ تنظیم کی غیر موجودگی میں مناسب ردعمل ہے۔

سائنسی دنیا کی تخریب کا مجوزہ انقلابی منظرنامہ اس لیے کسی خطرے کا باعث نہیں کیونکہ دراصل یہ ہماری تہذیب کے بنیادی فنی ڈھانچے کے صرف کسی حصے کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ جوابی تمدن کے پرجوش علمبردار بھی زیادہ توانائی خرچ کرنے والے ذرائع نقل و حمل، ٹھوس کیفیت کے حامل الیکٹرانکس اور وسیع تجارتی پیمانوں پر کپڑے اور خوراک کی پیداوار کے اتنے ہی محتاج ہیں جتنے ہم، باقی سب لوگ اور ان میں اس خواہش اور علم دونوں کا فقدان ہے جو پیداوار اور آمدورفت کے پرانے ابتدائی طریقوں کی طرف واپس لوٹ جانے کے لیے ضروری ہے۔ بہرصورت کسی ایسے فرقے، جماعت یا قوم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو نیوکلیائی، سائبر ٹینک مشینوں کو کنٹرول کرنے یا حیاتی طبیعات کی ٹیکنالوجی کے مزید فروغ میں شامل ہونے سے قاصر ہیں...... ایسے گروہ لامحالہ بیسویں صدی کی دوسری پسماندہ قوموں کی طرح، پتھر کے زمانے والی تقدیر کے مالک ہوں گے۔ وہ زندہ سلامت تو رہ سکتے ہیں لیکن پریشان حال صورت میں اور اپنے سے بہت زیادہ طاقتور ہمسایوں کے رحم وکرم پر یا ان کے ظلم وستم کا شکار ہو۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہونے کی

حیثیت میں قبیلوں کی صورت میں بھی ان کی سلامتی کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے زیادہ پرانے مرحلوں کی طرف واپسی کا سفر یا صرف اسی مرحلے پر قناعت، جہاں تک صنعتی قومیں پہنچ چکی ہیں، بنی نوع انسان کی اکثریت کے نزدیک تمسخر آمیز اور محض بیوقوفانہ سوچ ہوگی۔ یہ اکثریت روزانہ اپنے اس عزم میں پختگی لاتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں یورپ، امریکی اور جاپانی اجارہ داری کو ختم کر کے وہ اپنی زندگیوں کو سنواریں اور آسودہ بنائیں گے۔ لاکھوں کی تعداد میں ترنم سے گیت، بھجن اور راگ الاپنے والے، ریچ اور راس زاک جیسے نغمہ خواں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت اور فروغ میں تقریباً اس حد تک رکاوٹ ڈال سکتے ہیں جتنی ایک واحد آوارہ جھینگے کی چہچہاہٹ (چوں چوں) ایک جلتی ہوئی آگ کی بھٹی کے عمل کو متاثر کرتی ہے...... ''جوابی تہذیب'' سے خطرہ دراصل کسی اور جگہ ہے۔

شعور ثالث کے گورو سائنس اور ٹیکنالوجی کو روک سکتے ہیں اور نہ اس کے فروغ میں کمی لا سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس نادانی اور پریشان خیالی اور پاگل پن کی سطح میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جس کا تعلق اس امر سے ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کس طرح عدم مساوات اور استحصال کو شدید تر کرنے اور تباہی پھیلانے کی بجائے انسانی فلاح اور تعمیری مقاصد کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ بڑھتی ہوئی اضطرابی کیفیت۔ نفسیاتی الجھن اور جادوگری کی واپسی کی صورت میں اخلاقیات سے بیگانگی، اپنے ساتھ ہر اس شخص کے لیے جو ہماری تہذیب کی تاریخ سے واقف ہے، مسیحا کی واپسی کا ناگزیر خطرہ بھی لاتی ہیں۔ دلیل، شہادت اور معروضیت سے متنفر شعور عالیہ اور اس کا نعرہ، اعتقاد کی آزادی...... رفتہ رفتہ ایک پوری نسل کو ذہنی اور عقلی محرومی سے دوچار کر دے گا جو کائنات میں نجات پر مبنی جدوجہد کے لیے اگلی، آخری اور فیصلہ کن دعوت کے ذریعے عقلی اور ذہنی ذرائع کی بدولت ممکن تھی۔

ذہنی آوارگی اور تخیلات سے استحصال کی مادی بنیادیں تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔ ''شعور ثالث'' سے سرمایہ داری یا بادشاہت کے بنیادی تانے بانے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے جو مسئلہ درپیش ہے وہ ''یہ تم خود کرو'' کا یوٹوپیا (مثالی معاشرت) نہیں بلکہ ایک نئی اور سخت گیر عسکری مسیحائی ہے جو درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے بے ڈھنگے اور انوکھے لوگوں کی طرف سے جنم لے۔ یہ لوگ اپنے جرنیلوں کو اشراق کے ذریعے یہ پیغام

دیں اور یہ سوچ رکھتے ہوں کہ اس مسیحائی سے دنیا بھر کے اداروں میں دولت کے ارتکاز کی ہوس کو جو دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، انسان دوستی کے سلسلے میں نرم دلی اور عوام دوستی پر مائل کیا جاتا ہے...... وہ عوام جو پاؤں سے ننگے ہیں اور مٹر کا گودا بطور گھی استعمال کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اس کتاب کے شروع میں کہا تھا کہ ''یقین کی آزادی'' کی آڑ میں جو سب سے زیادہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے وہ یہ مفروضہ ہے کہ ہم لوگ اپنے معمولات زندگی کے جواز میں ضرورت سے زیادہ معروضیت کا شکار ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ سائنسی معروضیت ہی انسان کا اصل گناہ ہے کس قدر احمقانہ فعل ہے۔ یہ یانومامو اور یارنگ ایسے قبائل کے معمولات زندگی سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اکیلے یورپ ہی کی تاریخ سے یہ مطلب ظاہر ہو جاتا ہے کہ بے گناہ اور معصوم لوگوں کے اعضا کاٹ کرنا کارہ، کھینچ تان کر ٹکڑے ٹکڑے کرنا، شکنجے میں کس کر اذیت دینا، تختہ دار پر لٹکانا، مصلوب کرنا اور جلانا...... یہ سب کچھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہت پہلے کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

ایک صنعتی معاشرے میں عدم مساوات اور بے دخلی کی مخصوص قسموں کی موجودگی ایسے طریقوں اور فنی پہلوؤں کے باعث ہوتی ہے جو قدرتی اور عملی سائنسوں میں پیش قدمی کے نتیجے میں دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ ہم عصر زندگی کی کسی بھی طرح تشخیص کی جائے، اسلوب زندگی کے کسی بھی عمل کے لیے سائنس معروضیت کی زیادتی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ نسلی تعصب کے بنیادی اسلوب میں سائنسی فکری معروضیت شامل نہیں جس کے نتیجہ میں علاقائی، نسلی اور قبائلی تعصب پر مبنی فرقہ بندی ایک دوسرے کے خلاف سربکف رہتے، بسیں الٹاتے اور غیر مراعات یافتہ خاندانوں / طبقوں کے لیے رہائشی کوارٹروں کی تعمیر میں مزاحمت واقع ہوتی۔ سائنسی فکری سوچ کی افراط جنگجویانہ ذہنیت، مردوں عورتوں اختلاط یا ہم جنسی کی ذمہ دار نہیں۔ زندگی کا یہ معمول بھی سائنسی معروضیت کا شاخسانہ نہیں تھا جس سے ناہموار ترجیحات قائم ہوئیں مثلاً چاند پر اترنا اور ہسپتالوں کو اور گھروں کو میزائلوں کی زد میں لانا۔ اور نہ ہی آبادی کا گھمبیر مسئلہ پیدا ہونے میں، معمولات اور طرز زندگی پر سائنسی غور و فکر کے لیے غلبے کا کوئی عمل دخل ہے۔ اور پھر ہماری سرمایہ دارانہ مسابقت بھری زندگی کے معمولات جن میں بے ضرورت فضول خرچی کی لامحدود

خواہش، اشیا کی بے جا کھپت، بے جا ضیاع، متروک اور غیر مستعمل اشیا کا نمائشی ذخیرہ، مقام و مرتبے کی نمایاں طلب خیالی ٹی وی کے بے کار اوہام اور تصورات اور جادوگری کی دوسری مختلف اقسام کے پھندوں میں دھکیلنے والی قوتوں سے سائنسی اور فکری سوچ کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ ان سب باتوں میں سے کس کا تعلق منطقی شائستگی، دلیل، معقولیت، معروضیت یا سائنس سے تھا؟ زندگی کے معمولات میں معروضیت کا بکثرت عمل دخل، اس جنگ کے لیے کیسے کوئی جواز فراہم کرتا، جس کے لڑنے کے حق میں یکے بعد دیگرے تین صدور کوئی معقول جواز پیش کر سکے اور نہ لڑائی جاری رکھنے سے باز آئے۔

کوئی شخص اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ 1932ء میں جرمنی کے اندر رونما ہونے والے حالات و واقعات وہاں کی طرز زندگی پر معروضیت کی مضبوط گرفت کا نتیجہ تھے؟ یہ واقعات ان کی عقل و دانش سے بیگانگی پر مبنی صلاحیتوں کے باعث پیش آئے اور جرمن لوگوں کے جذبات کے باعث ظہور پذیر ہوئے۔ انکل جو سے متعلق اعتقاد، لینن کی لاش کے سامنے سر جھکانا، کریملن کی ریشہ دوانیاں، سائبیریا میں نظر بندی کیمپ اور پارٹی کے موقف کی اصول پسندی...... ان سب معاملات میں سٹالن کے فلسفے کے بارے میں بھی جو کچھ اوپر بتایا گیا ہے، وہی صحیح ہے۔

بلاشبہ ہمارے ہاں ایسے ماہرین موجود ہیں جو مستقبل میں آنے والے دور میں ٹھوس شکل کی معروضی ضرورت کو پیش کرنے کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ جو مردہ جسموں کی گنتی اور اموات کو شمار میں لا کر انسانی زندگی کے بارے میں ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسے ماہرین اور ان کے سیاسی سرپرستوں میں اخلاقی نقص سائنسی سوچ و بچار (معروضیت) کی کمی ہے۔ زیادتی نہیں...... ویت نام میں اخلاقی الزام کی وجہ اس معروضی شعور و آگہی کے بکثرت استعمال کو قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ہم کیا کر رہے تھے بلکہ اپنے قومی مقاصد اور پالیسیوں کی اہمیت سے ہم آہنگ بنانے کے لیے، اس شعور کو عام کرنے میں ہماری ناکامی کے باعث ایسا ہوا۔ ہم نے ویت نام میں جنگ جاری رکھی کیونکہ ہمارے شعور میں حب الوطنی، شہرت اور شان و شوکت کے سہانے خواب، ناقابل تسخیر فخر و مباہات اور سلطنت کے خیالی تصور کی بعید العقل علامات جاگزیں تھیں۔ ہم اپنے مزاج اور افتاد طبع کے لحاظ سے بالکل اسی طرح تھے جیسے ''جوابی تمدن'' کے لوگ ہمیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم نے یہ

تصور کر لیا کہ بھینگی نگاہوں والے یہ شیطان اور پست قامت زرد رو لوگ (ویت نامی) ہمارے لیے سردردی اور مصیبت کا سامان تھے۔ ہم نے خود کو اپنی ناقابل بیان شان و شوکت کے باطل خواب کا اسیر بنالیا۔ مختصر یہ کہ ہمیں مار بھگایا گیا۔

مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ شعور کو چکرا دینے والی شعبدہ بازی، نسل پرستی پر مبنی امنگیں، بے عقلی اور بیوقوفانہ رواج اور طریقے میں مزید الجھانے کا نتیجہ، اس سے کسی زیادہ مختلف صورت میں برآمد ہوگا جس سے ہم پہلے ہمیشہ نبرد آزما ہوتے آرہے ہیں یعنی ساحری اور مسیحائی۔ ہمیں مزید کسی ساحرانہ لہر، نفسیاتی اعتقادات، تمسخر آمیز ذہنی تخیلات کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ہزار سالہ شان وشوکت کا جو معمولات زندگی کی وجوہات کو بہتر طور پر سمجھنے سے آئے گی کوئی مطالبہ نہیں کرتا۔ تاہم یہ فرض کرنے کی معقول بنیاد موجود ہے کہ اپنے عام شعور کو پراگندگی سے محفوظ رکھ کر ہم امن، اقتصادی اور سیاسی انصاف میں اصطلاح کے امکانات کو روشن کریں گے۔ اگر ہمارے حق میں حالات کی تبدیلی کا خفیف سا امکان بھی ہو تو میرے خیال میں ہمیں چاہیے کہ معمولات زندگی کی اقلیم میں سائنسی معروضیت، پھیلاؤ پر مبنی فکری سوچ کو مخصوص اور پہیلیوں کے لحاظ سے ناگزیر سمجھیں۔ یہ وہ واحد طریقہ ہے جو کبھی نہیں آزمایا گیا۔

☆☆☆☆☆

MashalBooks.org

مصنف کے بارے میں

مارون ہارس کولمبیا یونیورسٹی میں 1953ء سے پڑھاتے رہے ہیں۔ 1963ء سے 1966ء تک شعبہ تاریخ انسانیات کے سربراہ رہے۔ انہیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اکثر بڑے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرف سے فرمائشی لیکچروں کے لیے مدعو کیا گیا۔ برازیل، ایکویڈار، موزنبیق میں قوموں اور نسلوں کے تعلقات کے ضمن میں پیدا ہونے والے مخلوط تمدنی پہلوؤں، نوآبادیاتی نظام کے اثرات اور اردگرد کے ماحولیاتی تناظر میں دیکھے جانے والے، پسماندگی کے مسائل سے متعلق فیلڈورک کے علاوہ ہارس نے ملک میں خانگی زندگی کے مطالعے کے لیے وڈیوٹیپ کے طریقوں کو متعارف کرایا۔

مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ ہارس ''نیچرل سٹڈی'' میگزین میں باقاعدگی سے مضامین لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے شعبے کے مخصوص رسالوں امریکن ''انتھروپولوجسٹ'' اور ''کرنٹ اینتھروپولوجی'' کے لیے بھی اکثر لکھتے رہتے ہیں۔

ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں:

1 اینتھروپالوجیکل تھیوری

2 اے ہسٹری آف تھیوریز آف کلچر

3 کلچر (یہ انڈر گریجوایٹ کورس میں مقبول نصابی کتاب ہے)

4 مین اینڈ نیچر

5 این انٹروڈکشن ٹو جنرل اینتھروپالوجی

MashalBooks.org